دیوانِ میر (فارسی)

مع اردو ترجمہ

از

افضال احمد سیّد



اوکسفرڈ

دیوانِ میر

(فارسی)

دیوانِ میر

(فارسی)

میر تقی میر

ترجمہ: افضال احمد سیّد

OXFORD
UNIVERSITY PRESS
اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔ یہ دنیا بھر میں
درج ذیل مقامات سے بذریعہ اشاعت کتب تحقیق، علم وفضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے
مقاصد کے فروغ میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے:

اوکسفرڈ نیویارک

اوکلینڈ کیپ ٹاؤن دارالسلام ہونگ کونگ کراچی
کوالالمپور میڈرڈ میلبرن میکسیکوسٹی نیروبی
نیودہلی شنگھائی تیپی ٹورونٹو

درج ذیل ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے دفاتر ہیں:
آرجنٹینا آسٹریا برازیل چلی چیک ریپبلک فرانس یونان
گوئٹے مالا ہنگری اٹلی جاپان پولینڈ پرتگال سنگاپور
جنوبی کوریا سوئٹزرلینڈ ترکی یوکرین ویتنام

Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔

پاکستان میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔

پہلی اشاعت ۲۰۱۳ء

ISBN 978-0-19-906205-8

پاکستان میں پرنٹیک کوالٹی پرنٹرز، کراچی میں طبع ہوئی۔
امینہ سید نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا، پی او بکس نمبر ۸۲۱۴،
کراچی۔۷۴۹۰۰، پاکستان سے شائع کی۔

نیّر مسعود کے لیے

ترتیب

مقدّمہ

اردو کے جن کلاسیکی شعراء پر ناقدین اور محققین نے کماحقہٗ توجہ دی ہے ان میں جائز طور پر میر تقی میر کا نام بھی سرِ فہرست ہے۔ اس ضمن میں ناقدین کے مطالعے اور تجزیے کا موضوع زیادہ تر میر کی شاعری کی خصوصیات و انفرادیت، فن اور اس کا امتیاز اور عہد و معاشرت کی اثر پذیری پر مرکوز رہا ہے، جب کہ محققین نے میر کے احوال، عہد و معاصرین اور آثار و اثرات کو موضوع بنایا ہے۔ آثار کے ضمن میں میر کی تصانیف کی جستجو و دریافت، تدوین و ترتیب اور تصحیحِ متن کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔

گزشتہ ڈیڑھ دو صدیوں میں میر کا اردو کلام چھے متداول دواوین کی صورت میں بارہا شائع ہوا ہے اور کلام کے متن کی تصحیح و تدوین کا حق بھی خوب ادا کیا گیا ہے، جو میر کے کلام کی خوبیوں اور میر کی مقبولیت کا تقاضہ بھی تھا۔ اسی تحقیق کے ضمن میں یہ دریافت بھی سامنے آئی ہے کہ میر کا کل کلام چھ نہیں بلکہ سات دواوین پر مشتمل ہے، جن میں سے اب تک صرف چھ دواوین دستیاب رہے ہیں اور شائع ہوئے ہیں، جب کہ کلامِ میر کا دیوانِ ہفتم بھی موجود ہے جو اب تک عام دسترس میں نہیں بلکہ عبدالرحمٰن بارکر کے ذاتی کتب خانے میں موجود رہا، لیکن اب یہ ان کے کتب خانے کی ٹورنٹو سے کوالالمپور، ملیشیا میں ''انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی'' کے ''انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سویلائزیشن اینڈ تھاٹس'' کے کتب خانے میں منتقلی اور اس کے ذخیرۂ بارکر میں محفوظ اور کسی محقق کی تصحیح و تدوین اور اشاعت کا منتظر ہے۔

اردو کلام کے علاوہ میر کی تمام تخلیقات و تصانیف: ذکرِ میر، فیضِ میر، نکات الشعراء اور مجموعۂ نیاز فارسی میں ہیں۔ (آخرالذکر اہم اور غیر معروف اور تا حال غیر مطبوعہ تصنیف کے لیے، دیکھیے راقم الحروف کا مقالہ: ''میر تقی میر: ایک گمشدہ بیاض کی دریافت''، مطبوعہ: معیار مجلۂ شعبۂ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، ص: ۱۸۹ تا ۲۱۳)۔ ان نثری فارسی تصانیف کے علاوہ میر نے فارسی شاعری میں بھی طبع آزمائی بھی کی تھی جس کا مجموعہ انھوں نے بصورتِ دیوان ۱۱۶۴ھ میں مرتب کیا تھا، لیکن اس دیوان کے قلمی نسخے جو مبینہ طور پر متعدد ذخیروں: مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ؛ کتاب خانۂ درگاہ شاہ غمگین دہلوی، گوالیار؛ کتاب خانۂ ریاست رامپور، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد؛ کتاب خانۂ شاہانِ اودھ، لکھنؤ؛ اور کتاب خانۂ مسعود حسن

رضوی ادیب، لکھنؤ میں محفوظ ہیں یہ ۱۱۹۲ھ اور ۱۲۰۴ھ کے مکتوبہ ہیں۔ کئی اکابر ادب: عزیز لکھنوی، ابواللیث صدیقی، محمود حسن قیصر، وزیرالحسن عابدی، اختر علی تلہری اور اکبر حیدری کاشمیری وغیرہ نے مختلف وقتوں میں اپنے طور پر اگرچہ اس کے تعارف و مطالعے کا حق بھی ادا کیا، لیکن یہ اگست ۱۹۸۳ء میں نقوش کے ''میر نمبر'' (۳) کی اشاعت سے قبل تک منظرِ عام پر نہ آسکا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام پہلی مرتبہ اس مجلّے نے کیا اور یہ نیّر مسعود رضوی کے تعارف و قرأت اور اکبرالدین صدیقی کی کاوش سے اس مجلّے میں شائع ہوا۔

میر کی حیثیت و عظمت کے تعین کے لیے جہاں ان کی اردو شاعری اور دیگر تخلیقات ناگزیر ہیں وہیں میر کو سمجھنے کے لیے ان کا فارسی کلام بھی بے حد اہم ہے۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ مسلّمہ طور پر میر جنوبی ایشیا میں فارسی شاعری کے دورِ آخر کی مستحکم لیکن دم توڑتی ہوئی روایت کے نمائندہ اور اہم شاعر ہیں۔ پھر ان کی فارسی شاعری کا مطالعہ و تجزیہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایک متفقہ رائے کے مطابق ان کی فارسی اور اردو شاعری کا ایک حصہ ایک دوسرے کا پرتو ہیں اور ایسے متعدّد خیالات و جذبات جو انھوں نے اردو میں نظم کیے وہ فارسی میں بھی دہرائے ہیں اور یہ عمل شاید اس کے برعکس بھی ہوا ہے۔ اس حوالے سے میر کے فارسی کلام کا مطالعہ سماجی اور نفسیاتی اور ادبی و فنی ہر اعتبار سے اہم سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب میر نے اپنی عمر (پیدائش: ۱۱۳۶ھ مطابق ۱۷۲۳ء یا ۱۷۲۴ء) کے قریباً ۲۸ سال کے عرصے میں، یعنی ۱۱۶۴ھ مطابق ۱۷۴۸ء میں، اپنا فارسی دیوان مکمل کر ڈالا تھا تو پھر انھوں نے بعد کی اپنی عمر (وفات: ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء) کے ۲۶ سالوں میں مستقل مزاجی سے فارسی میں شاعری کیوں نہ کی؟ اگر کی ہو تو پھر ہمیں میر کے مزید فارسی دیوان یا دواوین کی دریافت کا منتظر رہنا چاہیے۔ قرائن یہی ظاہر کرتے ہیں کہ میر نے بعد کے عرصے میں فارسی میں مستقل مزاجی سے شاعری نہیں کی اور وہ صرف اردو کے ہو کر رہ گئے۔

زیرِ نظر اشاعت اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ یہ میر کا فارسی دیوان ہے اور پہلی مرتبہ مکمّل کتابی صورت میں منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اسے فی الواقعہ ''میریات'' کے ضمن میں ایک بہت اہم اضافہ سمجھا جانا چاہیے کہ جو بطورِ متن و ماخذ اس صورت میں اب عام دسترس میں ہے۔ پھر اس اشاعت کی ایک مزید اہمیّت اور خوبی یہ بھی ہے کہ اصل فارسی متن کے ساتھ ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی متن کے مقابل پیش کیا گیا ہے کہ اس طرح اصل مکمّل متن بھی قابلِ مطالعہ ہے اور آج کے اس دور میں جب فارسی زبان سے شد بد بھی اب عام نہیں ہے، عام شائقین کے لیے اس کا فہم بھی ممکن ہو

گیا ہے، جس کے بغیر حقیقتاً میر کے ایک جامع مطالعے کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ایک اور خوبی اس اشاعت کی یہ بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ فارسی متن کا ترجمہ افضال احمد سیّد نے کیا ہے، جو آج ان معدودے چند افراد میں شامل ہیں جو ایک جانب جدید ادبی رجحانات و افکار سے بھی مستفید ہیں اور دوسری جانب مشرقی شعری روایات اور ان کے حسن سے بھی واقف بلکہ فیض یافتہ ہیں۔ فارسی سے ان کی واقفیت بھی اس امر کا ایک مظہر ہے۔ جب کہ ان کی تخلیقات اور عالمی ادب کے ان کے تراجم ان کے ان مشترکہ اوصاف کے نمایاں شواہد ہیں۔ یہ ترجمہ منثور ہے جو ایک عام قاری کے لیے زیادہ سہل اور قابلِ فہم ہے۔ آج ہمارے علم کی سطح اس حد تک زوال پذیر ہے کہ انتہائی سادہ و سہل شعرائ کے کلام کی شرحیں بھی مرتّب ہو رہی ہیں، اس لحاظ سے دیوانِ میر فارسی مع اردو ترجمہ کی یہ اشاعت نثری ترجمے پر مبنی ہونے کے باعث آج کے ہر قاری اور خاص طور پر کلاسیکی ادب کے تمام شائقین اور میر کے چاہنے اور مطالعہ کرنے والوں کے لیے یقیناً مفید اور پُرکشش ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

تعارف

میرؔ تقی میرؔ (۱۷۲۳ء تا ۱۸۱۰ء) نے ایک مشکل وقت میں زندگی گزاری۔ وہ آگرے میں ایک غیر آسودہ حال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں اپنے درویش صفت والد محمد علی متقی کے انتقال کے بعد دلّی چلے گئے اور ساٹھ سال کی عمر میں دلّی کے اجڑ جانے کے بعد لکھنؤ کو مسکن بنایا اور یہی ان کا مدفن بھی ٹھہرا۔ میرؔ نے محمد شاہ رنگیلا سے اکبر شاہ ثانی تک مغل بادشاہوں کا دور دیکھا یعنی وہ مغل سلطنت کے زوال کے بہترین شاہدوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور ۱۷۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں دلّی کی تاراجی دیکھی اور آخر کار مغل بادشاہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کا مکمل کاسہ بردار بنتے دیکھا۔ ذاتی زندگی میں ایک عشق ان کا وجدانی سرمایہ ہے۔ میر تملّق پیشہ نہ تھے اس لیے ساری زندگی آسودہ حالی نصیب نہیں ہوئی۔

میرؔ نے، جو ہمارے خدائے سخن ہیں، اردو کے سات اور فارسی کا ایک دیوان چھوڑا ہے۔ مصحفی (۱۷۵۰ء تا ۱۸۲۴ء) نے میرؔ کی فارسی شاعری کے بارے میں اپنے تذکرے عقدِ ثریا میں لکھا:

> چونکہ ریختہ کے فن میں اسے شروع ہی سے ناموری حاصل ہو چکی تھی، اس لیے اپنی فارسی شاعری پر اسے اتنا فخر نہیں، اگرچہ اس کا فارسی کلام ریختہ سے کم رتبہ نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ (زندگی میں ایک مرتبہ) دو برس تک ریختہ کا شغل موقوف کر رکھا تھا تو اس زمانے میں قریباً دو ہزار فارسی اشعار پر مشتمل ایک دیوان تیار ہو گیا تھا![1]

مظفر علی سیّد کا خیال ہے کہ میرؔ نے خانِ آرزو سے علیحدگی کے بعد ریختہ گوئی موقوف کر رکھی تھی۔

> اسی دور میں انھوں نے اپنا زیادہ تر فارسی کلام کہا اور ساتھ ہی جینے کا وہ حوصلہ پیدا کیا جس کے بغیر وہ نوّے سال تک ایک پرآشوب دور کے شدائد کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ گویا میرؔ کے فارسی دیوان کو ان کی تاریخی صورتِ حال اور کمالِ فن دونوں لحاظ سے ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔[2]

فارسی، افغانی حملہ آوروں کی زبان تھی جو ہندوستان پر ان کے قبضے کے بعد درباری زبان بنی۔ بعد میں ترکی النسل بادشاہوں نے بھی فارسی کو درباری زبان بنائے رکھا، لیکن فارسی کو بے مثال

---

[1] نقوش میر نمبر (۳)، شمارہ ۱۳۱، اگست ۱۹۸۳ء، ص: ۶۲۳۔

[2] نقوش میر نمبر (۳)، شمارہ ۱۳۱، اگست ۱۹۸۳ء، ص: ۶۴۲۔

عروج مغل دورِ حکومت میں حاصل ہوا۔ مغل بادشاہوں کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے ایران سے باکمال شاعر ہندوستان آنے لگے تھے۔ ہندوستان میں فارسی دربار کی زبان تھی، اشرافیہ کا ذریعہ ابلاغ تھی اور فارسی جاننا تہذیب یافتہ ہونے کا پہلا ثبوت تھا۔ فارسی میں ایک بین الاقوامیت بھی تھی، ہندوستان سے اناطولیہ تک بشمول کاشغر دنیا فارسی خواں تھی۔ ایران میں صفوی بادشاہوں کے عہد (۱۵۰۱ء تا ۱۷۳۶ء) میں ایرانیت اور دوسری معاشرتی اور مذہبی تحریکوں نے ایران کو دوسری فارسی بولنے اور لکھنے والی دنیا سے دور کر دیا۔ یہاں تک کہ سولھویں صدی میں ماورا النہر اور سلطنت عثمانیہ کے محروسہ ممالک تیزی سے ترکی کی طرف راغب ہو گئے۔

ایران کی ہندوستان نژاد فارسی شاعروں کی ناقدری اور مغل سلطنت کے اقتدار کی زوال پذیری کے نمایاں عوامل کی وجہ سے اٹھارویں صدی کے ابتدائی ربع میں، اس زمانے میں جب اردو بولنے والے لوگوں نے فارسی کی بالادستی سے نکلنے کے لیے جدوجہد کی اور اپنی زبان میں لکھنا شروع کیا، اردو شاعری نے دلّی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ اس طرح کی روش اس حقیقت کی وجہ سے بہت زیادہ پسند کی گئی کہ شعرا کی اکثریت سوداؔ کے استثنٰی کے ساتھ اشرافیہ حلقوں کے بجائے جو فارسی تہذیب سے منسلک تھے؛ پیشہ ور، دانشور، اور صوفیوں کے طبقوں سے آئی تھی۔[1] میرؔ کی فارسی شاعری غالباً ان کے لیے اشرافیہ کے حلقے میں داخلے کا پروانہ بھی تھی۔

میرؔ کے ہم عصر سوداؔ، دردؔ، جانِ جاناںؔ، وغیرہ بھی اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی شعر کہہ رہے تھے۔ میرؔ نے نہ صرف فارسی میں انتہائی اعلیٰ اشعار کہے بلکہ فارسی نثر میں اپنی سوانح ذکرِ میر، شاعروں کا تذکرہ نکات الشعرا اور ایک کتاب فیضِ میرؔ لکھی۔

مظفر علی سیّد نے میرؔ کی فارسی شاعری کو بیدلؔ (۱۶۴۴ء تا ۱۷۲۰ء) اور غالبؔ (۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء) کے درمیان کے دور کی بہترین فارسی شاعری قرار دیا ہے۔[2] محمود حسن قیصر امروہوی نے میرؔ کے فارسی کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے دریافت کیا ہے کہ، ''اردو کی طرح فارسی میں بھی انھوں نے قریب قریب ہر صنفِ شعر کو لیا ہے اور ہر قسم کے مضامین کو نظم کیا ہے، بلکہ اکثر مقامات پر فارسی میں انھوں نے جو بلند مضامین نظم کیے ہیں ان کی مثال ان کی اردو شاعری میں کمی کے ساتھ ملتی ہے''۔[3]

میرؔ کے اردو کلام کو اتنا قبولِ عام حاصل ہوا کہ ان کا فارسی کلام تقریباً محجوب ہو گیا۔ حالانکہ

---

1 نقوش میر نمبر (۳)، شمارہ ۱۳۱، اگست ۱۹۸۳ء، ص: ۶۷۰۔

2 عشرت حق Glimpses of Mughal Society and Culture, A Study Based on Urdu Literature in the Second Half of the Eighteenth Century، کونسیپٹ پبلشنگ کمپنی، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص: ۲۰۔

3 دلی کالج اردو میگزین (یونگ کلاسز)، میر نمبر، شعبۂ اردو، دلی کالج (ایونگ کلاسز)، دلی، ۱۹۶۲ء، ص: ۳۲۳۔

ان کی زندگی اور اس کے بعد تقریباً سو سال تک فارسی شاعری برصغیر پاک و ہند میں کی جاتی رہی۔ میرؔ کا فارسی دیوان ۱۹۸۳ء تک مخطوطے کی شکل میں محفوظ رہا۔ اشاعت کی صورت جریدہ نقوش کے میرؔ نمبر میں ہوئی۔

میرؔ کی مکمل فارسی شاعری دیوان کی شکل میں پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ یہ فارسی دیوان بنیادی طور پر مسعود حسن رضوی ادیب کا مرتب کردہ ہے۔ صرف چند مقامات پر ادارۂ ادبیات، حیدرآباد دکن کے مخطوطے کی نقل سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس مخطوطے کا عکس بھی نقوش کے میر نمبر (۳) میں شائع ہوا تھا۔[1] میر کے منتخب اشعار شریف حسین قاسمی کے نثری ترجمے کے ساتھ جریدہ اردو ادب میں نئی دہلی سے ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئے۔ قاسمی کا ترجمہ حشو و زوائد سے پُر ہے۔

میں رفیق احمد نقشؔ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ترجمے میں پیش آنے والی مشکلات کے حل میں میری مدد کی۔ میں اپنی شریک حیات تنویر انجم کا بھی ممنون ہوں جن کے مشورہ سے متعدد اشعار کا عام فہم ترجمہ ممکن ہوا۔

میرؔ کے اشعار کا ترجمہ قاری کی سہولت کے لیے ساتھ ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ یہ نثری ترجمہ اصل فارسی متن سے ممکنہ حد تک مطابقت رکھتے ہوئے کیا گیا ہے اور اس امید کے ساتھ پیش ہے کہ قارئین ان خوبصورت اور بیش قیمت اشعار کو پڑھ کر میرؔ کی شاعری کی ایک اور جہت سے آشنا ہوں گے اور ان اشعار کے محاسن ان کی جمالیاتی اور فکری ثروت میں اضافہ کریں گے۔

افضال احمد سیّد
کراچی
۵ر اکتوبر ۲۰۱۱ء

---

[1] نقوش میر نمبر (۳)، شمارہ ۱۳۱، اگست ۱۹۸۳ء، ص: ۲۸۷ تا ۳۶۲۔

غزلیات

۱

اے ز انعامِ تو وا شد غنچۂ امکانِ ما
آب در جو دارد از لطفِ تو باغِ جانِ ما
با کرم گر کار افتد جرم ما را نیست قدر
یک پرِ کاہ است کوہِ شامخِ عصیانِ ما
دیدۂ تر کے تسلی‌بخشِ عاشق می شود
منبعِ طوفاں شود یاربِ سرِ مژگانِ ما
ایں نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودن است
مرگ ہم یک منزل است از راہِ بے‌پایانِ ما
میرؔ اگر ایں است جوشِ گریہ در ہجرانِ یار
ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریانِ ما

۲

کنوں حفظ کن آبروئے مرا
میندار بر خاک روئے مرا
بجویم ترا ہر کجا تا کجا
بہ جاے رساں جستجوئے مرا
چرا نشکند کز ازل بودہ است
سرے با شکستن سبوئے مرا
بینداز گوشے بہ ہر حرفِ من
اداہا بود گفتگوئے مرا
خوش آں دم کہ بر سینہ زانو نہی
بری تا بہ خوبی گلوئے مرا
بہ عہدِ جنوں شورشے داشتم
تو نشنیدہ ای ہائے ہوئے مرا
بہ مُردن تسلی شدم ورنہ میرؔ
نہایت نہ بود آرزوئے مرا

۱

اے (خدا) تیری عنایت سے ہمارا غنچۂ امکاں کھلا
تیری مہربانی سے ہمارے باغِ جاں کی نہر پانی سے بھری ہوئی ہے
اگر (تیرے) کرم سے کام پڑا، ہمارے جرم کی (کوئی) حیثیت نہیں ہے
ہمارے گناہوں کا بلند پہاڑ ایک تنکے (کے برابر) ہے
دیدۂ تر عاشق کے لیے کب تسلّی دینے والا ہوتا ہے
یارب ہماری پلکوں کا کنارہ طوفان کا منبع ہو جائے
یہ گمان نہ کرنا کہ مرنا آرام پانے کا باعث ہے
ہماری بے پایاں راہ میں موت بھی ایک منزل ہے
میرؔ اگر یار کے ہجر میں رونے کا ولولہ یہی ہے
بادل (بھی) ہمارے دیدۂ گریاں سے پانی لے جائے گا

۲

اب میری آبرو کی حفاظت کر
خاک پر میرا چہرہ نہ جھکا
تجھے کہاں کہاں ڈھونڈتے ہیں
میری جستجو کو منزل تک پہنچا دے
کیوں نہ ٹوٹ جائے کہ ازل سے ہے
میرا سبو ٹوٹنے کی فکر میں
میرے ہر حرف پر کان دھر
میری گفتگو بہت سی ادائیں رکھتی ہے
وہ مبارک ساعت (تھی) کہ تو نے سینے پر زانو رکھا
تاکہ اچھی طرح میرا گلا کاٹ سکے
(میں) عہدِ جنوں میں ایک شورش رکھتا تھا
تو نے میری ہائے ہو نہیں سنی ہے
میں مرنے سے تسلّی پا گیا ورنہ میرؔ
میری آرزو کی انتہا نہیں تھی

۳

چہ علم است از دہانِ تنگِ او ما روسیاہاں را
نماید رہ مگر با سبز خط گم کردہ راہاں را
زنی تا چشم برہم، مہر رنگِ کینہ می گیرد
مروّت آشنائی نیست ہرگز خوش نگاہاں را
جہانے گو بہ محشر بر سرِ خود خاک اندازد
کہ می پرسد بہ پیشِ خوبیِ او دادخواہاں را
مرا از سیرِ گلشن دل خوشی حاصل نمی گردد
بہ یادم می دہد ہر غنچۂ گل کج کلاہاں را
چہ بودم من کہ بر تن جامۂ صدپارہ اے دارم
بہ کویش در لباسِ فقر دیدم پادشاہاں را
کند خواہی نہ خواہی ہر سحر قتلِ وفاداراں
بہ گردن بستہ شمشیرِ تو خونِ بے گناہاں را
بہ ایراں می روم دہ پانزدہ بیتم عنایت کن
رہ آوردے ست میرؔ اشعارِ تو اہلِ صفاہاں را

۴

میآور در سخن دل تفتگانِ شوقِ جاناں را
کسے رو می دہد اے ہم نفس آتش زباناں را
پے خوش ابرواں باید بسا خونِ جگر خوردن
بہ دست آوردن آساں نیست ایں ابروکماناں را
چہ حظ از سیرِ گلزارم کہ یادم می دہد ہردم
قبائے چاکِ گل لباسِ نوجواناں را
چہ کافر ساحری اے عشقِ بے پروا و دیں دشمن
کہ بستی بر میاں زنّار آخر سبحہ خواناں را
بیا اے میرؔ در راہِ محبت خویش را گم کن
اگر خواہی کہ دریابی نشانِ بے نشاناں را

۳

ہم روسیاہوں کو اس کے تنگ دہن کا کیا پتہ ہے
مگر وہ سبز خط سے گم کردہ راہوں کو راہ دکھاتا ہے
تو جب تک آنکھ جھپکتا ہے محبت کینے کا رنگ پکڑ لیتی ہے
خوش نگاہوں کو مروّت سے بالکل آشنائی نہیں ہے
جہاں سے کہو کہ محشر میں اپنے سر پر خاک ڈالے
کہ اس کی خوبصورتی کے سامنے انصاف چاہنے والوں کو کون پوچھتا ہے
مجھے سیرِ گلشن سے دل کی خوشی حاصل نہیں ہوئی
ہر غنچۂ گل مجھے کج کلاہوں[1] کی یاد دلاتا ہے
میری کیا حیثیت کہ میرے بدن پر (تو) پھٹے پرانے کپڑے ہیں
اس کے کوچے میں بادشاہوں کو فقیری کے لباس میں دیکھا ہے
زبردستی ہر صبح وفاداروں کو قتل کرتا ہے
تیری شمشیر کی گردن پر بے گناہوں کا خوں بندھا ہے
ایران کو جا رہا ہوں دس پندرہ اشعار مجھے عنایت کر
میرؔ تیرے اشعار اہلِ اصفہان کے لیے تحفہ ہیں

۴

جانان کے عشق کے آزردہ دلوں کو بات مت کرنے دو
کون اے ہم نفس آتش زبانوں کے سامنے آتا ہے
اچھے ابرو والوں کے واسطے اکثر خونِ جگر پینا چاہیے
ان ابرو کمان والوں کو ہاتھ میں لانا آسان نہیں ہے
مجھے گلشن کی سیر کا کیا لطف کہ مجھے ہر دم یاد دلاتی ہے
گل کی چاک چاک قبا نوجوانوں کے لباس کی
تو کیا کافر جادوگر ہے اے عشق، بے پروا اور دین کا دشمن
کہ تو نے آخر تسبیح پڑھنے والوں کے بدن پر زنار باندھ دیا
آ اے میرؔ محبت کی راہ میں خود کو گم کر دے
اگر چاہتا ہے کہ بے نشانوں کا پتہ پائے

---

[1] ٹیڑھی ٹوپی والے، بانکے، معشوق۔

۵

نشری سہل ز غیب ایں بہ شہود آمدہ را
رہ بسے طے شدہ باشد بہ وجود آمدہ را
اشکِ گرمم ہمہ درد است خدا را دریاب
از رہِ دورِ دل ایں قاصدِ زودآمدہ را
گرچہ موجود نہ گشتیم ولے سہل مگیر
ایں غلط کاریٔ وہمِ بہ نمود آمدہ را
عجز را قدرِ بلندےست نہ پنداری سہل
ایں دل از منزلتِ خویش فرود آمدہ را
رفتۂ شوق شو و دیر و حرم را بگذار
طوف کن میرؔ بہ ہر در بہ سجود آمدہ را

۶

شب شیخ دید گردشِ چشمِ پیالہ را
برباد داد زاہدیِ دیرسالہ را
از ما حکایتِ غمِ دل می تواں شنید
ما خوب می کنیم بیاں ایں مقالہ را
یک رہ تو ہم بپرس از او اے نسیمِ صبح
من خود نہ یافتم سببِ داغِ لالہ را
غافل ز دل مشو کہ غنیمت شمردہ اند
اہلِ نظر مطالعہ ایں رسالہ را
شورِ تو عندلیب، جگر چاک می کند
آموختی ز میرؔ مگر طرزِ نالہ را

۷

بسکہ خوش دارد دلِ من مشربِ رندانہ را
بر سرِ بازار بر سر می کشم پیمانہ را

۵

غیب سے اس شہود میں آئے ہوئے کو سہل مت جانو
وجود میں آئے ہوئے نے بہت راہ طے کی ہوگی
میرا اشکِ گرم تمام سوز و گداز ہے خدا کے لیے دیکھ
دل کی دور کی راہ سے اس تیزی سے آئے ہوئے قاصد کو
گرچہ موجود نہیں رہا مگر سہل مت جان
وہم کی اس غلطی سے نمود میں آئے ہوئے کو
عجز کا مرتبہ بلند ہے، سہل مت جان
اپنے مرتبے سے نیچے آئے ہوئے اس دل کو
شوق میں بے خود ہو جا اور دیر و حرم کو چھوڑ
میرؔ ہر گرے ہوئے در کا طواف کر

٦

رات کو شیخ نے پیالہ کی آنکھ کی گردش دیکھی
سالوں پرانے زہد کو برباد کر دیا
ہم سے غمِ دل کی حکایت سننی چاہیے
ہم اس بات کو خوب بیان کرتے ہیں
ایک بار تو بھی اے نسیمِ صبح اس سے پوچھ
میں خود لالہ کے داغ کا سبب نہیں پا سکا
دل سے غافل مت ہو کہ غنیمت شمار کیا ہے
اہل نظر نے اس رسالے کے مطالعے کو
عندلیب تیرا شور جگر کو چاک کرتا ہے
(تو نے) ضرور میرؔ سے نالہ کے طرز کو سیکھا ہے

۷

بسکہ میرا دل مشربِ رندانہ کو پسند کرتا ہے
میں سرِ بازار پیمانہ کو سر چڑھا کر پیتا ہوں

بود بر ہر پارۂ دل صد الف داغ از غمش
خط کشی بعد از خرابی کرد عشق ایں خانہ را
قیس را آیا سگِ لیلیٰ ز صحرا جستہ بود
آدمی مطلق نمی دانست آں دیوانہ را
سینہ صافی ہاے من از گریۂ دیرینہ است
سیل ہا جاروب کش بودہ است ایں ویرانہ را
نیست برہم خوردنِ جمعیتِ ما ایں قدر
اندکے در جنبش آر آں ابروئے مردانہ را
شمع بر مشتِ غبارِ گل عذارے خوش نماست
برفشاں بر خاکِ من خاکسترِ پروانہ را
من نمی گفتم فریبِ اختلاطِ او مخور
دیدی آخر میرؔ طورِ آں وفابیگانہ را

۸

بے تو جاے کہ فتد دیدۂ نم ناک آں جا
سبزۂ تر شود از نو خس و خاشاک آں جا
طالعِ آں کہ بہ نخچیرگہِ عشق رسید
سر ہر صید نہ بندند بہ فتراک آں جا
اے کہ داری سرِ آں کوچہ اگر خواہی رفت
یادگارےست ز ما ہم دلِ صد چاک آں جا
بر درِ پیرِ مغاں پیشتر از صبح برو
فیض ہا می رسد از سلسلۂ تاک آں جا
میرؔ جاے کہ بہ نیرانِ محبت می سوخت
صبح دیدیم بہ جا ماندہ کفِ خاک آں جا

۹

ببیں کہ موسمِ گل شد سبب خزانِ مرا
بہار آمد و آتش زد آشیانِ مرا

دل کے ہر ٹکڑے پر اس کے غم کے سو ہزار نشانات تھے
عشق نے اس گھر کو خراب ہونے کے بعد مٹا دیا
قیس کو کیا سگ لیلیٰ نے صحرا سے نکال دیا
اس دیوانے کو مطلق آدمی نہیں سمجھتا تھا
میری صاف دلی بہت مدت سے روتے رہنے کی وجہ سے ہے
سیلاب اس ویرانے کے جاروب کش[1] رہے ہیں
ہماری جمعیت کا منتشر ہونا اتنا (مشکل) نہیں ہے
ذرا ان گھنی بھنوؤں کو حرکت میں لا
کسی گل عذار کے مشتِ غبار پر شمع اچھی لگتی ہے
میری خاک پر پروانے کی خاکستر ڈال
میں نے نہیں کہا تھا اس کی دوستی کا فریب مت کھا
آخر میرؔ تو نے اس وفا بیگانہ کا طور دیکھ لیا

۸

تیرے بغیر جس جگہ دیدۂ نمناک پڑتا ہے، وہاں
سبزۂ تر نئے سرے سے خس و خاشاک بن جاتا ہے
اس (شکار) کی قسمت (اچھی) کہ جو عشق کی شکارگاہ میں پہنچا
ہر شکار کا سر وہاں فتراک[2] سے نہیں باندھتے
اے تو جو کہ اس کوچے کا خیال رکھتا ہے اگر (وہاں) گیا
اس جگہ ہماری بھی دلِ صد چاک کی یادگار ہے
پیرِ مغان کے دروازے پر صبح سے پہلے چلے جاؤ
وہاں تاک کے سلسلے سے بہت سے فیض پہنچتے ہیں
میرؔ جس جگہ محبت کی آگ سے جلاتے ہیں
(ہم نے) صبح وہاں کفِ خاک بجی ہوئی دیکھی

۹

دیکھو کہ موسم گل میری خزاں کا سبب ہو گیا
بہار آئی اور میرے آشیاں کو آگ لگا دی

---

[1] جھاڑو دینے والے۔
[2] وہ تسمہ جو زین کے ساتھ آگے پیچھے لٹکا ہوا ہوتا ہے اور جس میں شکار وغیرہ لٹکایا جاتا ہے۔

بہم رسید متاعِ وفا بہ صد محنت
ولے پسند نیفتاد دل ستانِ مرا
کماں بہ دست گرفتی بہ طفلی و گردوں
نشانِ تیرِ بلا کرد استخوانِ مرا
بہ جمعِ ماتمیاں حرفِ من اثر دارد
بہ بزمِ عیش نہ فہمد کسے زبانِ مرا
ز ضعف میرؔ بہ چشمِ کسے نمی آیم
لطافتے ست چو جاں جسمِ ناتوانِ مرا

۱۰

قرار نیست بہ تن جانِ بے قراراں را
وداعِ عمر قریب است بے تو یاراں را
شبے نہ شد کہ سپہرے نہ کرد روز ولے
سحر نہ کرد شبِ تیرہ روزگاراں را
بہ حقِ دیدۂ نم ناک ساغرِ مۓ ناب
بجنش بارِ خدایا شراب خواراں را
ز باز پُرسِ قیامت چہ غم کہ بس باشد
وسیلۂ سرِ زلفش سیاہ کاراں را
ز جوشِ گریۂ ما غم کشاں مپرس کہ میرؔ
بنا بہ آب رساند است کوہساراں را

۱۱

لختِ دل ہر شب بہ دامانم، نمی دانم چرا
ہر سحر سر در گریبانم، نمی دانم چرا
باب لطفش نیستم لیکن چو از رہ می رسم
بر درِ او دیر می مانم، نمی دانم چرا
چارۂ من دل ربایاں جملہ می دانند لیک
کس نمی گوید کہ می دانم، نمی دانم چرا

ہزار کوشش کے بعد متاعِ وفا بہم پہنچی تھی
مگر میرا دل چھیننے والے نے پسند نہیں کی
تو نے بچپنے میں کمان ہاتھ میں اٹھائی اور آسماں نے
میرے استخواں کو تیرِ بلا کا نشانہ کر دیا
ماتم کرنے والوں کے مجمع میں میری بات اثر رکھتی ہے
بزمِ عیش میں کوئی میری زبان نہیں سمجھتا
ضعف سے میرؔ کسی کی آنکھوں میں نہیں آتا
میرا ناتواں جسم روح کی طرح لطیف ہے

۱۰

بے قراروں کے تن میں جان کو قرار نہیں ہے
تیرے بغیر یاروں کا جان سے جانا قریب ہے
ایک رات (ایسی) نہیں تھی کہ اس کو آسمان نے دن نہ کیا، مگر
تیرہ روزگاروں کی شب کو سحر نہیں کیا
دیدۂ نمناک کے صدقے میں مئے ناب کا ساغر
اے خدا شراب خواروں کو بخش دے
قیامت کی باز پرس کا کیا غم کہ کافی ہوگا
اس کی زلف کا وسیلہ سیاہ کاروں کو
ہم غم کشوں کے جوشِ گریہ کی نہ پوچھ کہ میرؔ
کوہساروں کی بنیاد کو ہلا دیتا ہے

۱۱

ہر شب لختِ دل میرے دامن میں (ہے)، نہیں جانتا کیوں
ہر سحر میرا سر میرے گریبان میں (ہے)، نہیں جانتا کیوں
اس کے لطف کے قابل نہیں ہوں لیکن جب راہ سے پہنچتا ہوں
اس کے دروازے پر دیر تک (کھڑا) رہتا ہوں، نہیں جانتا کیوں
سارے دل ربا میرا علاج جانتے ہیں لیکن
کوئی نہیں کہتا کہ میں جانتا ہوں، نہیں جانتا کیوں

نے از آں سو رنجشے، نے پیچشے، نے کاوشے
خود بہ خود خاطر پریشانم، نمی دانم چرا
باوجودِ ناامیدی گریہ چوں سر می کنم
می رسد دل تا بہ مژگانم، نمی دانم چرا
او غرورِ حسن دارد زیں سبب پرواش نیست
من کہ ضبطِ خویش نتوانم، نمی دانم چرا
گریہِ من گرچہ می دانم نہ دارد حاصلے
باز صبح و شام گریانم، نمی دانم چرا
میلِ او امکاں نہ دارد سوئے عاشق ویں کہ من
با ہزاراں نام می خوانم، نمی دانم چرا
مدّتے شد میرؔ مژگانش ز من برگشتہ است
خارخارے ہست با جانم، نمی دانم چرا

۱۲

چوں بکف بینم کماں آں ترکِ سخت کیش را
دل شود بےتاب و از جاہا نمایم خویش را
چشم خود پیش از سحر بکشا کہ شیرانِ خدا
در نظر دارند غافل وقتِ گرگ و میش را
پند با دیوانگاں ناصح نہ دارد حاصلے
شیوۂ رحمے بیاموز آں ستم اندیش را
بر نہ دارد از سرِ ما دستِ شفقت ہیچ گاہ
عشق می داند نمک‌خوارِ خود ایں دل ریش را
ہم چو میرؔ آزردہ جانے دیر پیدا می شود
مغتنم دانید روزے چند ایں درویش را

۱۳

دل کہ در سینہ می تپید مرا
ایں زماں از مژہ چکید مرا

اس طرف سے نہ کوئی رنجش، نہ کوئی الجھن، نہ کوئی خلش
خودبخود پریشاں خاطر ہوں، نہیں جانتا کیوں
ناامیدی کے باوجود جب گریہ شروع کرتا ہوں
دل میری پلکوں تک آجاتا ہے، نہیں جانتا کیوں
اسے حسن پر غرور ہے اور اس وجہ سے اس کو پروا نہیں ہے
میں نہیں جانتا کہ میں کیوں خود کو سنبھال نہیں سکتا
گرچہ میں جانتا ہوں کہ میرے رونے کا کوئی حاصل نہیں ہے
پھر بھی صبح وشام روتا ہوں، نہیں جانتا کیوں
عاشق کی طرف اس کا راغب ہونا امکان نہیں رکھتا اور یہ کہ میں
(اسے) ہزاروں نام سے پکارتا ہوں، نہیں جانتا کیوں
مدت ہوئی ہے میرؔ اس کی مژگاں مجھ سے پھری ہوئی ہیں
میری جان کو بے چینی ہے، نہیں جانتا کیوں

۱۲

جب اس ترک ستم گر کے ہاتھ میں کمان دیکھتا ہوں
دل بے تاب ہو جاتا ہے اور جگہ جگہ سے خود کو سامنے لاتا ہوں
اپنی آنکھ سحر سے پہلے کھول کہ خدا کے شیر
اے غافل، وقتِ گرگ ومیش[1] کو نظر میں رکھتے ہیں
ناصح دیوانوں کو نصیحت کوئی حاصل نہیں رکھتی
اس ستم اندیش کو رحم کا شیوہ سکھا
کبھی بھی ہمارے سر سے دستِ شفقت نہیں کھینچتا
عشق اس زخمی دل کو اپنا نمک خوار سمجھتا ہے
میرؔ سا آزردہ جاں مدتوں میں پیدا ہوتا ہے
چند روز اس درویش کو مغتنم سمجھیے

۱۳

دل کہ میرے سینے میں تڑپتا تھا
آج کل میری پلکوں سے ٹپک رہا ہے

[1] تڑکے کا وقت جب آسمان پر سیاہی باقی ہوتی ہے۔

از لبِ او مپرس آه مپرس
کز غمش جاں بہ لب رسید مرا
آں کہ شب دید آتشم بہ فلک
صبح در رنگِ خاک دید مرا
زود باشد کہ دوستاں بینند
بر سرِ کوئے او شہید مرا
دست ہر دم بہ تیغ بردنِ او
میرؔ در خاک و خوں کشید مرا

۱۴

دارم چو جاں عزیز دلِ زارِ خویش را
خوں کردہ ام در او غمِ بسیارِ خویش را
گہ گہ چو آفتاب بہ سر مي رسیدہ باش
افتادگانِ سایۂ دیوارِ خویش را
تحقیق کن کز اولِ خلقت کسے ہنوز
زار ایں چنیں نہ کشتہ گرفتارِ خویش را
میرم ز رشکِ آں کہ بہ وقتِ وداعِ جاں
چشمے کشود و دید بہ سر یارِ خویش را
جور و جفاست کارِ تو و من ز سادگی
موقوفِ رحم داشتہ ام کارِ خویش را
محروم یک نگاہ مکن رخصت از جہاں
وارفتگانِ حسرتِ دیدارِ خویش را
سودائے ماست میرؔ بہ عیّار پیشہ اے
کو بارہا فروخت خریدارِ خویش را

۱۵

با ما ہنوز بےمزگی ہاست یار را
بے وجہ رنجشے ست ہماں آں نگار را

اس کے لب کی مت پوچھ، آہ مت پوچھ
کہ اس کے غم میں میری جان لبوں پر آ گئی
جس نے رات کو میری آگ آسماں پر دیکھی
صبح کو مجھے رنگِ خاک میں دیکھا
جلد ہو گا کہ دوست دیکھیں گے
اس کے کوچے میں مجھے شہید
اس کا ہردم تیغ پر ہاتھ لے جانا
میرؔ مجھے خاک وخوں میں لٹا گیا

۱۴

اپنے دلِ زار کو جان کی طرح عزیز رکھتا ہوں
اس میں اپنے بہت زیادہ غم خون کر چکا ہوں
کبھی کبھی آفتاب کی طرح سر پر پہنچ جایا کر
اپنی دیوار کے سائے میں پڑے ہووں کے
تحقیق کر کہ اولِ خلقت سے کسی نے آج تک
اپنے گرفتار کو اتنی بری طرح نہیں قتل کیا
اس پر رشک سے مرتا ہوں کہ (جس نے) جان جانے کے وقت
آنکھ کھولی اور سرہانے اپنے یار کو دیکھا
جور و جفا تیرا کام ہے اور میں نے سادگی سے
اپنی مراد رحم پر موقوف کر رکھی ہے
جہاں سے رخصت (کے وقت) ایک نگاہ سے محروم نہ کر
تیرے دیدار کی حسرت میں خود سے گذر جانے والوں کو
میرؔ ہمارا سودا ایک عیار پیشہ سے ہے
کہ جس نے اپنے خریدار کو بارہا بیچ دیا (ہے)

۱۵

یار کو ابھی تک مجھ سے بہت سی شکایتیں ہیں
اس خوبصورت معشوق کو بے وجہ یہ تمام رنجش ہے

ما تازہ واردانِ جہانِ کہن نہ ایم
بُردیدہ ایم گردشِ لیل و نہار را
گشتیم خاک و کینۂ دیرینہ ات بجاست
بیروں نمی کنی ز دلت ایں غبار را
بر خاک ہم ز پہلوے ما کار تنگ شد
یارب کجا بریم دلِ بےقرار را
از دل نہ رفت جنبشِ مژگانِ گل رخاں
با خود بہ خاک می برم ایں خار خار را
بر ہر سخن گریستنم مصلحت نہ بود
از دست داد بےتہیِ چشم کار را
برداشتن ز خاک بسے مشکل است میرؔ
مجروحِ بےحدِ ستمِ روزگار را

۱۶

انس امسال نہ ماندہ ست ز انساں ما را
می کشد دل ز جنوں سوئے بیاباں ما را
بے تو شب باشیِ گل زار کجا خواہش بود
بہ زباں داشتہ بلبل بہ گلستاں ما را[1]

۱۷

حالیا در دل نمی گنجد غمِ بسیارِ ما
یک دو روز اے بےوفا کم کم بکن آزارِ ما
ما بہ یک دیدِ چمن از دور دل خوش می کنیم
بر نہ تابد منتِ گل گوشۂ دستارِ ما
کوچۂ اور را چمن کردیم چوں رخصت شدیم
ریخت رنگِ تازہ صد جا دیدۂ خوں بارِ ما

---

[1] اگلے تین اشعار مخدوش ہیں۔

ہم جہانِ کہن میں تازہ وارد نہیں ہوئے ہیں
لیل و نہار کی گردش بہت دیکھ چکے ہیں
ہم خاک ہو گئے اور تیرا پرانا کینہ اپنی جگہ پر ہے
تو اپنے دل سے اس غبار کو باہر نہیں کرتا
خاک پر بھی ہمارے معاملے میں کام مشکل رہا
یارب دلِ بے قرار کو کہاں لے جائیں
دل سے گل رخوں کی مژگاں کی کھٹک نہیں گئی
اپنے ساتھ خاک میں اس خار خار[1] کو لیے جاتا ہوں
ہر بات پر میرا رونا مصلحت نہیں تھا
آنکھ کی کم ظرفی نے کام ہاتھ سے کھو دیا
خاک پر سے اٹھانا بہت مشکل ہے میرؔ
زمانے کے ستم کے بے حد مجروح کو

۱۶

اس سال ہمیں انسانوں سے انس باقی نہیں رہا ہے
دل ہمیں جنوں کے ساتھ بیاباں کی طرف کھینچ رہا ہے
تیرے بغیر گلزار میں شب باشی کی خواہش کہاں تھی
بلبل نے ہم سے گلستاں (میں آنے) خوشامد کی تھی

۱۷

ان دنوں دل میں ہمارا غمِ بسیار نہیں سماتا
ایک دو روز اے بے وفا ہمیں کم کم آزار دے
ہم دور سے دل کو چمن کے ایک نظارے سے دل خوش کر لیتے ہیں
ہمارا گوشۂ دستار گل کا احسان اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا
ہم نے اس کے کوچہ کو چمن کر دیا جب رخصت ہوئے
ہماری خون رونے والی آنکھوں نے سو جگہ تازہ رنگ بکھیر دیے تھے

---

[1] بے چینی۔

ما خود اے صورت‌گراں بیش از خیالے نیستیم
شاید از دستِ شما صورت بگیرد کارِ ما
در بدآموزیِ او ہیچ احتیاجِ غیر نیست
خوب می داند رہ و رسمِ جفا را یارِ ما
من بہ خاکِ رہ برابر گشتم و یک رہ نہ گفت
بود خاک افتادہ اے در سایۂ دیوارِ ما
کاروانِ گریہ ایم و می رسیم از شہرِ دل
نیست چیزے میرؔ غیر از درد و غم در بارِ ما

۱۸

بیا بہ طرف شہیدِ نگاہِ خوباں را
ببیں مروّتِ چشمِ سیاہِ خوباں را
تو اے غزال چکارہ گری کہ روحِ امیں
کمینہ صید بود دام گاہِ خوباں را
بہ یاد می دہدم غنچگیِ گل در باغ
شکستِ تازۂ طرفِ کلاہِ خوباں را
ملک اگر ہمہ بر عرش می پرد لیکن
جگر کجا کہ نویسد گناہِ خوباں را
نظر بہ کحلِ جواہر نمی کند اے میرؔ
بہ دیدہ آں کہ کشد گردِ راہِ خوباں را

۱۹

شُد ز پہلو دلِ یگانۂ ما
بے سبب نیست دردِ شانۂ ما
جز بدی از کسے نمی آید
رسمِ خوبے ست در زمانۂ ما
گوئیا سرگزشت مجنون است
می چکد درد از فسانۂ ما

ہم خود بھی اے صورت گرو ایک خیال سے زیادہ نہیں ہیں
شاید تمہارے ہاتھ سے ہماری مراد بر آنے کی صورت نکل آئے
اس کو برائی سیکھنے کے لیے غیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے
ہمارا یار جفا کی رہ و رسم خوب جانتا ہے
ہم خاکِ رہ کے برابر ہو گئے اور ایک بار (بھی) نہ کہا
ہماری دیوار کے سائے میں ایک خاک افتادہ ہوا کرتا تھا
کاروانِ گریہ ہیں اور شہرِ دل سے آئے ہیں
ہمارے اسباب میں میرؔ درد و غم کے سوا اور کچھ نہیں ہے

۱۸

خوباں کی نگاہ کے شہید کی طرف آ
خوباں کی چشمِ سیاہ کی مروّت کو دیکھ
اے غزال تیری کیا اوقات ہے کہ روح الامین (بھی)
ادنیٰ صید ہو جائے خوباں کی دام گاہ کا
مجھے باغ میں گل کی غنچگی یاد دلاتی ہے
کلاہِ خوباں کے کنارے کی تازہ شکن کی
اگر فرشتے پورے عرش پر بھی اڑتے رہیں تب بھی
(ان کی) اتنی ہمت کہاں کہ خوباں کا گناہ لکھیں
موتی پڑے ہوئے سرمے پر نظر نہیں ڈالتا اے میرؔ
وہ جو خوباں کی راہ کی گرد آنکھوں میں لگاتا ہے

۱۹

ہمارے پہلو میں دلِ یگانہ ختم ہو گیا
ہمارا دردِ شانہ بے سبب نہیں ہے
کسی سے بدی کے سوا کچھ اور نہیں ملتا
ہمارے زمانے میں یہ خوب رسم ہے
تو کہے مجنوں کی سرگزشت ہے
ہمارے فسانہ سے درد ٹپکتا ہے

نالۂ بلبلانِ سیرآہنگ
می دہد یاد از ترانۂ ما
عمرِ من بر درِ کسے بگذشت
کہ نیامد یکے بہ خانۂ ما
نیست مرغے کہ بر زبانش نیست
بیتِ اندازِ عاشقانۂ ما
حیف در شورہ زارِ عالم میرؔ
سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

۲۰

رو بہ گلشن کرد پائیز از شکستِ رنگِ ما
نوحہ گر شد از غمِ دل مرغِ سیرآہنگِ ما
ما کہ سیرِ عالمِ تنزیہ عمرے کردہ ایم
وسعتِ ایں جائے آید بہ چشمِ تنگِ ما
خرّمی معلوم شد لفظِ زبانِ دیگر است
ایں لغت جائے نمی یابند در فرہنگِ ما
گفتگوئے سختِ ما ہم بے نزاکت نیست میرؔ
در بغل دارد چو سنگِ شیشہ مینا سنگِ ما

۲۱

بے تامّل کے شناسی طرزِ گفتارِ مرا
دیدۂ نازک کن کہ فہمی حرفِ تہہ دارِ مرا
آں چناں می آئی از تمکیں کہ گویا می روی
طرزِ رفتارِ تو باشد آمدِ کارِ مرا
تا ز چشمِ مستِ خود. رطلِ گرانم دادہ است
پا ز وضعِ خویش بیروں است رفتارِ مرا
جوشِ اشکم دید دریا، آتش از چشمش پرید
پیش خدمت گشت آخر گریۂ زارِ مرا

بلبلوں کا بلند آواز نالہ
ہمارے ترانے کی یاد دلاتا ہے
ہماری عمر کسی (ایسے) کے در پر گزر گئی
جو ایک بار بھی ہمارے گھر پر نہیں آیا
کوئی پرندہ (ایسا) نہیں ہے کہ جس کی زبان پر نہیں ہیں
ہمارے عاشقانہ انداز کے شعر
افسوس دنیا کی کھاری زمین میں میرؔ
ہمارا بیج سبز ہوئے بغیر جل گیا

۲۰

ہماری شکستِ رنگ (کی وجہ) سے خزاں نے گلشن کی طرف رخ کیا
ہمارا بلند آواز پرندہ غم دل کے سبب نوحہ گر بن گیا
ہم کہ عالمِ تجزیہ کی مدتوں سیر کر چکے ہیں
ہماری چشمِ تنگ میں اس جگہ وسعت نہیں آتی
خوشی معلوم ہوا دوسری زبان کا لفظ ہے
یہ لفظ ہماری فرہنگ میں جگہ نہیں پاتا
ہماری سخت گفتگو بھی بے نزاکت نہیں ہے میرؔ
ہمارے پتھر کو مینا سنگِ شیشہ[1] کی طرح پہلو میں رکھتی ہے

۲۱

تو کب غور کیے بغیر میری طرزِ گفتگو کو سمجھتا ہے
دقّتِ نظر سے کام لے تاکہ میرے تہ دار حرف کو سمجھے
تمکیں سے تو اس طرح آتا ہے گویا جا رہا ہے
تیری (اس) طرزِ رفتار سے میرا کام بن جاتا ہے
جب سے تو نے اپنی مست آنکھوں سے شراب کا بڑا جام دیا ہے
چلنے میں تیری رفتار کا انداز ہی کچھ اور ہو گیا ہے
سمندر نے میرے آنسوؤں کا جوش دیکھا، اس کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑیں،
آخرِ کار میرے گریۂ زار نے (اس کی) خدمت کی

---

[1] وہ پتھر جس کو پگھلا کر شیشہ بناتے ہیں۔

کار بر کوه و بیاباں از غمِ من تنگ شد
ظرف کم آمد جہاں اندوہِ بسیار مرا
سادگی بیں کز طبیبِ بے شگونے ہم چو عشق
آرزومندیٔ بہبودی ست بیمارِ مرا
میرؔ پشتِ چشمِ نازک کردنِ گل خار کرد
کاش بنمایند او را یک نظر یارِ مرا

۲۲

بلند انداختم چوں خوش قداں را
نمودم پست سروِ بوستاں را
چہ می پرسی کہ حالم گفتنی نیست
تو ہم مکشا سرِ ایں داستاں را
تو بے رنگی و گل کردی بہ رنگے
کہ گل گل بشکفانیدی جہاں را
وفائے گل اگر معلوم می شد
نمی بستم درِ ایں باغ آشیاں را
سرِ راہ میرؔ جاں دشوار می داد
چہ پیش آمد نہ دانم آں جواں را

۲۳

حیف بر حالِ دلِ خستہ نظر نیست ترا
مابہ ایں حال رسیدیم و خبر نیست ترا
بردہ تہ دازیت اے دیدہ، دل از جا ما را
می زند بحرِ بلا جوش و خطر نیست ترا[1]
داغم از گرم روی ہاے تو اے عمرِ عزیز
یک مژہ فرصتِ ماندن چو شرر نیست ترا

[1] اگلا شعر مخدوش ہے۔

میرے غم سے کوہ و بیاباں پر مشکل آ پڑی
میرے کثیر غم کے لیے جہاں کا ظرف کم پڑ گیا
سادگی دیکھ کہ عشق جیسے منحوس طبیب سے
میرا بیمار شفا کا آرزومند ہے
میرؔ گل کے غرور کرنے نے خار کر دیا
کاش اس کو ایک نظر میرا یار دکھائیں

۲۲

جب خوش قدوں کی بہت زیادہ تعریف کرتا ہوں
بوستاں کے سرو کو پست کر دکھاتا ہوں
کیا پوچھتے ہو کہ میرا حال کہنے کے لائق نہیں ہے
تو بھی اس داستان کو شروع مت کر
تو بے رنگ ہے اور رنگ میں ظاہر ہوا
کہ جہاں (کے باغ) کو طرح طرح کے رنگ میں کھلا دیا ہے
اگر گل کی وفا معلوم ہوتی
اس باغ میں آشیاں نہیں باندھتا
سرِ رہ میرؔ نے تکلیف سے جان دی
اس جوان کو کیا پیش آیا نہیں جانتا

۲۳

افسوس دلِ خستہ کے حال پر تیری نظر نہیں ہے
ہم اس حال کو پہنچ گئے اور تجھے خبر نہیں ہے
تیری تہ داری[1] اے دیدہ ہمارے دل کو اپنی جگہ سے لے گئی
بحرِ بلا جوش مار رہا ہے اور تجھے خوف نہیں ہے
تیری تیز رفتاری سے اے عمرِ عزیز میں رنجیدہ ہوں
شرر کی طرح تجھے پل بھر رکنے کی فرصت نہیں ہے

---

[1] گہرائی، دقت، مشکل، پیچیدگی۔

میرؔ مصروفِ بکا ایں ہمہ بودنِ ظالم
ہیچ اندوہِ دل و فکرِ جگر نیست ترا

۲۴

حرفِ بدگو نقشِ خاطر بودِ محبوب مرا
زد بہ فرقِ نامہ بر ناخواندہ مکتوبِ مرا
سعی اکنوں کن کہ بعد از من چہ حاصل اے فلک
شیوۂ رحمے اگر آموختی خوبِ مرا
چشمِ ساقی ہر زماں بوسم کہ در بزمِ شراب
از دو ساغر بےتکلف کرد مجحوبِ مرا
طرفہ تر ایں است آں ہم داغِ جست و جوئے اوست
در کنارِ ہر کہ جا کردہ ست مطلوبِ مرا
صبر کردن بر بلا اے میرؔ از من یاد گیر
گرمِ ایں کار است از حد بیش ایوبِ مرا

۲۵

لب را گہے بہ خندہ نیالودہ ایم ما
تا بودہ ایم، گریہ کناں بودہ ایم ما
ما واکشانِ سایۂ آں قامتِ خوش ایم
ہر گز بہ پائے سرو نیاسودہ ایم ما
گر سجدہ گاہِ خلق شود خاکِ ما بجاست
عمرے بہ پائے یار جبیں سودہ ایم ما
با آں امیدواری لطفے کہ داشتیم
حرفِ عنایتے ز تو نشنودہ ایم ما
ایں عقدہ در دل است کہ گاہے بہ کامِ دل
بندِ قبائے نازِ تو نکشودہ ایم ما
چوں سایہ با تو ایم و زبس شرمِ ناکسی
روئے سیاہِ خود بہ تو ننمودہ ایم ما

میرؔ آہ و زاری میں اتنا مصروف رہنا، ظالم
تجھے دل کے اندوہ اور جگر کی فکر ذرا بھی نہیں ہے

۲۴

بدگو کی بات میرے محبوب کو نقشِ خاطر تھی
میرے خط کو پڑھے بغیر نامہ بر کے سر پر مارا
اس وقت کوشش کر کہ میرے بعد اے فلک کیا حاصل
اگر میرے محبوب کو رحم کا شیوہ سکھاتا ہے
ہر وقت ساقی کی چشم کو بوسہ دیتا ہوں کہ شراب کی بزم میں
دو ساغر سے میرے محبوب کو بے تکلف بنا دیا
طرفہ تر یہ ہے (کہ) وہ بھی اس کی جستجو میں کمال رنجیدہ ہے
جس کسی کے پہلو میں (بھی) میرے مطلوب نے جگہ بنائی ہے
مصیبت پر صبر کرنا اے میرؔ مجھ سے سیکھ
میرا ایوب اس کام میں حد سے زیادہ سرگرم ہے

۲۵

لبوں کو کبھی ہنسی سے ہم نے آلودہ نہیں کیا
ہم جب تک زندہ رہے روتے رہے تھے
ہم اس خوبصورت قامت کے سائے میں پڑے رہنے والے ہیں
کبھی بھی ہم نے سرو کے قدموں میں آرام نہیں کیا
اگر ہماری خاک خلق کی سجدہ گاہ ہو جائے، بجا ہے
ایک عمر یار کے پاؤں پر ہم نے پیشانی رگڑی ہے
لطف کی اس امیدواری کے باوجود جو ہم رکھتے تھے
تجھ سے عنایت کا ایک حرف ہم نے نہیں سنا
یہ گرہ دل میں ہے کہ کبھی دل کی مراد (پوری کرنے) کے لیے
تیری قبائے ناز کا بند ہم نے نہیں کھولا ہے
سائے کی طرح تیرے ساتھ ہیں اور بے حیثیت ہونے کی شرمندگی کی وجہ سے
اپنا روئے سیاہ ہم نے تجھے نہیں دکھایا ہے

عالم بہ چشمِ ما ہمہ شد تیرہ و ہنوز
بر گریہ میرؔ نالہ نیفزودہ ایم ما

۲۶

چسپیدہ بہ دل طورِ تو عاشق ہنراں را
چشمِ تو ز خود ساختہ طالب نظراں را
یک بار سر از روزنۂ خانہ بروں کن
تنگ ایں ہمہ مپسند دلِ دربدراں را
رو سوئے گل و لالہ بہ ایں حسن میاور
برباد مدہ عزتِ خونیں جگراں را
سازند اگر شیشہ بدیں شکل بسازند
یک رہ بنمائید دلم شیشہ گراں را
میرم پے یک دیدن و دانستہ نہ بینند
عشق است بہ آزردنِ من خوش پسراں را
بر آبِ رواں مے کشیِ ما کہ مدام است
خوش می گذرانیم جہانِ گذراں را
آدابِ جنوں یاد ز من گیر کہ بسیار
دریافتہ ام صحبتِ آشفتہ سراں را
آں ای تو کہ سرگرمِ رہِ عشقِ تو پابند
دامن بہ میاں بر زدہ نازک کمراں را
آسودگیِ اہلِ فنا بے سببے نیست
شاید خبرے می رسد ایں بے خبراں را
خواہم کہ نختیں رسدم زخمِ رسائے
تا کشتۂ اور میرؔ نہ بینم دگراں را

۲۷

یک غنچۂ خوں نہ خوردہ چنیں پیشتر کہ ما
یک گل نہ داشت ایں ہمہ زخم جگر کہ ما

عالم ہماری آنکھوں میں تمام اندھیر ہو گیا اور ابھی تو
میرؔ رونے پر ہم نے فریاد کا اضافہ (تک) نہیں کیا ہے

۲۶

خوبصورتی کے چاہنے والوں کے دل پر تیرا انداز نقش ہو گیا ہے
تیری آنکھوں نے از خود طالب نظروں کو بنایا ہے
ایک بار سر گھر کے روزن سے باہر نکال
دربدروں کے دل کو اتنا تنگ (رکھنا) مت پسند کر
اس حسن کے ساتھ گل ولالہ کی طرف چہرے کو نہ کر
خونیں جگروں کی عزّت کو برباد مت کر
اگر شیشہ بنائیں تو بالکل اس شکل کا بنائیں
ایک بار میرا دل شیشہ گروں کو دکھلایئے
ایک (بار) دیکھنے کو مرتا ہوں اور جان کر نہیں دیکھتے
(ان) خوبصورت لڑکوں کو مجھے ستانے پر شاباش ہے
آبِ رواں پر ہماری یہ کشتی کون سی ہمیشہ کے لیے ہے
ہم جہانِ گزراں کو خوش گزار رہے ہیں
مجھ سے آدابِ جنوں سیکھ لے کہ بہت (کچھ)
میں نے آشفتہ سروں کی صحبت سے پایا ہے
تو وہ ہے کہ تیرے عشق کی راہ میں سرگرم پائے جاتے ہیں
نازک کمر رکھنے والے کمر بستہ ہو کر
اہلِ فنا کی آسودگی بے سبب نہیں ہے
شاید ان بے خبروں تک کوئی خبر پہنچی ہے
چاہتا ہوں کہ (سب سے) پہلے مجھے ایک زخم رسا پہنچے
تا کہ دوسروں کو میرؔ اس کا کشتہ نہ دیکھوں

۲۷

ایک غنچے نے (بھی) اس طرح پہلے خوں نہیں پیا تھا جتنا کہ ہم نے
ایک پھول نے (بھی) جگر پر اتنے سارے زخم نہیں کھائے تھے جتنے کہ ہم نے

برقے نہ جست خندہ زناں ایں چنیں کہ تو
ابرے نہ خاست گریہ کناں ایں قدر کہ ما
دعویٰ ضرور نیست ببینیم کہ می روی
زیں بزم اے چراغ تو پیش از سحر کہ ما
باز آمدہ بہ لالۂ ایں باغِ سبز بیں
او کے چنیں نشستہ بہ خوں تا کمر کہ ما
کردیم صرفِ ناخنِ خود میرؔ جبہہ را
زیں ساں کشادہ است کہ دستِ ہنر کہ ما

۲۸

بہ پیشِ روئے خود چیزے نمی دانند گلشن را
چہ بارے در سر است ایں دلبرانِ دوست دشمن را
بہ امیدے کہ عشق آتش زند ایں جانِ غم ناکم
بسانِ شمع یک جا کردہ ام رگ ہاے گردن را
بہ صحنِ ایں گلستان ماندہ ام یک عمر زنجیری
مگر نشنیدہ اید اے ہم صفیراں شورِ شیون را
تنک آبیِ دریا جاں بہ لب دارد مرا تا کے
فشارے می دہم چوں ابرِ تر یک بار دامن را
تعجب نیست گر اے میرؔ من قادر سخن گشتم
کہ خدمت کردہ ام بسیار مشاقانِ ایں فن را

۲۹

اندازِ دیدنِ او در خوں کشید ما را
از چشمِ یار زخمے آخر رسید ما را
شورِ محبتِ من از بس کہ دل کش افتاد
آمد برائے دیدن ہر کس شنید ما را
محرومِ واشدِ دل رفتیم ما کہ دوراں
در غنچگی بہ ناگہ زیں باغ چید ما را

کوئی برق اس طرح خندہ زناں نہیں چمکی تھی جیسا کہ تو
کوئی ابر اس قدر گریہ کناں نہیں اٹھا تھا جتنا کہ ہم
دعویٰ ضروری نہیں ہے ہم دیکھتے ہیں (کہ) تو جاتا ہے
سحر سے پہلے اس بزم سے اے چراغ کہ ہم
دوبارہ آکر اس باغِ سبز کے لالہ کو دیکھ
وہ کمر تک خوں میں اس طرح کب بیٹھا ہے کہ جیسے ہم
میرؔ ہم نے پیشانی کو اپنے ناخن پر صرف کر دیا
اس طرح دستِ ہنر کس کا کشادہ ہے (جیسا) کہ ہمارا

۲۸

اپنے چہرے کے سامنے گلشن کو کوئی چیز نہیں سمجھتے
نہ جانے یہ دوستوں کے دشمن دل چرانے والے کیا گمان رکھتے ہیں
اس امید پر کہ میری اس غم ناک جان کو عشق جلا ڈالے
شمع کی طرح گردن کی رگوں کو ہم نے یک جا کر دیا ہے
اس گلستان کے صحن میں ایک عمر زنجیری رہا ہوں
مگر اے ہم صیفرو (تم نے) شیون کا شور نہیں سنا
سمندر کی تنک آبی مجھے کب تک جان بلب رکھے گی
ابرِ تر کی طرح ایک بار دامن نچوڑ دیتا ہوں
تعجب نہیں ہے اگر اے میرؔ میں قادر سخن بن گیا
کہ اس فن کے مشاقوں کی بہت زیادہ خدمت کی ہے

۲۹

اس کے دیکھنے کے انداز نے مجھے خوں میں لٹایا
یار کی چشم سے آخر ایک زخم ہم تک پہنچا
میرا شورِ محبت نہایت دل کش نکلا
جس نے بھی سنا مجھے دیکھنے کے لیے آیا
ہم دل کے کھلنے سے محروم چلے گئے کہ زمانے نے
غنچے کی صورت میں (ہی) اچانک اس باغ سے ہمیں توڑ لیا

ہر کس بہ دلبر خود شد ہم‌کنار شاداں
حسرت فزود بے تو در روزِ عید ما را
میرؔ ایں ہمہ مروّت آخر بہ کامِ چشمت
با خاکِ تیرہ یکساں چوں سرمہ دید ما را

۳۰

گر چہ روکش نیستم در گریہ سامانِ ترا
لیک روزے می کشم اے ابر دامانِ ترا
مہ کجا و چہرۂ مہتابیِ تو از کجا
ننگ می آید از ایں نسبت غلامانِ ترا
باز از سر گر غبار از تربتم خیزد چہ دور
چشم بر رہ داشتم سروِ خرامانِ ترا
تیغِ نازت را دمے بے قتلِ ما آرام نیست
خوں کہ شیریں است ظالم تلخ کامانِ ترا
ذوقِ حرفت از کہ دریابم کہ در سر ہوش نیست
از شرابِ گفتگویت ہم کلامانِ ترا
ہیچ کس جز میرؔ تابِ چشم گرداندن نہ داشت
یک نظر دیدم سحر برگشتہ کامانِ ترا

۳۱

خطر در عشق ہر گام است جانِ بےقرارم را
عجب راہ آہ پیش آمد دلِ ناکردہ کارم را
نمودی صبح چشم و ہر طرف برخاست آشوبے
کشودی شام زلف و تیرہ کردی روزگارم را
بہ سویش می کشاید بالِ شوق از مرگِ خود غافل
مگر مرغِ چمن ہم گل گماں بردہ است یارم را
چوں آں دہقاں کہ کارد تخم و ناگہ خشک سال افتد
بغیر از ناامیدی نیست حاصل انتظارم را

ہر کوئی اپنے دلبر سے ہمکنار (ہو کر) خوش تھا
تیرے بغیر عید کے روز کے دن ہماری حسرت زیادہ ہوگئی
میرؔ اس ساری مروّت نے آخرکار تیری آنکھوں کی محبّت میں
ہمیں سرمہ کی طرح خاکِ تیرہ میں ملے ہوئے دیکھا

۳۰

گرچہ رونے میں تیری قدرت کا مقابل نہیں ہوں
لیکن ایک روز اے ابر میں تیرا داماں کھینچوں گا
مہتاب کہاں اور تیرا چاند سا چہرہ کہاں
اس تشبیہ سے تیرے غلاموں کو شرم آتی ہے
ایک بار پھر اگر میری تربت سے غبار اٹھے کیا عجب
(کیوں کہ) میں تیرے سروِ خراماں کے راستے میں آنکھیں بچھائے رکھتا تھا
تیری تیغِ ناز کو ایک دم بھی میرے قتل کے بغیر چین نہیں ہے
تیرے تلخ کاموں کا خوں ظالم کتنا شیریں ہے
کس سے تیری باتوں کا مزہ معلوم کروں کہ سر میں ہوش نہیں ہے
تیری گفتگو کی شراب سے، تیرے ہم کلاموں میں
میرؔ کے سوا کوئی بھی آنکھ پھیرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا
میں نے صبح ایک نظر تیرے تباہ حالوں کو دیکھا تھا

۳۱

عشق میں ہر قدم پر میری جانِ بے قرار کو خطرہ ہے
میرے ناتجربہ کار دل کو عجب راہ پیش آئی ہے
(تو نے) صبح آنکھ کھولی اور ہر طرف ایک آشوب اٹھا دیا
شام کو زلف کھولی اور میری زندگی کو تاریک کر دیا
اپنی موت سے غافل (ہو کر) شوق کے پر اس کی جانب تولتا ہے
ضرور مرغِ چمن نے بھی میرے یار پر گل کا گمان کیا ہے
اس دہقان کی طرح جو بیج بوتا ہے اور ناگہاں خشک سالی پڑ جاتی ہے
ناامیدی کے سوا میرے انتظار کا کچھ حاصل نہیں ہے

من آں سوزاں دروں بودم کہ از بہرِ مرادِ خود
بہ شب شمعے بہ کف پروانہ می جوید مزارم را
نہ بستم غنچہ، نے از من گلے بشگفت در ظاہر
و لیکن کے تواں پوشیدہ چوں عنبر بہارم را
کند آزردہ جانے گاہ باشد گریہ بر خاکم
مکن آوارہ اے بادِ صبا مشتِ غبارم را
کشم اے بحرِ خوبی تا کجا خمیازہ از شوقت
لبالب کن یکے مانندِ موج از خود کنارم را
چہ گویم میرؔ از آں سوزے کہ با خود داشتم پنہاں
چنار آسا تمامی سوخت آخر برگ و بارم را

۳۲

ہر جا صیدے ست صیدِ دامت بادا
ور طائرِ سدرہ است، رامت بادا
ساقی مے خرمی بہ جامت بادا
گردیدنِ آسماں بہ کامت بادا
از لطف پیالۂ حبابم کردی
دوراں بہ مرادِ دل مدامت بادا
با روے تو گر صبح مقابل گردد
خورشید گرفتار بہ شامت بادا
با غیر اگر وعدۂ فردا داری
فردائے تو فردائے قیامت بادا
در منعِ شراب گر کنی کوتاہی
واعظ خورش و خواب حرامت بادا
گر کفشِ تو اے شیخ بہ مسجد گم شد
اندوہ مخور سرت سلامت بادا

میں وہ سوزِ دروں سے جلنے والا تھا کہ اپنی مراد (حاصل کرنے) کے لیے
رات کو شمع ہتھیلی پر لیے پروانہ میرے مزار کو تلاش کرتا ہے
نہ میں نے غنچہ باندھا، نہ مجھ سے ظاہراً ایک پھول (بھی) کھلا
مگر کون عنبر کی طرح میری بہار کو چھپا سکتا ہے
ہو سکتا ہے کہ کوئی آزردہ جان کبھی میری خاک پر گریہ کرے
اے بادِ صبا میری مشتِ خاک کو مت بکھرا
اے بحرِ خوبی کب تک تیرے شوق کا خمیازہ کھینچوں
موج کی مانند ایک بار تو اپنے آپ سے میری آغوش کو بھر دے
میرؔ اس سوز کے بارے میں کیا کہوں جو میں خود میں چھپائے رکھتا تھا
چنار کی طرح آخر میرے برگ و بار کو تمام جلا گیا

۳۲

جہاں بھی شکار ہے، تیرے جال کا شکار ہو جائے
اگر طائرِ سدرہ[۱] ہے، تیرا مطیع ہو جائے
ساقی تیرے جام میں خوشی کی شراب رہے
آسماں کی گردش تیری رضا کے مطابق ہو جائے
مہربانی سے مجھے پیالۂ حباب بنا دیا
آسماں ہمیشہ تیری دل کی مراد پوری کرتا رہے
اگر (وہ) صبح تیرے چہرے کے سامنے آ جائے
خورشید تیری شام میں گرفتار ہو جائے
اگر غیر سے وعدۂ فردا کرتا ہے
تیرا فردا، فردائے قیامت ہو جائے
اگر شراب سے منع کرنے میں کوتاہی کرے
واعظ تیرا کھانا اور سونا حرام ہو جائے
اگر تیرا جوتا اے شیخ مسجد میں گم ہو گیا ہے
غم مت کر تیرا سر سلامت رہے

---

[۱] جبریل۔

در عہدِ تو گر میرؔ بہ کامے نہ رسید
ایام بہ کام مستدامت بادا

۳۳

در عشق کس نہ گشت حریفِ نبردِ ما
بر روئے ما نیامدہ جز رنگِ زردِ ما
بے رحمیِ تو تا چہ مقام است خود ببیں
مردیم بے تو و نہ رسیدی بہ دردِ ما
گردیدہ ایم خاک و ہماں فتنہ در سر ایم
سر می کشد بہ ناز از ایں دشت گردِ ما
کس خواہشِ ہنر نہ کند ورنہ ہست میرؔ
ایں جنس تودہ تودہ بہ بازارِ سردِ ما

۳۴

دوش بر شعرِ ترے در رقص آمد جانِ ما
چوں نظر کردیم بود آں شعر در دیوانِ ما
ما از ایں دینِ کہن بسیار خجلت می کشیم
تازہ سازد کاش عشقِ دلبرے ایمانِ ما
در خرامِ ناز پا را دیدہ دیدہ می گزار
خار در راہت مبادا باشد از مژگانِ ما
طاقِ دل افتاد و تو گاہے قدم نگذاشتی
خانہ بنشست و نہ گشتی زینتِ ایوانِ ما
باعثِ رسوائیِ ما گریۂ شب ہائے ماست
روزِ خوش یارب نہ بیند دیدۂ گریانِ ما
از خیالِ چہرۂ آں ماہ طلعت ہر زماں
یوسفے در جلوہ دارد کلبۂ احزانِ ما

اگرچہ تیرے عہد میں میرؔ (اپنی) مراد کو نہیں پہنچا
زمانہ ہمیشہ تیری مراد کو پورا کرے

۳۳

عشق میں کوئی ہمارا حریفِ نبرد نہیں ہوا
ہمارے منھ پر ہمارے زرد رنگ کے سوا کوئی نہیں آیا
تیری بے رحمی کہاں تک ہے خود دیکھ
ہم تیرے بغیر مر گئے اور تو ہمارے درد (کو دور کرنے) نہیں آیا
خاک چھان چکے ہیں اور سارے فتنے ہمارے سر میں ہیں
اس دشت میں ہمارا غبار ناز سے سر اٹھاتا ہے
کسی نے ہنر کی خواہش نہیں کی ورنہ میرؔ
یہ جنس ڈھیروں ہمارے بے رونق بازار میں ہے

۳۴

کل ایک شعرِ تر پر ہماری جان رقص میں آئی
جب نظر ڈالی وہ شعر ہمارے دیوان میں تھا
ہم نے اس پرانے دین سے بہت شرمندگی اٹھائی ہے
کاش ایک دلبر کا عشق ہمارا ایماں تازہ کر دے
خرامِ ناز میں پاؤں دیکھ دیکھ کر رکھ
تیری راہ میں ہماری پلکوں کا کانٹا نہ پڑا ہو
دل کا طاق[1] اگر (بھی) گیا اور تو نے کبھی قدم نہ رکھا
گھر ڈھے (بھی) گیا اور (تو) ہمارے ایواں کی زینت نہیں بنا
ہماری رسوائی کا باعث ہمارا راتوں کا رونا ہے
ہماری روتی ہوئی آنکھ یارب خوشی کا دن نہ دیکھے
اس ماہ طلعت کے چہرے کے خیال سے ہر وقت
ہمارے کلبۂ احزاں میں ایک یوسف کا جلوہ رہتا ہے

---

[1] محراب دار عالی شان عمارت۔

نیستم اے میرؔ گم نام ایں ہمہ در عاشقی
شہرتے دارد در آں کو خانۂ ویرانِ ما

۳۵

سال ہا بیمار ماندم بے تو کے دیدی مرا
مردم از بےلطفیّت آخر نہ پرسیدی مرا
رو بہ چوں من ناکسے یک بار آوردی مگر
کس نہ بود اے عشق در عالم کہ بگزیدی مرا
ایں قدر اے لالہ با من گرم جوشی خوب نیست
در چمن دیدی و ہم چوں داغ چسپیدی مرا
نیست چوں من نسخہ اے جامع ہزار افسوس میرؔ
دیر پیشت ماندم و مطلق نہ فہمیدی مرا

۳۶

از خطِ پشتِ لبت در دل چہ ہا داریم ما
می کشیم آزار و بر رویت نمی آریم ما
می برد ہر دم بہ تیغِ جور بےباکانہ دست
کشتۂ اندازِ اوباشانۂ یاریم ما
کو دماغ و دل کہ صرفِ سیرِ ایں گلشن کنیم
از غمِ مفرط بہ حالِ خود گرفتاریم ما
بعدِ مردن خاک گشتن آں گہے رفتن بہ باد
کارہا بسیار در پیش است و بےکاریم ما
تا کجا در ہجرِ او با فتنہ کس گردد دوچار
مصلحت در مرگ می بینیم ناچاریم ما
در امید لطفِ خوباں صرف شد عمرِ عزیز
میرؔ تا کے جانِ غم کش را بیازاریم ما

میرؔ میں عاشقی میں اتنا گم نام نہیں ہوں
اس کوچے میں ہمارے ویران گھر کی شہرت ہے

۳۵

تیرے بغیر سالہا بیمار رہا تو نے کب مجھے آ کر دیکھا
تیری بے توّجہی سے مر گیا آخر مجھے نہ پوچھا
مجھ جیسے بے کس کی طرف (تو نے) ایک بار رخ کیا، شاید
دنیا میں اے عشق کوئی (اور) نہیں تھا کہ تو نے مجھے ڈس لیا
اے لالہ مجھ سے اتنی گرم جوشی اچھی نہیں ہے
(تو نے) چمن میں دیکھا اور داغ کی طرح مجھ سے چمٹ گیا
مجھ جیسا کوئی جامعِ کمال نہیں ہے، ہزار افسوس میرؔ
بہت دنوں تک تیرے سامنے رہا اور (تو) مجھے مطلق نہیں سمجھا

۳۶

تیرے ہونٹ پر کے رووٗں سے ہم دل میں کیا کیا رکھتے ہیں
ہم آزار کھینچتے ہیں اور تجھ پر ظاہر نہیں کرتے
ہر دم ظلم کی تلوار کی طرف بے باکانہ ہاتھ بڑھائے رہتا ہے
ہم یار کے اوباشانہ انداز کے مارے ہوئے ہیں
دماغ اور دل کہاں کہ اس گلشن کی سیر میں صرف کریں
ہم غم کی افراط سے اپنے (ہی) حال میں گرفتار ہیں
مرنے کے بعد خاک ہونا اور اس کے بعد ہوا میں بکھر جانا
بہت سے کام پڑے ہوئے ہیں اور ہم بیکار بیٹھے ہیں
کہاں تک اس کے ہجر میں فتنے سے کوئی بچ سکتا ہے
مرنے ہی میں مصلحت دیکھتے ہیں، ہم ناچار ہیں
عمرِ عزیز خوباں کی مہربانی کی امید میں صرف ہوگئی
میرؔ کب تک غم اٹھانے والی جان پر (ہم) ظلم کرتے رہیں گے

۳۷

گردیده ایم کوے بہ کو شہرِ ناز را
مطلق رواج نیست متاعِ نیاز را
چیزے نمودہ طرح کہ او گرمِ ناز شد
آتش زنید خانۂ آئینہ ساز را
از اشک شیشہ بر سرِ مژگاں بہ ہر دم است
ماند بہ ہجر چشمِ ترم شیشہ باز را
آرامِ دل بہ بزمِ جہاں در خموشی است
چوں شمع می برند زبانِ دراز را
می بایدت گداختہ گشتن ز دردِ عشق
وقرے نمی نہند دلِ بےگداز را
از طورِ روزگار جواناں چہ آگہ اند
ایشاں نہ دیدہ اند نشیبؔ و فراز را
در شہرہ خانہ میرؔ مگر بود شب کہ صبح
دیدم بہ دستِ مغبچہ مہرِ نماز را

۳۸

چساں از خود کنم زاں گونہ شوخِ بدزبانے را
کہ آتش می شود بے ہیچ و می سوزد جہانے را
ز اخلاصِ تو اے جانِ جہاں اندیشہ ہا دارم
کہ می یابم بہ خود سرگرمِ کیں ہر مہربانے را
ز قتلِ میرؔ آگہ نیستم لیک ایں قدر دانم
کہ می بروند از کوئے تو نعشِ نوجوانے را

۳۹

شب از جگر کشیدم یک آہِ آتشیں را
او آتشے دگر زد در دلِ منِ حزیں را

۳۷

کوبہ کو شہرِ ناز میں ہم نے گشت کی ہے
متاعِ نیاز کا مطلق رواج نہیں ہے

ایک چیز نے (ایسی) صورت دکھائی کہ وہ مصروفِ ناز ہو گیا
آئینہ ساز کے گھر کو آگ لگا دیں

اشک سے ہر دم شیشہ مژگاں کے اوپر ہے
میری چشمِ تر شیشہ باز[۱] کو دور رکھتی ہے

دل کا آرام بزمِ جہاں میں خموشی میں ہے
شمع کی طرح زبانِ دراز کو قطع کر دیتے ہیں

دردِ عشق سے گداختہ ہو جانا چاہیے
دلِ بے گداز کو کوئی عزت نہیں بخشتا

نوجوان زمانے کے طور سے کب آگاہ ہیں
ان لوگوں نے نشیب و فراز نہیں دیکھا ہے

میرؔ ضرورات کو شراب خانے میں تھا کہ صبح
میں نے مغبچہ کے ہاتھ میں مہرِ نماز کو دیکھا ہے

۳۸

اتنے زیادہ بدزبان شوخ کو کس طرح اپنا بناؤں
کہ آتش بے پیچ ہو جاتی ہے اور دنیا کو جلا دیتی ہے

تیری دوستی سے اے جانِ جہاں بہت خوف کھاتا ہوں
کہ ہر مہرباں کو اپنے خلاف کینہ میں سرگرم پاتا ہوں

میرؔ کے قتل سے آگاہ نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں
کہ تیرے کوچے سے ایک نوجوان کی نعش لے جا رہے تھے

۳۹

شب کو جگر سے میں نے ایک آہِ آتشیں کھینچی
اس نے مجھ غم زدہ کے دل میں ایک اور ہی آگ لگا دی

---

[۱] وہ بازی گر جو پانی سے بھرا ہوا شیشہ سر پر رکھ کر ناچتے ہیں۔

غیرت نمی گذارد اے پندگو وگرنہ
یک لحظہ می نمودم آں سحر آفریں را
از نالہ میرؔ بس کن بے درد چند سازی
آزردہ رہ رواں را، رنجیدہ ہم نشیں را

۴۰

نہ گفتم ہم چو شمعِ کشتہ سوزِ سینۂ خود را
بہ خاموشی ادا کردم غمِ دیرینۂ خود را
نہ امروزی ست در مے خانہ ایں عاشق شرابی ہا
گرو صد بار کردم خرقۂ پشمینۂ خود را

۴۱

خودستائی، خودسری معیوب می دانیم ما
ورنہ طرزِ شعر گفتن خوب می دانیم ما
انتظارِ خطِ او از بس بہ گلشن می کشم
غنچۂ نشگفتہ را مکتوب می دانیم ما

۴۲

بر مرادِ دل نہ دیدم لالہ روئے خویش را
می برم در خاک با خود آرزوئے خویش را
بس کہ از بے اعتباری ہاے خود شرمندہ ام
بر ورش خواہم برید آخر گلوئے خویش را

۴۳

آمد اجل بہ صورتِ خوبے بہ سر مرا
در خاک و خوں کشید مصورپسر مرا

۴۴

بہ ذکرِ مے بیالودیم لب را
دعا گفتیم وردِ نیمہ شب را

غیرت اجازت نہیں دیتی اے ناصح وگرنہ
ایک لحظہ دکھاتا اس سحر آفریں کو
میرؔ اب نالہ بس کر، بے درد (اور) کتنا کرے گا
رہروؤں کو آزردہ، ہم نشیں کو رنجیدہ

۴۰

ہم نے بجھی ہوئی شمع کی طرح اپنے سوزِ سینہ کا بیان نہیں کیا
خاموشی سے اپنا غمِ دیرینہ بیان کر دیا
یہ بہت زیادہ شراب نوشی صرف آج ہی مے خانہ میں نہیں (کی) ہے
سو بار (میں نے) اپنا پشمینہ کا خرقہ گروی رکھا ہے

۴۱

خودستائی، خودسری ہم معیوب جانتے ہیں
ورنہ شعر کہنے کا طرز ہم خوب جانتے ہیں
اس کے خط کا انتظار مجھے گلشن کی طرف بہت زیادہ کھینچتا ہے
ناشگفتۂ غنچہ کو ہم مکتوب جانتے ہیں

۴۲

اپنے لالہ رو کو میں نے دل کی مراد پر نہیں دیکھا
خاک میں اپنے ساتھ اپنی آرزو کو لیے جاتا ہوں
کہ اسے میرا اعتبار نہیں ہے شرمندہ ہوں
اس کے دروازے پر آخرِ کار اپنا گلا کاٹ دوں گا

۴۳

موت میرے سر پر ایک محبوب کی صورت میں آئی
مصور پسر نے مجھے خاک وخوں میں لٹا دیا

۴۴

(ہم نے) شراب کے ذکر سے لب کو آلودہ کیا
آدھی رات کے وظیفہ کو (ہم نے) الوداع کہا

چو ره در کعبۂ وصلش نه یابی
مده از دست دامانِ ادب را

۴۵

کاہشے ہر سرِ شام است مرا
شوقِ آں ماہِ تمام است مرا
در بہ در کوے بہ کو می گردم
شوقِ او تا چہ مقام است مرا

۴۶

جاں را مده نسبت بہ او، جاناں کجا و جاں کجا
لطفِ تنش را در نگر خود، ایں کجا و آں کجا
در کوچۂ خود میرؔ را می دار چندے محترم
باز ایں مکان و جا کجا، آں بے سرو ساماں کجا

۴۷

بہ شور آورده اند از تو مزاجِ کوه و ہاموں را
بہ درد آمد سرِ تقلیدِ من فرہاد و مجنوں را

۴۸

نہ یافتم بہ جہاں بابِ منزلِ خود را
زدم دو رویہ گل آخر درِ دلِ خود را

۴۹

بساز گرمِ سخن باز لعلِ نوشیں را
نشاندہ‌ای بہ سرِ سنگ لعلِ رنگیں را

۵۰

ربود دل ز کف آں چشم نوعِ آدم را
نگاہِ بےخودش از ہوش برد عالم را

اگر (تو) اس کے وصل کے کعبہ کی راہ نہ پائے
ہاتھ سے دامانِ ادب کو نہ چھوڑ

۴۵

ہر سرِ شام مجھے ایک کاہش ہے
اس ماہِ تمام کا مجھے شوق ہے
در بہ در، کوچہ بہ کوچہ پھرتا ہوں
اس کا عشق مجھے کس حد تک ہے

۴۶

جان سے نسبت مت دے، جاناں کہاں اور جان کہاں
اس کے تن کے لطف کو خود دیکھ، یہ کہاں اور وہ کہاں
اپنے کوچے میں میرؔ کو کچھ دن احترام سے رکھ
بعد میں یہ مکان اور یہ جگہ کہاں، وہ بے سروساماں کہاں

۴۷

تیرے سبب (انھوں نے) کوہ اور بیابان کا مزاج برہم کر ڈالا ہے
میری تقلید کا خیال فرہاد اور مجنوں کو مصیبت میں ڈال گیا

۴۸

دنیا میں اپنے گھر کا دروازہ نہیں پایا
آخر اپنے دل کے دروازے پر دوروبہ مٹی بھر دی

۴۹

لعلِ نوشین کو دوبارہ گرمِ سخن کر
تو نے سرِ سنگ سے لعلِ رنگین کا پتہ بتایا ہے

۵۰

وہ آنکھ نوعِ آدم کا دل ہاتھ سے چرا لے گئی
اس کی بے خود نگاہیں دنیا کا ہوش لے اڑیں

۵۱

بے مروّت می نماید گل مرا
یاد خواہی کرد اے بلبل مرا

۵۲

از تپیدن برد آرام دلِ دیوانہ شب
غلط واغلطے بکردم من ز دردِ شانہ شب
بر لبم اے کاش نگذشتے غمِ بسیار عشق
باعثِ بےخوابیِ جمعے شد ایں افسانہ شب
چرخ زن بر گردِ شمعے گشت و خود را پاک سوخت
داغ شد جان و دلم از جرأتِ پروانہ شب
تا کدامیں تیرہ روزِ عشق گرمِ نالہ است
شعلہ اے سر می کشد ہر دم از ایں ویرانہ شب
در مے و شاہدپرستی رفتہ بود از کار میرؔ
مےکشاں کشتندش آخر بر در مےخانہ شب

۵۳

لطفے نما و پیشِ خودم از وفا طلب
یعنی مرا بہ بزم ز دشمنِ جدا طلب
فرسودہ گشت پائے تو یک سر بہ راہِ شوق
اے رفتۂ تلاشِ کسے، تا کجا طلب
خواہی کہ صبح وا شودت دیدہ بر رُخش
برخیز و مثلِ آئینہ دستِ دعا طلب
اے ہم‌نشیں اگر بہ طبیبے شوی دچار
ایں دردِ جاں‌گدازِ مرا ہم دوا طلب
تا چند میرؔ خاکِ در چوں خودے شدن
برخیز و ہر چہ می طلبی از خدا طلب

۵۱

مجھے گل بے مروّت نظر آتا ہے
اے بلبل تو مجھے یاد کرے گی

۵۲

رات تڑپنے سے دلِ دیوانہ نے میرا چین چھین لیا
میں رات شانے کے درد سے لوٹتا رہا
میرے ہونٹوں پر اے کاش عشق کے بے انتہا غم کی بات نہ آتی
رات محفل کی بے خوابی کا یہ افسانہ باعث ہو گیا
شمع کے گرد چکر لگایا اور خود کو تمام جلا ڈالا
رات میری جان اور دل پروانہ کی جرأت سے حسد کرنے لگے تھے
یہ کون سا عشق کا بدنصیب نالہ کرتا ہے
رات ایک شعلہ ہر دم اس ویرانے سے سر اٹھاتا ہے
مے اور شاہد پرستی میں میرؔ کام سے جاتا رہا تھا
رات شرابیوں نے آخر اسے مے خانے کے دروازے پر قتل کر دیا

۵۳

لطف کر اور محبّت سے مجھے اپنے پاس طلب کر
یعنی مجھے بزم میں دشمن سے جدا طلب کر
تیرے پیر عشق کے راستے میں بالکل چھل چکے ہیں
اے کسی کی تلاش میں جانے والے کہاں تک تلاش (کرے گا)
(اگر تو) چاہتا ہے کہ صبح تیری آنکھیں اس کے رخ پر کھلیں
اٹھ اور آئینے کی طرح دستِ دعا طلب کر
اے ہم نشیں تو اگر طبیب سے دوچار ہو
میرے اس دردِ جان گزار کی بھی دوا طلب کر
کب تک میرؔ کسی اپنے ہی جیسے کے دروازے کی خاک ہونا
اٹھ اور جو کچھ بھی مانگنا ہے خدا سے طلب کر

۵۴

به شکستن رسید حالا شب
باقیِ داستاں به فردا شب
بے تو می آورد به سر ہر روز
صد بلائے سیاه ما را، شب
می زند ناله تیغ و آه سناں
روزِ جنگ است دوستاں یا شب
ما که عادت پذیرِ لطفِ تو ایم
بگذرانیم چند تنہا شب
کلبۂ میرؔ جائے بد ہم نیست
می تواں کرد روز ایں جا، شب

۵۵

تا کجا ایں بے قراری تا به کے ایں اضطراب
کرد رسوائے جہانم، خانۂ خواہش خراب
کارؔ خود پیش از جوانی کن که اے غفلت سرشت
چشم تا برہم زنی خوابے ست ایامِ شباب
شکر ایزد را که دیدم زیرِ شلاقِ مغاں
بر درِ مےخانه شیخِ شہر را مستِ شراب

۵۶

چوں شمع چند گریم بےاختیار ہر شب
تا کے زنم بر آتش پروانه‌وار ہر شب
بے آں دُرِ یگانه از گریه ام چه پرسی
دارد محیطِ اعظم سر در کنار ہر شب

۵۷

نمی آید به چشم خواب امشب
به جانم از دلِ بےتاب امشب

۵۴

اب یہ رات ختم پر پہنچ گئی
باقی داستان کل کی رات پر
تیرے بغیر ہر روز سر پر لے آتی ہے
سو سیاہ بلائیں ہمارے لیے رات
نالہ تیغ اور آہ سناں چلاتی ہے
دوستو رات ہے یا جنگ کا دن
ہم کہ تیرے لطف کی عادت رکھتے ہیں
کب تک رات تنہا گزاریں
میر کا حجرہ بھی بری جگہ نہیں ہے
یہاں بھی کبھی رات بسر کی جا سکتی ہے

۵۵

یہ بے قراری کہاں تک اور یہ اضطراب کب تک
دنیا میں مجھے رسوا کر دیا خواہش کا خانہ خراب (ہو)
اپنا کام جوانی سے پہلے کر کہ اے غفلت کی خو رکھنے والے
جتنی دیر میں آنکھ جھپکتا ہے جوانی کے دن خواب ہیں
خدا کا شکر کہ مغاں کے کوڑے کھاتے دیکھا
مے خانہ کے دروازے پر شراب میں مست شیخِ شہر کو

۵۶

شمع کی طرح کب تک ہر رات بے اختیار روتا رہوں
کب تک پروانے کی طرح آگ میں گرتا رہوں
اس درِ یگانہ کے بغیر میرے رونے کو کیا پوچھتے ہو
محیطِ اعظم[1] ہر شب سر کنارے میں چھپا لیتا ہے

۵۷

آج رات آنکھوں میں نیند نہیں آتی
آج رات دلِ بے تاب (کی وجہ) سے جان پر بنی ہے

---

[1] وہ سمندر جو تمام زمین کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہے۔

۵۸

از دہانش کس چہ گوید آں دہاں معلوم نیست
حرف بسیار است امّا ہیچ از آں معلوم نیست
طور و طرزِ رفتنِ اہلِ جہانم داغ کرد
عالمے بگذشت از ایں راہ و نشاں معلوم نیست
زاں کمر از من مپرس اے ہم نشیں ہر دم کہ او
فتنہ برپا کردہ و خود درمیاں معلوم نیست
حیف باشد جبہ سائی گر نیفتد اتّفاق
کز ہجومِ سجدہ ہا آں آستاں معلوم نیست
طرحِ عیش افگن کہ ابرِ تر ہجوم آوردہ است
مانعے کم گشت یعنی آسماں معلوم نیست
می رود زیں خاک داں خلق و نمی آید بہ چشم
گرد بسیار است در رہ، کارواں معلوم نیست
تا چہ پیش آمد نہ دانم میرؔ را در راہِ عشق
روزگارے شد کہ حالِ آں جواں معلوم نیست

۵۹

دعویِ مہرِ تو شائستہ صاحب جگر است
عشق کفر است اگر صرفۂ جاں در نظر است
وقتِ فرصت خنک آں کس کہ نگہ می دارد
آہ ازیں عمر کہ چوں آبِ رواں در گذر است
صحبتِ شیخ و منِ رند چساں درگیرد
عشق راہِ دگر و عقل طریقِ دگر است
دیدی آخر کہ چہ ہشیار مرا کشت آں طفل
ایں گمانِ غلطے بود کہ او بے خبر است
دارد اسال بداں گونہ نضارت کہ مگر
سبزۂ جوئے گلستاں مژۂ چشمِ تر است

۵۸

اس کے دہن کی کوئی کیا کہے، وہ دہن معلوم نہیں ہے
بہت سی باتیں ہیں مگر اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے
دنیا کے لوگوں کے (گزر) جانے کے طور وطریق نے مجھے رنجیدہ کر دیا
ایک دنیا اس راہ سے چلی گئی اور پتہ نہیں چلا ہے
اس کمر کو اے ہم نشیں مجھ سے مت پوچھ کہ ہر وقت اس نے
فتنہ برپا کیا ہے اور خود درمیان میں نظر نہیں آتی ہے
افسوس ہوگا اگر پیشانی جھکانے کا موقع نہ مل سکے
کہ سجدوں کے ہجوم میں وہ آستاں نظر نہیں آ رہا ہے
عیش کا انتظام کر کہ ابرِ تر جمع ہو گیا ہے
ایک مانع کم ہو گیا ہے، یعنی آسماں نظر نہیں آ رہا ہے
اس خاک داں سے خلق چلی جا رہی ہے اور نظر نہیں آتی
راہ میں گرد بہت زیادہ ہے، کارواں نظر نہیں آتا ہے
میرؔ کو عشق کی راہ میں کیا پیش آیا نہیں جانتا
زمانہ ہو گیا کہ اس جوان کا حال معلوم نہیں ہوا ہے

۵۹

تیری محبت کا دعویٰ حوصلہ رکھنے والے کو زیب دیتا ہے
عشق کفر ہے اگر جان جانے کا خطرہ نظر میں ہے
اس کی مہلت کا وقت اچھا (ہے) جو نگاہ رکھتا ہے
اس عمر پر (جو) افسوس کہ آبِ رواں کی طرح گزر رہی ہے
شیخ اور مجھ رند کی صحبت کیسے موافق آئے
عشق کی راہ اور عقل کا راستہ دوسرا ہے
تو نے دیکھا کہ آخر مجھے کس ہشیاری سے اس طفل نے قتل کیا
یہ گماں غلط تھا کہ وہ بے خبر ہے
اس سال اس طرح آبیاری ہوئی کہ جیسے
جوئے گلستان کا سبزہ چشمِ تر کی مژہ ہو

نالۂ سینہ خراشے نہ شنیدم زیں باغ
مدّتے شد سرِ مرغانِ چمن زیرِ پر است
می کنم یادِ بناگوشِ تو و می گریم
دانۂ اشکِ منِ امشب بہ صفائے گہر است
میرؔ را من بہ سخن کاش نمی آوردم
دردِ دل کرد بہ حدّے کے مرا دردِ سر است

۶۰

بتِ بے مہرِ من ہمہ کین است
دشمنِ جان و رہزنِ دین است
جانِ تلخی کشیدہ می داند
کہ گلِ دلبراں چہ شیرین است
از خرامش بہارے می ریزد
رفتنِ یار بس کہ رنگین است
قامتت را بہ خلق بنمودم
کافتِ روزگارِ من این است
گاہ در مسجد است و گہ در دیر
میرؔ را تا چہ دین و آئین است

۶۱

طورہا شد مختلف، دورِ زمانِ دیگر است
آں زمیں برباد رفت، ایں آسمانِ دیگر است
مہر شد مفقود یا ایں جا محبت رسم نیست
یا مزاجِ ما دگر شد یا جہانِ دیگر است
کذب ہر کس را شعار و حرفِ ہر یک پیچ دار
ما نمی فہمم گویا ایں زبانِ دیگر است
پُر در ایں ایام بے لطفی مکن کز چند روز
میلِ طبعم جانبِ نامہربانِ دیگر است

میں نے اس باغ میں سینہ خراش نالہ نہیں سنا
مدت ہو گئی مرغانِ چمن کا سر زیرِ پر ہے
تیری بنا گوش[1] کو یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں
میرے اشک کا دانہ آج رات گوہر کی سی صفا رکھتا ہے
کاش میں میرؔ کو باتیں نہ کرنے دیتا
دردِ دل اس (حد) تک (بیان) کیا کہ مجھے دردِ سر ہو گیا ہے

۶۰

میرا بتِ بے مہر تمام کینہ ہے
جان کا دشمن، دین کا رہزن ہے
تلخی کشیدہ جان جانتی ہے
کہ دلبروں کی گِلہ کتنی شیریں ہے
اپنے خرام سے ایک بہار بکھیر دیتا ہے
یار کا چلنا بہت رنگین[2] ہے
تیری قامت کو لوگوں کو دکھاتا ہوں
کہ میرے لیے آفتِ روزگار یہ ہے
کبھی مسجد میں ہے اور کبھی بت خانے میں
میرؔ کا (بھی) کیا دین اور آئین ہے

۶۱

طور مختلف ہو گئے، دورِ زمان دوسرا ہے
وہ زمین برباد ہو گئی، یہ آسمان دوسرا ہے
مہر مفقود ہو گیا، یا اس جگہ محبت کی رسم نہیں ہے
یا میرا مزاج دوسرا ہو گیا، یا (یہ) جہان دوسرا ہے
جھوٹ ہر ایک کا شعار، ہر ایک حرف پیچدار
ہم نہیں سمجھتے گویا یہ زبان دوسری ہے
ان بے لطفی کے دنوں کو درد سے نہ بھر کہ چند روز سے
میرے دل کی رغبت ایک اور نامہربان کی طرف ہے

---

[1] کان کی لو۔
[2] خوب۔خوش۔

سرگذشتِ ما مصیبت دیدگانِ عشق را
قصهٔ مجنوں مداں، ایں داستانِ دیگر است

یک دور روزے کم نگاہی مصلحت دیدِ تو نیست
چشمِ من دنبالہ گردِ دل ستانِ دیگر است

از ورت امروز و فردا می روم ہشیار باش
سجدهٔ مستانہ بابِ آستانِ دیگر است

تہمت آلودِ وفائے دیگراں دارد مرا
من ہلاکم از غمش، او در گمانِ دیگر است

بر نمی افتد از آں سر کوچہ رسمِ جور میرؔ
من اگر از جاں شدم، یک نیم جانِ دیگر است

۶۲

آں ام کہ خوفِ جاں سببِ شادیِ من است
چشمانِ شیرِ شرزہ گل وادیِ من است

ہر آفتے کہ تازہ نمودار می شود
از اختراعِ قوّتِ ایجادیِ من است

من خود بہ حالِ مرگم و دشمن گماں برد
کایں حالت از سلیقهٔ استادیِ من است

از من نہ ماندہ غیرِ پرے چند در قفس
ویں دل اسیرِ خواہشِ آزادیِ من است

گر سر نہد بہ عالمِ امکاں قباحت است
سیلے کہ میرؔ خفتہ در آبادیِ من است

۶۳

زیں دلبرانِ سہل جہاں فتنہ در سر است
دلِ زیرِ مہرِ داغ در ایں وقت بہتر است

ہم عشق کے مصیبت جھیلے ہوؤں کی سرگزشت کو
قصۂ مجنوں مت سمجھ، یہ داستان دوسری ہے
دو ایک دن تجھے کم کم دیکھنا کسی مصلحت سے نہیں
میری آنکھ ایک دوسرے دل چھین لے جانے والے کا پیچھا کر رہی ہے
تیرے دروازے پر سے آج کل میں چلا جاتا ہوں، خیال رہے
سجدۂ مستانہ دوسری بارگاہ کے لائق ہے
مجھے دوسروں سے وفا کی تہمت سے آلودہ کرتا ہے
میں اس کے غم میں ہلاک ہوں اور وہ دوسرے گمان میں ہے
اس کوچے سے ظلم کی رسم میرؔ نہیں اٹھتی
میں اگر جان سے چلا جاؤں ایک نیم جان دوسرا، (موجود) ہے

۶۲

میں وہ ہوں کہ جان (جانے) کا خوف میرے لیے خوشی کا سبب ہے
بپھرے ہوئے شیر کی آنکھیں میری وادی کا پھول ہیں
ہر آفت کہ تازہ نمودار ہوتی ہے
میری قوّتِ ایجاد کی اختراع ہے
میں خود مرنے کے حال میں ہوں اور دشمن گمان رکھتا ہے
کہ یہ حالت میری استادی کے سلیقے کی وجہ سے ہے
مجھ میں چند پروں سے زیادہ قفس میں کچھ نہیں بچا
اور یہ دل میری آزادی کی خواہش میں اسیر ہے
اگر عالمِ امکاں کی طرف بڑھے تو خرابی ہوگی
ایک سیلاب جو میرؔ میری آبادی میں سو رہا ہے

۶۳

ان سہل دلبروں سے جہاں کے سر میں فتنہ ہے
دل کا اس وقت مہرِ داغ کے نیچے ہونا بہتر ہے

خواہد شدن جراحتِ سر تا بہ پا الم
زخمِ جگر کہ بُوزدۂ آں گلِ تر است
حرفے مگو بہ زاہدِ مغرور و خودستا
معقول را نمی شنود ایں خَرف خر است
می یابم از قدِ تو بہ ہر دم تمتعے
تنخواہِ من بہ عالمِ بالا مقرّر است
دارد بہ روئے زرد غبارِ ملالتے
امروز میرؔ خستہ جگر پُرمکدّر است

۶۴

عشق از روزے کہ ایں دیوانہ را بر کار بست
کوہکن از کوہ و مجنوں از بیاباں بار بست
سوئے مژگانم نگر در گریۂ سرشارِ صبح
خوشہ خوشہ می چکد خونِ جگر زیں داربست
شب ز پہلو دادنِ دل گریۂ بسیار کرد
طرفہ دریائے بہ جوئے خویش چشمِ زار بست
می رود از کوئے چوں فردوسِ او رو بر قفا
دل مگر خورشید با آں سایۂ دیوار بست
دست پُرخوں، تیغ پُرخوں، جامہ پُرخوں ہر دم است
خوش بہ خونِ ما وفاداراں کمر را یار بست
وائے بر حالِ کسے کو با ہزاراں درد و غم
بر جگر دنداں بیفشرد و لبِ اظہار بست
روزگارے شد کہ از دینِ قدیمِ خویشتن
میرؔ در عشقِ بتاں برگشتہ و زنار بست

سرتاپا تکلیف دہ گھاؤ بننا چاہتا ہے
زخمِ جگر، کہ اس گلِ تر (کی وجہ) سے بُوزدہ[1] ہے
مغرور اَور اپنی تعریف کرنے والے زاہد سے بات نہ کر
دلائل عقلی کو نہیں سنتا یہ بدحواس بوڑھا گدھا ہے
میں ہردم تیرے قد سے تمتع حاصل کرتا ہوں
میری تنخواہ عالمِ بالا سے مقرر ہے
(اس کے) زرد چہرے پر ملامت کا غبار ہے
آج خستہ جگر میرؔ (کی طبیعت) بہت مکدّر ہے

۶۴

جس دن سے کہ عشق نے اس دیوانہ کو مطیع کیا ہے
کوہ کن نے کوہ اور مجنوں نے بیاباں سے سامان باندھا ہے
میری پلکوں کی طرف دیکھو، صبح آنسوؤں سے رونے (کی وجہ) سے
خونِ جگر خوشہ خوشہ اس داربست[2] سے ٹپک رہا ہے
رات دل کے ساتھ دینے پر (اس نے) بہت آنسو بہائے
چشمِ زار نے (گویا) طرفہ سمندر اپنی نہر پر باندھا
اس کے فردوس جیسے کوچے سے پیچھے دیکھتے ہوئے جاتا ہے
شاید خورشید نے دل کو اس سایۂ دیوار سے لگایا ہے
ہاتھ پر خون، تیغ پر خون، کپڑوں پر خون ہر وقت ہے
یار نے ہم وفاداروں کے خون پر اچھی کمر باندھی ہے
اس کے حال پر افسوس (جس نے) کہ ہزاروں درد و غم کے باوجود
سخت اذّیت کو برداشت کیا ہے اور لبِ اظہار سی لیا ہے
مدّت ہوگئی کہ اپنے قدیم دین سے
میرؔ عشقِ بتاں میں پھر گیا اور (اس نے) زنار باندھی ہے

---

[1] زخمِ بوزدہ: ناسور۔
[2] ٹھاٹھر جس پر انگور کی بیل چڑھاتے ہیں۔

۶۵

به گلشن ایں که گل نازاں رسیده ست
نظر گاهِ گریبانش نه دیده ست
مترس امروز چنداں از قیامت
بیا مے خور که فردا را که دیده ست
چو گلبن پائے تا سر داغ گشتم
ز باغش ایں چنیں گل ہا که چیده ست
اگر خوں گشته در ہجراں عجب نیست
که دل تصدیع بسیارے کشیده ست
به آں غیرت به عشقِ گل رخاں میرؔ
چہا از مردمِ بے ته شنیده ست

۶۶

آوارہ گردِ عشق تو چشمِ پُرآب داشت
ہر جا که رفت گریه به رنگِ سحاب داشت
شب ہا به ما نشست و سرِ حرف وا نه شد
آں نازپیشه روئے سخن در نقاب داشت
من در نفس شماری و آں سروِ خوش خرام
مستغنیانه رفت که با خود حساب داشت
زاں پیشتر که نرگسِ مستِ تو وا شود
احوالِ غم کشانِ محبت خراب داشت
دیشب به یادِ زلفے که می سوختی دلا
دودِ جگر چو مارِ سیه پیچ و تاب داشت
بے پرده اش به جلوه تماشا نه کرده ایم
با ایں ظہورِ حسن قیامت حجاب داشت
کاغذ به پیشِ قاصدِ من سوختی مگر
پیغامِ سینه سوختگاں ایں جواب داشت

۶۵

باغ میں یہ کون سا گل نازاں پہنچا ہے
نظر نے کبھی اس کا گریباں نہیں دیکھا ہے
آج قیامت سے کچھ مت ڈر
آ شراب پی کہ کل کس نے دیکھا ہے
گلاب کے پودے کی طرح سر سے پاؤں تک (رشک سے) جل گیا ہوں
اس کے باغ سے اس طرح پھولوں کو کس نے توڑا ہے
اگر ہجر میں خون ہو گیا ہے عجب نہیں ہے
کہ دل نے نہایت تکلیف اٹھائی ہے
گل رخوں کے عشق میں میرؔ نے اس غیرت کے باوجود
بے اصل لوگوں سے کیا کیا کچھ سنا ہے

۶۶

تیرے عشق کا آوارہ گرد پُرآب چشم رکھتا تھا
جہاں بھی جاتا تھا سحاب کی طرح گریہ کرتا تھا
بہت سی راتوں کو میرے ساتھ بیٹھا اور گفتگو شروع نہ ہوئی
وہ ناز پیشہ روئے سخن نقاب کے اندر رکھتا تھا
میں نفس شماری میں تھا اور وہ خوش خرام سرو
بے پروا گزر گیا کہ اپنی دھن میں تھا
اس سے پہلے کہ تیری نرگسِ مست کھلے
(اُس نے) محبت کے غم کشوں کی حالت خراب کر دی
کل رات کس کی زلف کی یاد میں اے دل تو جل رہا تھا
دردِ جگر مارِ سیہ کی طرح پیچ و تاب کھا رہا تھا
ہم نے اسے بے پردہ جلوہ گری کرتے نہیں دیکھا
حسن کے اس ظہور کے باوجود قیامت حجاب رکھتا تھا
تو نے کاغذ میرے قاصد کے سامنے جلایا ہے، شاید
سینہ سوختگاں کا پیغام یہی جواب رکھتا تھا

معلوم شد کہ منزلِ ما نیست ایں چمن
بر ہر کسے کہ چشم فتاد، اضطراب داشت
آبِ رواں و رنگِ گل و بادِ صبح گاہ
ہر یک چو باز ماندہ مسافر شتاب داشت
آیا چہ شد کہ میرؔ گدائے شراب شد
دیروز ایں جوانِ عزیز احتساب داشت

۶۷

از تفِ سوزِ درونم جگرِ خامہ شق است
کاغذ از گرمیِ الفاظ کبابِ ورق است
گشتہ چوں روح و بہ کیفیتِ آں لب نہ رسید
بادۂ لعل از ایں شرم سراپا عرق است
سالہا بر سرِ کوئے تو چمن سازی کرد
چشم بگداختۂ من کہ ہوا را شفق است
دارم اصرار کزیں در نہ روم تا دمِ مرگ
دوستاں ہر چہ در ایں باب بگویند، حق است
کارم امشب بہ سحرگاہ کشد یا نہ کشد
بر دل از دوریِ دلدار قیامت قلق است
عشوہ و غمزہ و نازِ تو ہمہ غارت کرد
وائے بر شہرِ دلِ من کہ بسے بےنسق است
با فنِ عشق کسے را نہ بود ربط اِمروز
از منش میرؔ فراگیر کہ مشکل سبق است

۶۸

از دلِ من تا غمِ جانانہ رفت
رونقِ سر تا سرِ آں خانہ رفت

معلوم ہوا کہ ہماری منزل یہ چمن نہیں ہے
جس پر بھی نظر پڑی اضطراب میں تھا
آبِ رواں اور رنگِ گل اور بادِ صبح گاہ
ہر ایک پیچھے رہ جانے والے مسافر کی طرح جلدی میں تھا
ایسا کیا ہوا کہ میرؔ شراب کا گدا ہو گیا
کل اس عزیز جوان پر احتساب ہوا

۶۷

سوزِ دروں کی گرمی سے قلم کا جگر شق ہے
کاغذ الفاظ کی گرمی سے کبابِ ورق[1] ہے
روح کی طرح ہو گیا اور اس لب کی کیفیت کو نہیں پہنچا
بادۂ لعل اس شرم سے تمام عرق (عرق) ہے
سالہا تیرے کوچے میں چمن سازی کی ہے
میری پگھلی ہوئی آنکھوں نے جو فضا کے لیے شفق ہیں
مجھے اصرار ہے کہ اس در سے دمِ مرگ تک نہیں جاؤں گا
دوست اس باب میں جو کچھ کہتے ہیں، حق ہے
میرا کام اس رات صبح کے وقت تک پہنچے یا نہ پہنچے
دل پر دلدار کی دوری سے قیامت کا قلق ہے
تیرے عشوہ اور غمزہ اور ناز نے سب غارت کر دیا
میرے دل کے شہر پر افسوس کہ نہایت بے انتظام ہے
عشق کے فن سے کسی کو آج دل بستگی نہیں رہی
(اسے) اے میرؔ (تو) مجھ سے سیکھ کہ مشکل سبق ہے

۶۸

میرے دل سے جانانہ کا غم جب نکل گیا
اس گھر کی رونق بالکل ہی ختم ہو گئی

---

[1] بھنا ہوا کباب جس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔

آخر آخر بر دکانِ مےفروش
آبرویم بہرِ یک پیمانہ رفت
کشتۂ تیغِ ترا نازم، جگر
قیمہ شد، استادہ و از جا نہ رفت
من چہ دانم راہ و رسم خانقاہ
عمرِ من در خدمتِ مےخانہ رفت
بود در ہر گوشہ اش ہنگامہ اے
بعدِ مرگم رونقِ ویرانہ رفت
نے سرشکے، نے چراغے، نے گلے
از سرِ خاکم چہ بے رحمانہ رفت
نیست شورِ میرؔ در بازارہا
غالباً از شہر آں دیوانہ رفت

۶۹

مشنو سخنِ شیخ کہ از بےبصراں است
او منکرِ دیدارِ رخِ خوش پسراں است
صیاد چنیں دام گہِ دہر نہ دارد
آں کس کہ شکارِ تو نہ شد حیف بر آں است
ما لطفِ زبانی ہم از او گاہ نہ دیدیم
دیرےست کہ روے سخنش با دگراں است
دامن بہ میاں برزدہ چوں شمعِ سحر باش
کایں بزمِ دل افروزِ جہانِ گذراں است
آئینہ مگر دیدۂ میرؔ است کہ ہر صبح
بر صورتِ خوبِ تو بہ حسرت نگراں است

۷۰

شبنم کہ بہ ہنگامِ سحر چشمِ ترے داشت
شاید کہ بہ رخسارۂ آں گل نظرے داشت

آخرِ کار مے فروش کی دکان پر
ایک پیمانے کے لیے میری آبرو چلی گئی
میں تیری تیغ کے کشتہ پر ناز کرتا ہوں، (کہ) جگر
قیمہ ہو گیا، کھڑا رہا اور جگہ سے نہیں ہلا
میں خانقاہ کی رسم و راہ کیا جانوں
میری عمر مے خانے کی خدمت میں گزر گئی
اس کے ہر گوشے میں ایک ہنگامہ رہتا تھا
میرے مرنے کے بعد ویرانے کی رونق چلی گئی
نہ اشک، نہ چراغ، نہ گل
(وہ) میری قبر کے پاس سے کتنی بے مرّوتی سے گزرا
بازاروں میں میرؔ کا شور نہیں ہے
غالباً شہر سے وہ دیوانہ چلا گیا

۶۹

شیخ کی بات مت سنو کہ وہ بے بصروں میں سے ہے
وہ خوش پسروں کے دیدار کا منکر ہے
صیاد دنیا میں ایسی شکارگاہ نہیں ہے
جو تیرا شکار نہیں ہوا اس پر حیف ہے
ہم نے اس سے کبھی لطفِ زبانی بھی نہیں پایا
مدّت سے اس کا روئے سخن دوسروں کی طرف ہے
شمعِ سحر کی طرح رخصت کے لیے کمر بستہ ہو جا
کہ یہ جہانِ گزراں کی بزمِ دل افروز ہے
آئینہ شاید میرؔ کی آنکھ ہے کہ ہر صبح
تیری اچھی صورت کو حسرت سے دیکھتا ہے

۷۰

شبنم کہ صبح کے وقت چشمِ تر رکھتی تھی
شاید کہ اس گل کے رخسار پر نظر رکھتی تھی

این خستہ از آں خیلِ طیور است کہ ہر یک
شائستۂ پروازِ چمن بال و پرے داشت
مستانِ محبت ہمہ ہشیارسراں اند
ہر بے‌خبرِ عشقِ تو با خود خبرے داشت
از دل چہ حکایت کنم اکنوں کہ بہ جا نیست
زیں پیشتر ایں قطرۂ خوں ہم جگرے داشت
مردیم و مکاں ہم شدہ ویران و نہ گفتی
کایں راہ‌گزر تکیۂ دریوزہ گرے داشت
دل از پے او غرق بہ دریائے بلا بود
وآں گوہرِ تر سر بہ کنارِ دگرے داشت
چوں رنگِ حنا میرؔ یکایک ز میاں رفت
معلوم چو شد با کفِ پائے تو سرے داشت

۷۱

بہ یادِ ناوکِ مژگاں دلم ز جاں سیر است
شکارِ وحشی ام از مدّتے سرِ تیر است
نہ صبر فائدہ می بخشدم، نہ بے تابی
ہلاک می شوم اے ہم‌نشیں، چہ تدبیر است
چہ شد کہ شعلہ‌فشاں نیست لیک می سوزد
نہالِ قامتِ من ہم چو شمعِ تصویر است
کنوں کہ تیغ بہ کف می رسی سرت گردم
دگر بہ قتلِ منِ بے‌گنہ چہ تاخیر است
بہ عشقِ سلسلہ‌مویاں خرابِ شہر شدم
ہنوز بر سرِ ہر کوچہ شورِ زنجیر است
دماغِ بستنِ احرامِ کعبہ‌اش نہ بود
کسے کہ از غمِ کوئے بتاں خداگیر است

یہ زخمی، پرندوں کے اس جھنڈ سے ہے کہ ہر ایک
چمن کی پرواز کے قابل بال و پر رکھتا تھا
محبت میں مست (رہنے والے) تمام ہشیار ہیں
تیرے عشق کا ہر بے خبر اپنی ایک خبر رکھتا تھا
اب دل کی کیا بات کروں کہ بجا نہیں ہے
اس سے پہلے یہ قطرۂ خوں بھی جگر رکھتا تھا
ہم مر گئے اور مکاں بھی ویران ہو گیا مگر نہ کہا
کہ اس راہ گزر پر ایک فقیر کا تکیہ تھا
دل اس کے لیے دریائے بلا میں غرق تھا
اور وہ گوہرِ تر دوسرے کنارے کا ارادہ رکھتا تھا
رنگِ حنا کی طرح میرؔ یکا یک درمیاں سے اٹھ گیا
یوں لگا (جیسے) تیرے کفِ پا کی خواہش رکھتا تھا

۷۱

ناوکِ مژگاں کی یاد میں دل جان سے بیزار ہے
میرا وحشی شکار مدت سے تیر کے سامنے ہے
نہ صبر مجھے فائدہ بخشتا ہے، نہ بے تابی
اے ہم نشیں میں ہلاک ہو رہا ہوں، کیا علاج ہے
کیا ہوا کہ شعلہ فشاں نہیں ہے مگر جل رہا ہے
میری قامت کا نہال بھی شمعِ تصویر کی طرح ہے
اب کہ تیغ بکف پہنچ رہا ہے تیرے صدقے جاؤں
(اب) مجھ بے گناہ کے قتل میں (اور) کیا تاخیر ہے
(میں) زنجیر جیسی زلفوں والوں کے عشق میں خرابِ شہر ہوا
ابھی بھی ہر کوچے میں زنجیر کا شور ہے
اسے کعبے کا احرام باندھنے کا ہوش نہیں ہوتا
جسے خدا نے کوئے بتاں کے غم میں گرفتار کر دیا

مکن بہ ابروئے او چشم را سیہ زنہار
وگرنہ میرؔ میانِ من و تو شمشیر است

۷۲

مدّتے باید ستاد و زار می باید گریست
بر سرم اے ابرِ تر بسیار می باید گریست
حالِ زارِ خویشتن قاصد چساں انشا کنم
بر سرِ حرفے مرا صد بار می باید گریست
گریہ را در یادِ رویش ضبط نتواں کرد میرؔ
ہم چو ابرِ قبلہ ام ناچار می باید گریست

۷۳

اشک اخگر می فشاند، آہ برقِ حاصل است
من نمی دانم کہ از شوقش چہ آتش در دل است
آں کفِ نازک ببیں و ایں ہمہ ناحق کشی
بگذرد از حق اگر کس حق بہ دستِ قاتل است
کار چوں آئینہ بر من تنگ شد پایانِ کار
ہر کرا باشد حیائے چشم، او را مشکل است
گشتہ است از بس کہ حیرت کشتۂ اطوارِ یار
دیدۂ آئینہ پیشِ او چو چشمِ بسمل است
با لب و حرفِ کسے یاقوت و گوہر را مسنج
می زند بر سنگ لعل و گفتہ دُرِّ باطل است
در چمن مستِ سرانداز آں سراپا ناز بود
قامتش را دیدہ ہرکس گفت سروِ مائل است
راہبر چوں عجز سالک را نمی آید بہ دست
ہر کجا پایم بلغزد میرؔ آں جا منزل است

ہرگز اس کی ابرو کی طرف چشم کو سیاہ نہ کرنا[1]
وگرنہ میرؔ میرے اور تیرے درمیان شمشیر ہے

۷۲

مدّتوں کھڑا رہنا چاہیے اور بہت رونا چاہیے
میرے اوپر اے ابرِ تر بہت رونا چاہیے
اپنا حالِ زار قاصد کس طرح لکھوں
ہر حرف پر مجھے سو مرتبہ رونا پڑتا ہے
اس کے چہرے کی یاد میں میرؔ گریہ ضبط نہیں ہو سکتا
مجھے ابرِ قبلہ[2] کی طرح ناچار رونا پڑتا ہے

۷۳

اشک چنگاری برسا رہا ہے، آہ حاصل کے لیے برق ہے
میں نہیں جانتا کہ اس کے عشق کی وجہ سے دل میں کون سی آگ (لگی ہوئی) ہے
وہ نازک ہاتھ دیکھ اور یہ اتنے بے گناہوں کا قتل
انصاف (کی توقع) کو چھوڑ دے اگر کسی کا انصاف قاتل کے ہاتھ میں ہے
آخرِ کار آئینہ کی طرح مجھ پر کام مشکل ہو گیا
جس کی بھی آنکھ میں حیا ہے، اس کے لیے مشکل ہے
وہ یار کے اطوار سے ازبس کہ حیرت کا مارا ہوا ہے
دیدۂ آئینہ اس کے سامنے چشمِ بسمل کی طرح ہے
یاقوت اور گوہر کو کسی کے ہونٹ اور باتوں سے مت تول
(وہ) لعل کو پتھر پر مارتا ہے اور کہتا ہے، نقلی گوہر ہے
چمن میں وہ سراپا ناز نشے میں جھوم رہا تھا
اُس کی قامت کو دیکھ کر ہر ایک نے کہا، سروِ مائل[3] ہے
سالک کے عجز جیسا راہبر نہیں ملتا ہے
جہاں بھی میرا پیر لڑکھڑائے میرؔ اس جگہ منزل ہے

---

[1] ہوس نہ کرنا۔
[2] بادل جو قبلہ کی طرف سے اٹھے اور بہت بارش برسائے۔
[3] جھکا ہوا سرو۔

۷۴

نگاہ مستِ اور سرگرمِ کار است
رگِ خواب جہاں در دستِ یار است
جگرتاب است ضبط الّا شود صبح
از آں زلفِ سیہ بر سینہ مار است
توجہ کن کہ تا روزی بیابد
دلِ مسکیں غریبِ ایں دیار است
دمے صد بار سویت می کشد دل
ترحم گونہ اے بےاختیار است
بہ خوں تر دیدہ ام تا دیدہ ام من
خدنگش زخم پروردِ شکار است
ز وادی ایں کہ می خیزد غبارے
دلے در زیرِ خاکے بےقرار است
نہ دانم با کدام امیدواری
در ایں ایام دل امیدوار است
شدم با خاکِ کوئے او برابر
ہنوزش میرؔ در خاطر غبار است

۷۵

از سختیِ ایام چنیں تنگ نہ بودہ است
زیں پیش دلے بود مرا، سنگ نہ بودہ ست
از خشم برافروختہ تر ز آتش گرمے
با ما گلِ روئے تو بہ ایں رنگ نہ بودہ است
از سازِ رقیب است کہ با تنگ مزاجی
طرزِ تو شب و روز ہمیں جنگ نہ بودہ ست
شد تیرہ ز عکسِ خطِ اوصافِ خود است ایں
آئینۂ دل ورنہ تہِ زنگ نہ بودہ است

۷۴

اس کی نگاہِ مست سرگرمِ کار ہے
دنیا کی رگِ خواب یار کے ہاتھ میں ہے
ضبط سے جگر جل رہا ہے، جب تک کہ صبح نہ ہو جائے
اس زلفِ سیاہ کے خیال سے سینہ پر سانپ ہے
(ذرا) ڈھونڈھتا کہ ایک روز مل جائے
مسکیں دل اس دیار میں اجنبی ہے
ہر پل دل سو مرتبہ تیری طرف کھنچتا ہے
رحم کر، بہت زیادہ بے اختیار ہے
میں نے خون میں تر دیکھا، جہاں تک دیکھا
اس کا تیر شکار کا زخم پالتا ہے
وادی سے یہ کون غبار اٹھا رہا ہے
(ضرور) زیرِ خاک ایک دل بے قرار ہے
نہیں جانتا کہ کس سے امیدواری (ہے)
ان دنوں دل امیدوار ہے
اس کے کوچے کی خاک کے برابر ہو گیا ہوں
ابھی تک میرؔ اس کی خاطر میں غبار ہے

۷۵

ایام کی سختی سے اس قدر پریشان نہیں تھا
اس سے پہلے میرا دل تھا پتھر نہیں تھا
غصے میں آتشِ گرم سے (بھی) زیادہ بھڑکا ہوا
میرے واسطے تیرے چہرے کے پھول کا یہ رنگ نہیں ہوتا تھا
یہ رقیب کی سازش (کے باعث) ہے کہ تنگ مزاجی کے ساتھ
شب و روز یہی جنگ تیری عادت نہیں تھی
اپنے اوصاف کے نوشتے کے عکس سے تاریک ہو گیا، یہ
آئینہ دل، ورنہ زنگ آلود نہیں رہا کرتا تھا

عیبے شدہ در عہدِ کسے عشق وگرنہ
ایں رسمِ کہن میرؔ چنیں ننگ نہ بودہ ست

۷۶

عمرہا بیمارسانم رنگِ زردے بودہ است
دست بر دل ہر گہ و بے گہ ز دردے بودہ است
سر ز ہجرانِ کسے می داروم در آتشے
یادِ ایامے کہ بر لب آہِ سردے بودہ است
پشتۂ ریگے کہ بینی کاروانے بود میرؔ
گرد بادِ ایں بیاباں رہ نوردے بودہ است

۷۷

چوں غنچہ دل بہ پہلو پُرخون ز مہرِ یارے ست
رنگِ شکستۂ من از عشق یادگارے ست
شبنم بہ چشمِ عبرت اشک است حسرت آلود
ہم گل در ایں گلستاں، چشمِ امیدوارے ست
ما چوں حنا در ایں غم خوں می خوریم و لیکن
پا بوسِ آں جفاجو از دست رفتہ کارے ست
غافل مشو ز رفتن کایں طاقِ چرخِ نیلی
از گردِ راہِ یاراں برخاستہ غبارے ست
میرؔ ایں ہمہ نہ دارد تغیرِ حالِ عاشق
وقتے ست، اتفاقے ست، عہدے ست، روزگارے ست

۷۸

آتشِ عشق کہ اول رہِ درمانم سوخت
آخرالامر بہ یک لایحہ سامانم سوخت
قطرۂ اشک ز سوزِ جگرم اخگر بود
از مژدہ دوش بیفتاد و گریبانم سوخت

کسی کے عہد میں عشق ایک عیب بن گیا، وگرنہ
یہ رسمِ کہن میرؔ اتنی رسوائی کا باعث نہیں ہوتی تھی

۷۶

(میں) مدّتوں بیمار سا تھا رنگ زرد ہو گیا ہے
درد کی وجہ سے وقت اور ناوقت ہاتھ دل پر رہتا ہے
کس کے ہجر میں میں نے آگ میں سر ڈالا ہے
ان دنوں کی یاد (آتی ہے) کہ لب پر آہِ سرد رہتی تھی
(یہ) ریت کا ایک تودہ جو تو دیکھ رہا ہے میرؔ ایک کارواں تھا
اِس بیاباں کا گردباد (کبھی) ایک رہ نورد تھا

۷۷

غنچہ کی طرح سے دل پہلو میں یار کی محبت میں پُرخوں ہے
میرا رنگِ شکستہ عشق کی ایک یادگار ہے
شبنم چشمِ عبرت کے ساتھ حسرت آلود اشک ہے
گل بھی اس گلستاں میں چشمِ امیدوار ہے
ہم حنا کی طرح اس غم میں خوں پیتے ہیں ولیکن
اس جفاجو کے قدم چومنا ایک ہاتھ سے نکلا ہوا کام ہے
(دنیا سے) جانے سے غافل مت ہو کہ یہ چرخِ نیلی (فام) کی عالی شان عمارت
یاروں کی گردِ راہ سے اٹھا ہوا ایک غبار ہے
میرؔ عاشق کا حال اتنا تغیر نہیں رکھتا
وقت، اتفاق، عہد (اور) روزگار (کی بات) ہے

۷۸

عشق کی آگ نے کہ پہلے میرے درماں کی راہ جلا دی
آخرِ کار ایک منصوبے کے تحت میرا آرام لوٹ لیا
میرے سوزِ جگر سے آنسو کا قطرہ چنگاری (بن گیا) تھا
پلکوں سے کاندھے پر گر پڑا اور میرا گریبان جلا دیا

بے تو در شہر گہے داغم و گہ در صحرا
عاشقی سوخت مرا لیک پریشانم سوخت
در چمن رفتم و بسیار پشیماں گشتم
بلبلے نالہ کشید و بہ گلستانم سوخت
تا درِ بت کدہ ام بود سرے با اسلام
صنمے چہرہ بر افروختہ ایمانم سوخت
داغِ ضبطِ دلِ خویش‌ام بہ کہ گویم ایں درد
بایدم سوخت جدا از تو و نتوانم سوخت
میرؔ از سوزِ محبت چہ سخن آغازم
دل کباب است، جگر داغ شد و جانم سوخت

۷۹

ناشکیبا غمِ نہاں شدہ است
کہ نفس بر لبم فغاں شدہ است
دو سہ پر در چمن پریشاں اند
مرغِ روحے کہ پرفشاں شدہ است
در بہاراں دلِ بری دارم
رنگ گل برق آشیاں شدہ است
کس چہ داند غبارِ کیست کہ میرؔ
گردِ دنبالِ کارواں شدہ است

۸۰

چہ ظلم ہا کہ نہ بر من در آرزوئے تو رفت
دلے کہ رفتۂ اویم بہ جستجوئے تو رفت
نسیمِ صبح یکے برگ گل بہ خود می داشت
مگر از اہل چمن نامہ اے بہ سوئے تو رفت
بہ ہر گلے کہ رسیدم گریستم چوں ابر
بہ باغ رفتم و فرصت بہ یادِ روئے تو رفت

تیرے بغیر کبھی شہر میں داغ ہوں اور کبھی صحرا میں
عاشق نے مجھے جلایا مگر بکھرا کر جلایا
چمن میں گیا اور بہت پشیماں ہوا
بلبل نے نالہ کھینچا اور مجھے گلستان میں جلا دیا
بت خانے کے دروازے تک مجھے اسلام سے تعلق تھا
ایک روشن چہرہ بت نے میرا ایمان پھونک ڈالا
میں اپنے ضبطِ دل کا داغ ہوں، کس سے یہ درد کہوں
مجھے تیری جدائی میں جل جانا چاہیے تھا اور نہیں جل سکا
میرؔ سوزِ محبت کی بات کیا شروع کروں
دل کباب ہے، جگر داغ ہو چکا اور میری جان جل گئی (ہے)

۷۹

پوشیدہ غم بے قرار ہو چکا ہے
کہ سانس میرے ہونٹوں پر فغاں بن چکی ہے
دو تین پر چمن میں بکھرے ہیں
کس کی روح کا پرندہ اڑ چکا ہے
بہار میں آزاد دل رکھتا ہوں
رنگِ گل، آشیاں کے لیے برق بن چکا ہے
کوئی نہیں جانتا کہ کس کا غبار ہے جو کہ میرؔ
کارواں کے دنبال کی گرد بن چکا ہے

۸۰

مجھ پر تیری آرزو میں کیا ظلم نہ ٹوٹے
دل جس پر میں عاشق ہوں، تیری جستجو میں جاتا رہا
نسیم صبح ایک برگِ گل اپنے ساتھ لیے ہوئے تھی
ضرور اہل چمن کی طرف سے ایک خط تیری طرف گیا (ہے)
(میں) جس گل کے پاس (بھی) پہنچا ابر کی طرح رویا
باغ میں گیا اور سارا وقت تیرے چہرے کی یاد میں گزر گیا

ز چند روز دلے شب نمی کند فریاد
مگر کہ میرؔ بہ تنگ آمد و ز کوئے تو رفت

۸۱

از ما کہ خستہ ایم مپرسید سرگذشت
تیرے فگند عشقِ کسے کز جگر گذشت
آں غنچہ ام کہ آخرِ موسمِ رسیدہ ام
تا چشم وا کنم کہ بہار از نظر گذشت
تا شور بود یا کہ نمے ہم نہ یافتم
سیلابِ عمرِ من چہ قدر تیزتر گذشت
زیں آمدن چہ لطف کہ آں بادہ خوارِ ناز
از حالِ مے کشانِ وفا بےخبر گذشت
می گفتمش کہ دردِ تو درماں پذیر نیست
دیدی کہ میرؔ آخر از آں درد درگذشت

۸۲

ایں زماں بر دلِ من از تو جفائے دگر است
خوں شود بے تو و گوئی کہ برائے دگر است
لطف از او چشم نہ داری کہ ز شوخی او را
دل بہ جائے دگر و چشم بہ جائے دگر است
سطحِ آئینہ بہ رخسارِ تو کے می ماند
آں بہ آئینِ دگر، ایں بہ ادائے دگر است
گر چہ مژگانِ کسے طرفہ بلاےست ولے
جنبشِ ابروئے خم دار بلائے دگر است
شوخیِ او بنگر میرؔ کہ با ہمچو منے
صبح طورِ دگر و شام ادائے دگر است

کچھ دن سے آدھی رات کو فریاد نہیں کرتا
ضرور میرؔ تنگ آ گیا اور تیرے کوچے سے چلا گیا

۸۱

ہم سے کہ زخمی ہیں، (ہماری) سرگزشت مت پوچھیے
کسی کے عشق نے (ایسا) تیر مارا جو جگر کے پار ہو گیا
میں وہ غنچہ ہوں کے موسم کے آخر میں پہنچا ہوں
جب تک کہ آنکھ کھولوں بہار نظر سے جاتی رہی
(اس کا پانی) کھارا تھا یا میٹھا میں (یہ) بھی نہیں جان سکا
میری عمر کا سیلاب کس قدر تیز تر گزر گیا
اس آنے کا کیا لطف کہ وہ ناز کا بادہ خوار
وفا کے مے کشوں کے حال سے بے خبر گزر گیا
میں اس سے کہا تھا کہ تیرا درد قابلِ علاج نہیں ہے
(تو نے) دیکھا کہ میرؔ آخر اس درد سے مر گیا

۸۲

ان دنوں میرے دل پر تیری طرف سے اور ہی (طرح کی) جفا ہے
(یہ) تیرے بغیر خوں ہوتا ہے اور تو کہتا ہے کسی اور کے لیے (ہوا) ہے
اس کے لطف کی امید نہ رکھ کہ شوخی سے اس کا
دل کہیں اور، اور آنکھ کہیں اور ہے
آئینے کی سطح تیرے رخسار کی طرح کب ہوتی ہے
وہ دوسرے آئیں[۱] پر اور یہ دوسری ادا سے ہے
اگرچہ کسی کی مژگاں طرفہ بلا ہیں مگر
ابروئے خمدار کی جنبش اور ہی بلا ہے
اس کی شوخی دیکھو میرؔ کہ مجھ جیسے سے
صبح کو اور طور ہے اور شام کو دوسری ادا ہے

---

[۱] زیب، زینت، طرز، قانون۔

۸۳

بوسیدنِ دہان تو دل در خیال داشت
ایں سادہ لوح خواہشِ امرِ محال داشت
آزردہ نیستم ز بدگوئی کساں
گر او نمی شنید کسے کے مجال داشت
دل رہ بہ راہِ ہیچو خودے باختی مگر
دیروز چہرۂ تو غبارِ ملال داشت
اے آں کہ از دیارِ غریباں رسیدہ ای
بارے بگو کہ میرؔ در آں جا چہ حال داشت

۸۴

دین و دل غارت شدہ، جانم بہ یغما رفتہ است
حیف ہا از یک نگاہِ یار بر ما رفتہ است
در تماشائے خرامش ساکنانِ شہر را
ہوش از سر، تاب از دل، طاقت از پا رفتہ است
دور از آں سرمایۂ جاں ہیچ لطفِ زیست نیست
ہر کہ رفتہ ست از درش، گوئی ز دنیا رفتہ است
کس نشانِ چشمِ ما شاید بہ آں بے تہ نہ داد
ابرِ بہرِ آب آوردن بہ دریا رفتہ است
سالہا بر یادِ آں قامت بکائے کردہ ایم
تا بہ ایں انداز کارِ گریہ بالا رفتہ است
از محبت چشمِ آسائش نہ باید داشتن
آں بلاے است ایں کز و خوابِ زلیخا رفتہ است
ما و مجنوں مدّتے در شہر یک جا ماندہ ایم
چند روزے شد کہ آں وحشی بہ صحرا رفتہ است
در فراقش جائے او محسوس غیر از درد نیست
دل درونِ سینہ ام چوں عضو از جا رفتہ است

۸۳

دل تیرے دہن کو چومنے کا خیال رکھتا تھا
یہ سادہ لوح امر محال کی خواہش رکھتا تھا
ہم کسی کی بدگوئی سے رنجیدہ نہیں ہیں
اگر وہ نہیں سنتا کسی کو کب مجال تھی
تو نے دل کو کسی اپنے جیسے ہی کی راہ میں ہار دیا ہے
کل تیرے چہرے پر ملال کا غبار تھا
اے تو کہ دیارِ غریباں سے پہنچا ہے
کچھ کہہ کہ میرؔ وہاں کس حال میں ہے

۸۴

دین اور دل غارت ہو گئے میری جان لوٹ لی گئی
یار کی ایک نگاہ سے مجھ پر بہت سے ستم ٹوٹ گئے ہیں
تیرے خرام کو دیکھنے (کے بعد) سے شہر کے ساکنوں کے
سر سے ہوش، دل سے تاب، پیروں سے طاقت جا چکی ہے
اس سرمایۂ جاں سے دور زندگی کا کوئی لطف نہیں ہے
جو کہ اس در سے چلا گیا ہے گویا کہ دنیا سے چلا گیا ہے
کسی نے شاید ہماری چشم کا پتہ اس بے اصل کو نہیں دیا
ابر پانی لانے کے لیے دریا کو گیا ہے
ہم نے اس قامت کی یاد میں سالوں بکا کی ہے
تب اس انداز میں گریہ کے ہنر نے ترقی کی ہے
محبت سے آسائش کی امید نہیں رکھنی چاہیے
یہ وہ بلا ہے کہ اس سے خوابِ زلیخا اڑ گیا تھا
ہم اور مجنوں مدّتوں شہر میں ایک ساتھ رہتے تھے
کچھ دن ہوئے کہ وہ وحشی صحرا کو چلا گیا ہے
اس کے فراق میں اس کی جگہ درد کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا
میرے سینے میں دل عضوِ از جا رفتہ کی طرح ہے

ظاہر است از نا امیدی ہاے میرِ خرقہ پوش
کہ ایں فقیر امروز اگر ایں جاست، فردا رفتہ است

۸۵

کم کم مژہ برہم زدنش تازہ جفاے ست
وز دیدہ نگہ کردنِ او طرفہ بلاے ست
آرائشِ تن می کنم از غفلت اگر نہ
ہر لوحِ مزار آئینۂ جامہ نماے ست
مذکورِ خرابیِ دلِ من نہ تواں کرد
ہر خشت از ایں منزلِ امید بہ جاے ست
کو لائقِ خوں ریزیِ تیغِ تو نہ بودم
ہر کس کہ مرا دید چنیں گفت، سزاے ست
شائستہ لطفِ تو اگر نیست نہ باشد
آزارِ دلِ میرؔ براۓ چہ، گداے ست

۸۶

عرصۂ گیتی اگر وحشت کنم بسیار نیست
دامنِ صحرا بہ ایں وسعت گریباں وار نیست
وعدۂ دورِ قیامت ہم پۓ تکمیلِ ماست
ذوق تا حاصل نہ گردد لذّتِ دیدار نیست
ایں جفاۓ تازہ تر بنگر کہ از جورش مرا
صد شکایت در دل است و رخصتِ گفتار نیست
چوں بروں آرد سر از جیبِ خجالت روزِ حشر
ہر کرا بر سینہ از وے زخمِ دامن دار نیست
تا کجا شد میرِ خاک افتادہ از کوۓ تو آہ
خشتِ بالین است و او در سایۂ دیوار نیست

خرقہ پوش میرؔ کی ناامیدی سے ظاہر ہے
کہ یہ فقیر اگر آج یہاں ہے، کل جا چکا ہو گا

۸۵

اس کا کم کم پلک جھپکانا ایک تازہ جفا ہے
اس کا کن انکھیوں سے دیکھنا طرفہ بلا ہے
بے خبری کی وجہ سے جسم کو سجاتا ہے ورنہ
ہر لوحِ مزار ایک جامہ نما آئینہ[1] ہے
میرے دل کی ویرانی کا ذکر نہیں کر سکتے
اس منزلِ امید کی ہر اینٹ اپنی جگہ پر (قائم) ہے
گو میں تیری تیغ کی خوں ریزی کے لائق نہیں تھا
جس نے بھی مجھے دیکھا یہی کہا کہ مستحق ہے
اگر تیرے لطف کے قابل نہیں ہے، نہ ہو
میرؔ کے دل کو ستانا کس لیے، (وہ) ایک گدا ہے

۸۶

دنیا کا میدان اگر (میں) وحشت کروں (تو) زیادہ نہیں
صحرا کا دامن اتنی وسعت کے ہوتے (بھی) گریباں کی طرح نہیں
قیامت کے آنے کا وعدہ بھی ہماری تکمیل کے لیے ہے
جب تک ذوق حاصل نہ ہو، دیدار میں لذّت نہیں ہے
یہ تازہ تر جفا دیکھ کہ اس کے ظلم سے میرے
دل میں سینکڑوں شکایتیں اور کہنے کی اجازت نہیں ہے
کس طرح شرمندگی کے گریبان سے روزِ حشر سر باہر نکالے گا
جس کے بھی سینے پر اس (کے ہاتھ) کا زخم دامن دار[2] نہیں ہے
آہ خاک افتادہ میرؔ تیرے کوچے سے کہاں چلا گیا
خشتِ بالیں (پڑی) ہے اور وہ دیوار کے سائے میں نہیں ہے

---

[1] بڑا آئینہ جس میں پورا بدن دکھائی دے سکے۔
[2] سوجا ہوا زخم۔

۸۷

وقتِ آں کس خوش کہ گلزارِ جہاں را دید و رفت
ہم چو گل بر بے‌ثباتی ہاے خود خندید و رفت

یادِ ایّامے کہ راہم در حریمِ وصل بود
ایں زماں می بایدم در کوئے او نالید و رفت

داغِ جانِ آں غیورم من کہ با صد آرزو
جائے گل چیدن از ایں گلزار دامن چید و رفت

ایں سلوکِ طالعِ برگشتۂ من سیر کن
کز قریبِ منزلم آں ماہ برگردید و رفت

اے کہ راہے می بری در بزمِ او از ما بگو
بے کسے، آزردہ جانے، آستاں بوسید و رفت

ایں ادائے او فراموشم نہ خواہد گشت میرؔ
چوں سرِ زلفش گرفتم، دستِ من پیچید و رفت

۸۸

بہ وعدہ‌ات نہ دہم دل کہ اعتبارِ تو نیست
وفاست رسمِ قدیمے کہ در دیارِ تو نیست

کدام دل کہ در ایّامِ تو نہ دارد داغ
کدام دیدہ کہ پُرخوں بہ روزگارِ تو نیست

ز آہ و نالۂ زارت دلا نمی رنجم
کہ بے‌قراری و ایں ہا بہ اختیارِ تو نیست

مگر خدنگِ تو غربال کرد صحرا را
شکار نیست کہ مجروحِ بے‌شمارِ تو نیست

ہزار سرو بہ جنبش در ایں چمن دیدم
یکے بہ دل کشی آہِ بے‌قرارِ تو نیست

بیا کہ رفتنِ جاں ہم قریب می بینم
ز فرطِ شوق مرا تابِ انتظارِ تو نیست

۸۷

اس کا وقت اچھا (گزرا) کہ گلزارِ جہاں کو دیکھا اور چلا گیا
گل کی طرح اپنی بے ثباتی پر تبسم کیا اور چلا گیا
ان دنوں کی یاد کہ میری راہ بھی حریمِ وصل میں تھی
ان دنوں مجھے اس کے کوچے میں رونا پڑتا ہے اور (وہاں سے) چلا جانا پڑتا ہے
میں اس غیرت مند کا داغِ جان ہوں کہ سو آرزوؤں کے باوجود
(اس نے) گل توڑنے کے بجائے اس گلزار سے دامن اٹھایا اور چلا گیا
میری پھری ہوئی قسمت کا یہ سلوک دیکھ
کہ میری منزل کے قریب سے وہ محبوب پھر گیا اور چلا گیا
اے (تو) کہ اس کی بزم میں راہ رکھتا ہے میری طرف سے کہہ
ایک بے کس، آزردہ جاں نے آستاں کو بوسہ دیا اور چلا گیا
اس کی یہ ادا میرؔ مجھ سے فراموش نہیں ہوگی
جب میں نے اس کی زلف کو چھوا، (اس نے) میرا ہاتھ مروڑا اور چلا گیا

۸۸

تیرے وعدہ پر دل نہیں دیتا کہ تیرا اعتبار نہیں ہے
وفا ایک پرانی رسم ہے کہ تیرے دیار میں نہیں ہے
کون سا دل ہے کہ جس پر تیرے دور میں داغ نہیں
کون سی آنکھ ہے کہ تیرے زمانے میں پرخوں نہیں ہے
تیری آہ و نالہ سے اے دل میں رنجیدہ نہیں ہوتا
کہ تو بے قرار ہے اور یہ سب تیرے اختیار میں نہیں ہے
مگر تیرے تیر نے صحرا کو چھلنی کر دیا
کوئی شکار (ایسا) نہیں ہے جو تیرا بہت زیادہ زخمی (کیا ہوا) نہیں
اس چمن میں ہزار سرو کو جنبش کرتے دیکھا
ایک بھی دلکشی میں تیرے بے قرار کی آہ کو نہیں پہنچتا ہے
آ کہ جان کے جانے کو بھی قریب دیکھ رہا ہوں
فرطِ شوق سے مجھے تیرے انتظار کی تاب نہیں ہے

برو کہ بہرِ محبت بلاکشے باید
تو نازپروری اے میرؔ عشق کارِ تو نیست

۸۹

غرض آلودگی مختارِ ما نیست
برائے خویش بودن خوش نما نیست
چہ گویم آہ کز فرطِ تپیدن
چو عضوِ رفتہ از جا دل بہ جا نیست
بہ رویت تا نگاہِ گرم کردہ ست
میانِ ما و آئینہ صفا نیست
ز بس صرفِ جنونِ من شد اکنوں
بہ گلشن چوبِ گل بہرِ دوا نیست
مسلّم ایں کہ دارد عیب ہا میرؔ
بحمد اللہ کہ چوں تو بےوفا نیست

۹۰

شیخنا ایں ہمہ سامانِ تو بے چیزے نیست
دست گاہے شدہ ای، شانِ تو بے چیزے نیست
شاید اے مرغِ چمن تو گلِ ما را دیدی
متصل نالہ و افغانِ تو بے چیزے نیست
تا بہ گوشت چہ سخن گفت نسیم اے گلِ تر
ہر سحرگہ لبِ خندانِ تو بے چیزے نیست
غالباً از سرِ نو کشتہ گذشتی امروز
رنگِ خوں بر زہِ دامانِ تو بے چیزے نیست
میرؔ از طورِ تو پیداست کہ سودا داری
ایں ہمہ حرفِ پریشانِ تو بے چیزے نیست

چلا جا کہ محبت کے لیے مصیبت جھیلنے والا چاہیے ہے
تو ناز پرور ہے اے میرؔ عشق تیرا کام نہیں ہے

۸۹

غرض کے ساتھ دنیاوی تعلقات ہمیں پسند نہیں ہیں
(صرف) اپنے لیے زندہ رہنا زیب نہیں دیتا ہے
کیا کہیں آہ کہ تڑپنے کی زیادتی سے
اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے عضو کی طرح دل ٹھکانے پر نہیں ہے
تیرے چہرے پر جب سے (اس نے) نگاہ تیز کی ہے
ہمارے اور آئینے کے بیچ صفا[1] نہیں ہے
ہمارے جنوں میں اتنی زیادہ صرف ہوئی (کہ) اب
گلشن میں چوبِ گل[2] دوا کے لیے (بھی) نہیں ہے
یہ تسلیم ہے میرؔ بہت سے عیب رکھتا ہے
خدا کا شکر ہے کہ تیری طرح بے وفا نہیں ہے

۹۰

اے شیخ تیرا سارا ساز و سامان کسی کے بغیر نہیں ہے
تجھے دولت مل چکی ہے تیری شان کسی وجہ کے بغیر نہیں ہے
شاید اے مرغِ چمن تو نے ہمارے گل کو دیکھا ہے
تیرا مسلسل نالہ و فغاں کسی وجہ کے بغیر نہیں ہے
تیرے کان میں نسیم نے کیا بات کہی ہے اے گل تر
ہر سحر کے وقت تیرے ہونٹوں پر ہنسی کسی وجہ کے بغیر نہیں ہے
غالباً آج پھر کسی کو قتل کر کے آیا ہے
تیرے دامن کے کنارے پر خون کا رنگ کسی سبب کے بغیر نہیں ہے
میرؔ تیرے طور سے ظاہر ہے کہ تو جنوں رکھتا ہے
تیری یہ ساری پریشاں باتیں کسی وجہ کے بغیر نہیں ہیں

---

[1] صفائی۔ پاکیزگی۔ دوستی۔
[2] گلاب کی شاخ جس سے پاگل کو مارتے ہیں تو اس کا جنون کم ہو جاتا ہے۔

۹۱

جاں بہ لب آمدہ در ہجر و تمنائے ہست
دل نہ ماندہ ست بہ جا لیک در او جائے ہست
قامتِ او ز کجا آں قدِ بالا ز کجا
سروِ خوش قطع در ایں باغچہ رعنائے ہست
عمر را بہرِ چہ دل تنگ بسر باید کرد
شہر اگر خوش نہ بود گوشۂ صحرائے ہست
پیش از ایں در ستم ایں گونہ دلیریش نہ بود
مدّعی را مگر از سوئے تو ایمائے ہست
چشم بر کحلِ جواہر نہ دود ہیچ گہش
ہر کرا مدِّ نظر خاکِ تہِ پائے ہست
تا کجا حالِ دلِ زار بہ ہر کس گویم
غرض از پہلوئے ایں غم زدہ ایذائے ہست
آگہہ از آمدنِ میرؔ در ایں شہر مَیَم
ایں قدر ہست کہ در کوئے تو غوغائے ہست

۹۲

حالیا زندگیِ من ننگے ست
چہ بگویم چہ حالتِ تنگے ست
سختیِ غم بلائے جاں گردید
دل ز فرطِ گرفتگی سنگے ست
از غمِ رو نہ دادنِ خوباں
دل چو آئینہ ام تہِ زنگے ست
نیست بےلطف گریۂ فریاد
آب بالائے سنگ ہم رنگے ست
از غم و غصہ اش چہ می پُرسی
ہر زماں میرؔ را بہ خود جنگے ست

۹۱

ہجر میں جان لب پر آ گئی اور ایک تمنّا (باقی) ہے
دل جگہ پر باقی نہیں ہے لیکن اس میں ایک جگہ (خالی) ہے
اس کی قامت کہاں اور وہ قدِ بالا کہاں
(اگرچہ) خوش قطع سرو (بھی) اس باغیچہ میں خوش نما ہے
کس لیے عمر کو ناخوش بسر کیا جائے
شہر اگر اچھا نہیں ہے، گوشۂ صحرا (موجود) ہے
اس سے پہلے ستم میں اس کو اتنی زیادہ دلیری نہیں تھی
دشمن کو مگر تیری طرف سے شہ ملی ہے
اس کی آنکھ موتی پڑے ہوئے سرمہ پر کبھی نہیں پڑی
جس کو بھی (تیرے) قدموں کے نیچے کی خاک مدِ نظر ہے
کب تک حالِ دل زار ہر ایک سے کہوں
مختصر یہ کہ اس غم زدہ کے پہلو میں تکلیف ہے
میرؔ کے اس شہر میں آنے سے آگاہ نہیں ہوں
اتنا ہے کہ تیرے کوچے میں غوغا ہے

۹۲

ان دنوں میری زندگی ذلّت و رسوائی ہے
کیا کہیں حال پریشان ہے
غم کی سختی بلائے جاں ہو گئی
دل رکاوٹوں کی افراط سے پتھر (ہو گیا) ہے
خوباں کے چہرہ نہ دکھانے سے
دل بھی میرے آئینے کی طرح تہِ زنگ ہے
گریہ و فریاد لطف سے خالی نہیں ہیں
پتھر کے اوپر پانی بھی ایک رونق (رکھتا) ہے
اس کے غم و غصّے کی کیا پوچھتا ہے
ہر وقت میرؔ کو خود سے جنگ رہتی ہے

۹۳

بے حجابانہ یارِ من برخاست
پردہ از روئے کارِ من برخاست
کس بہ کس نیست آشنا گوئی
رسمِ مہر از دیارِ من برخاست
یک زماں او نشست و از ہر سو
فتنہ در روزگارِ من برخاست
مُردم و پاسِ رازِ عشق نہ رفت
بعدِ عمرے غبارِ من برخاست
خواریم نیست میرؔ امروزہ
مدت است اعتبارِ من برخاست

۹۴

ایں کہ گردِ شہر در ہر جا مزارے ماندہ است
مشتِ خاکے از عزیزاں یادگارے ماندہ است
بے تو می مانم بداں مےخوارہ کش پایانِ کار
نشہ از سر رفتہ و رنجِ خمارے ماندہ است
در خزاں می گفت بلبل با ہزاراں غم کہ آہ
گل ز گلشن رفت و در دل زخمِ خارے ماندہ است
گردِ راہش سرکشید و در بیاں محو شد
یادگارِ او بہ چشمِ من غبارے ماندہ است
اے بہ قربانت روم، بسیار رنگیں می روی
از خرامِ تو بہ ہر گامے بہارے ماندہ است
رفت آں ہنگامہ پردازیٔ افغانِ دلم
ایں زماں از ہستیِ من نالہ دارے ماندہ است
لطفِ حسنِ او نہ ماند و پیچشِ زلفش بہ جا ست
ایں بداں ماند کہ گنجے رفت و مارے ماندہ است

۹۳

میرا یار بے حجابانہ چلا گیا
میری تمنّا کے چہرے سے پردہ اٹھ گیا
کوئی کسی کا آشنا نہیں ہے، گویا
محبت کی رسم میرے دیار سے اٹھ گئی
ایک ساعت وہ بیٹھا اور ہر طرف سے
میرے زندگی میں فتنہ اٹھ کھڑا ہوا
مر گیا اور عشق کے راز کا پاس نہ گیا
ایک مدّت کے بعد میرا غبار اٹھا
میرؔ میری ذلّت آج کی نہیں ہے
ایک مدت ہو گئی ہے (کہ) میرا اعتبار اٹھ گیا ہے

۹۴

یہ کہ شہر کے گرد ہر جگہ مزار باقی رہ گئے ہیں
عزیزوں سے مشتِ خاک یادگار باقی رہ گئی ہے
تیرے بغیر آخر کار میں اس مے خوار کی طرح ہو جاتا ہوں (جس کا)
نشہ سر سے اتر گیا ہو اور خمار کی کوفت باقی رہ گئی ہو
خزاں میں بلبل نے ہزار غم کے ساتھ کہا کہ آہ
گل گلشن سے چلا گیا اور دل میں خار کا زخم باقی رہ گیا ہے
اس کی راہ کی گرد بلند ہوئی اور بیاباں میں غائب ہو گئی
میری آنکھ میں اس کی نشانی ایک غبار باقی رہ گیا ہے
اے تجھ پر قرباں ہو جاؤں بہت رنگیں[1] چلتا ہے
تیرے خرام سے ہر قدم پر بہار باقی رہ گئی ہے
میرے دل کی فغاں کا وہ ہنگامہ اٹھانا ختم ہو گیا
ان دنوں میرے وجود میں (صرف) ایک فریادی باقی رہ گیا ہے
اس کے حسن کا لطف نہیں رہا اور اس کی زلف کا بل باقی ہے
یہ اس طرح ہے کہ خزانہ لٹ گیا اور سانپ باقی ہے

---

[1] خوب۔ خوش۔

در حسابِ خاک ہم نوشت چرخِ دوں مرا
کارِ من موقوف بر روزِ شمارے ماندہ است
ابتدائے عشق را دیدم بہ چندیں رنگ میرؔ
آخر آخر گریۂ بےاختیارے ماندہ است

۹۵

من خود اسیر گشتم و ہر دم ملالت است
اے اشتیاقِ سیرِ گلستاں چہ حالت است
افراطِ شوق بیں کہ زمانے ہزار بار
دل سوئے او روانہ بہ رسمِ رسالت است
یک رہ ترا بہ باغ گل از دور دیدہ بود
از روئے دل کشِ تو ہنوزش خجالت است
خسرو ببیں کہ در سرِ خاراشگاف رفت
خوش یاد عہدِ عشق کہ یکسر عدالت است
عمداً کمر بہ مُردنِ خود میرؔ بستہ ای
در طبعِ نازکِ تو قیامت جہالت است

۹۶

کبریایم ہمہ از ہمّتِ درویشاں است
شاہ اندازیِ من از نظرِ ایشاں است
صحبتِ ما و نکوروپسراں آہ مپرس
تختۂ قیمہ جگر زیں ستم اندیشاں است
گاہ گاہی نگہِ لطف بہ حالش می کن
عاقبت میرؔ بلاکش ز وفاکیشاں است

۹۷

از داغ گل بہ سینۂ من دستہ دستہ است
و ز اشکِ لالہ گوں مژہ ام غنچہ بستہ است

آسمان نے مجھے خاک کے حساب میں بھی نہیں لکھا
میرا کام روزِ شمار پر موقوف رہ گیا ہے
عشق کی ابتدا کو میرؔ میں نے ایسے رنگ میں دیکھا تھا
آخر آخر گریۂ بے اختیار باقی رہ گیا ہے

۹۵

میں خود اسیر ہو گیا اور ہر دم تجھے ملال ہے
اے سیرِ گلستاں کے اشتیاق، (یہ) کیا حالت ہے
شوق کی افراط دیکھ کہ ہر وقت ہزار بار
دل اس کی طرف پیغام پہنچانے کی غرض سے روانہ ہے
ایک بار تجھے باغ میں گل نے دور سے دیکھا تھا
تیرے دلکش چہرے سے ابھی تک اس کو شرمساری ہے
خسرو کو دیکھ کہ پتھر توڑنے والے کی فکر میں گیا
عہدِ عشق خوش رہے کہ یکسر انصاف ہے
جان بوجھ کر میرؔ کے خوں پر کمر باندھی ہے
تیری طبعِ نازک میں قیامت کی نادانی ہے

۹۶

ہماری تمام بڑائی درویشوں کی دعا (کی وجہ) سے ہے
ہمارا فخر ان کی نظر کی وجہ سے ہے
ہماری اور اچھے چہرے والے لڑکوں کی صحبت آہ مت پوچھ
جگر قیمہ کا تختہ ان ظالموں کی وجہ سے (بن گیا) ہے
کبھی کبھی اس کے حال پر نگاہِ لطف کر
آخر بلاکش میرؔ وفا شعاروں میں سے ہے

۹۷

میرے دل زخم سے دستہ دستہ گل (بن گئے) ہیں
اور لالہ گوں اشک سے میری مژہ خوں بستہ ہے

تنہا نیامدہ ست بہ شور از تو عندلیب
گل ہم بہ روزگارِ تو در خوں نشستہ است
یک چند میرؔ را بہ زباں داشتن خوش است
بے چارہ از جفائے تو پُر دل شکستہ است

۹۸

بے تو طوفانِ چشمِ تر ایں جاست
کشتیِ چرخ در خطر ایں جاست
دیدہ سوزاں تر است از اشکم
کاسہ از آش گرم تر ایں جاست
لالہ و گل بہ باغ خواہد بود
لختِ دل، پارۂ جگر ایں جاست
بے رُخت از فغان و نالۂ میرؔ
طرفہ ہنگامہ ہر سحر ایں جاست

۹۹

خوشا کسے کہ چو برق از جہاں بجست و برفت
بہ یک تپیدن از ایں دام گہ برست و برفت
بہ پُرسہ گاہِ جہاں رسمِ دیر ماندن نیست
کسے کہ آمدہ ایں جا، دمے نشست و برفت
سراغِ دل چو نمودم بہ سینہ شد معلوم
کہ آں غریب از ایں خانہ بار بست و برفت
ہجوم بود بہ یوسف کہ ماہِ من آمد
نمود چہرہ و بازار او شکست و برفت
نصیبِ میرؔ نہ شد چوں سجودِ حضرتِ او
جبیں ز غصہ بہ ناخن تمام خست و برفت

تیری وجہ سے عندلیب تنہا ہی نالوں پر نہیں مجبور ہے
گل بھی تیرے دور میں خوں میں ڈوبا ہوا ہے
اک ذرا میرؔ سے (محبت کا) اقرار کرنا اچھا رہے گا
بے چارہ تیری جفا سے بہت دل شکستہ ہے

۹۸

تیرے بغیر چشمِ تر کا طوفان یہاں ہے
چرخ کی کشتی خطرے میں اس جگہ ہے
آنکھ میرے آنسوؤں سے زیادہ جلتی ہوئی ہے
یہاں پیالہ شوربے سے زیادہ گرم ہے
لالہ اور گل باغ میں ہوں گے
لختِ دل، پارۂ جگر یہاں ہے
تجھے نہ دیکھنے کی وجہ سے میرؔ کے نالہ اور فغاں (کرنے) سے
ہر سحر طرفہ ہنگامہ یہاں (بپا) ہے

۹۹

کیا کہنے اس کے جس نے دنیا سے برق کی طرح جست کی اور چلا گیا
ایک تڑپ سے اس دام گاہ سے چھوٹا اور چلا گیا
دنیا کی پرسہ گاہ میں دیر تک رکنے کی رسم نہیں ہے
جو (بھی) یہاں آیا کچھ دیر بیٹھا اور چلا گیا
جب (میں نے) سینے میں دل کا سراغ لگایا، معلوم ہوا
کہ اس غریب نے اس گھر سے سامان باندھا تھا اور چلا گیا ہے
یوسف کے گرد ہجوم تھا کہ میرا محبوب آیا
چہرہ دکھایا اور اس کے بازار کو اجاڑا اور چلا گیا
جب میرؔ کو اس کے قرب کا سجدہ نصیب نہیں ہوا
غصے میں تمام پیشانی ناخن سے نوچی اور چلا گیا

۱۰۰

بوالہوس را بہ بزمِ ما جا نیست
عاشقی ہاست ایں تماشا نیست
آہ از ایں خودنمائی پنہاں
ہمہ جائی و ہیچ پیدا نیست
شیخ پُرغافلی ز مغبچگاں
چشم پوشیدی و مصلّٰی نیست
سخت مغرورِ حسنِ خویشتنی
ہیچت از مرگِ خلق پروا نیست
ما رضامند تا بہ مرگِ خودیم
کوتہی در محبت از ما نیست
گریہ در شہر دیدہ دیدہ کنیم
آخر آبادی است، صحرا نیست
حرف ہا دارد از خط و خالش
میرؔ را از کجا کہ سودا نیست

۱۰۱

نزاکت لبِ یار را درخور است
کہ صد پردہ از درد نازک تر است
چہ شد گر قدِ چوں کماں شیخ راست
کہ ایں پیر کے سخت تیرآور است
سرشکم بہ رنگ دگر می چکد
جگر غالباً صرفِ چشم تَر است
بجز مرگ اے میرؔ آرام نیست
کہ دور از کسے زیست دردِ سر است

۱۰۰

ہماری بزم میں بوالہوس کی جگہ نہیں ہے
عاشقی ہے یہ تماشا نہیں ہے
اس پوشیدہ خودنمائی سے
تو ہر جگہ ہے اور نظر نہیں آتا ہے
شیخ (تو) مغ بچوں سے بہت غافل ہے
نگاہ چوکی اور مصلّی نہیں ہے
اپنے حسن پر سخت مغرور ہے
تجھے لوگوں کے جان سے جانے کی ذرا بھی پروا نہیں ہے
ہم اپنی موت تک پر بھی رضامند ہیں
ہم سے محبت میں کوئی کوتاہی نہیں (ہوئی) ہے
(ہم) شہر میں گریہ دیکھ دیکھ کرتے ہیں
آخر آبادی ہے صحرا نہیں ہے
اس کے خط و خال کی ہزار باتیں کرتا ہے
میرؔ کو جنوں کیسے نہیں ہے

۱۰۱

نزاکت لبِ یار کے لائق ہے
کہ درد وہ سے صد پردہ[۱] زیادہ نازک ہیں
کیا ہوا اگر شیخ کا قد کمان کی طرح ہے
کہ یہ بوڑھا (تو) سخت مکّار ہے
میرے آنسو دوسرے (ہی) رنگ سے ٹپک رہے ہیں
غالباً جگر چشمِ تر میں صرف ہو گیا ہے
موت کے سوا اے میرؔ آرام نہیں ہے
کہ کسی سے دور (ہو کر) زندگی دردِ سر ہے

---

۱ حجابِ نفس۔

۱۰۲

میرؔ دنیا رہ گذارے بیش نیست
آسماں گرد و غبارے بیش نیست
پاسِ جاں کن، تن نہ دارد اعتبار
قالبِ خاکی مزارے بیش نیست
بستۂ وہم است نقشِ زندگی
ورنہ ہستی اعتبارے بیش نیست
در برِ واعظ چہ زانو می زنی
پوچ گوے، ہرزہ کارے بیش نیست
غرقۂ وہم خودی از بے تہی
ورنہ ایں دریا کنارے بیش نیست

۱۰۳

ریش و مندیل و پیرہن زور است
شانہ کاریِ شیخ مشہور است
بحث با منکرانِ رویت نیست
ہر کرا چشم نیست، معذور است
کے بہ احوال کس بپردازد
آں ہمہ ناز سخت مغرور است
تا برابر بہ خاکِ رہ نہ شوی
راہِ نزدیکِ دوستی دور است
مدّتے شد کہ داد جان و ہنوز
ہر طرف حالِ میرؔ مذکور است

۱۰۴

آتش افشاں نالۂ من از رخِ رخشانِ اوست
دودِ آہم پیچ دار از کاکلِ پیچانِ اوست

۱۰۲

میرؔ دنیا رہ گزار سے زیادہ نہیں ہے
آسماں گرد اور غبار سے زیادہ نہیں ہے
جان کا پاس کر، تن اعتبار نہیں رکھتا
خاکی قالب مزار سے زیادہ نہیں ہے
زندگی کا نقش وہم کا باندھا ہوا ہے
ورنہ ہستی اعتبار سے زیادہ نہیں ہے
واعظ کے سامنے کیوں زانو ٹیکتا ہے
(وہ) ایک پوچ گو، بے ہودہ کام کرنے والے سے بڑھ کر نہیں ہے
کم ظرفی سے خودی کے وہم میں غرق ہے
ورنہ یہ سمندر کنارے سے زیادہ نہیں ہے

۱۰۳

داڑھی اور پگڑی اور لبادہ زوردار ہے
شیخ کی ریاکاری مشہور ہے
تیرے چہرے کے منکروں سے بحث نہیں ہے
جس کے پاس بھی آنکھ نہیں ہے، معذور ہے
کسی کے احوال پر کب متوجہ ہوتا ہے
وہ ہمہ ناز سخت مغرور ہے
جب تک خاکِ راہ کے برابر نہ ہو جا
دوستی کی نزدیک راہ، دور ہے
مدت ہوئی کہ جان دی تھی مگر اب تک
ہر طرف میرؔ کا حال بیان ہوتا ہے

۱۰۴

اس کے روشن چہرے کی وجہ سے میرا نالہ آگ برسا رہا ہے
میری آہ کا دھواں اس کی بل کھائی ہوئی زلف کی وجہ سے پیچدار ہے

قیس را با چشم کم زنہار در صحرا مبیں
شہرہا برہم زنے چوں نالہ در فرمانِ اوست
ایں کہ می اُفتد بہ وقتِ نزع ہر سو چشمِ میرؔ
خواہشِ دیدارِ معشوقے مگر با جانِ اوست

۱۰۵

آں جفاکیش چوں کماں برداشت
طائرِ سدرہ دل ز جاں برداشت
سستیِ عہدِ گل چو ثابت شد
بلبل از باغ آشیاں برداشت
نالۂ دل خراشِ میرؔ آخر
خواب از چشم دوستاں برداشت

۱۰۶

نالہ است و غم است و چشم تر است
کشورِ عاشقی چہ خوش سحر است
در خرابات صرف کن اوقات
کہ بہ ہر گوشہ عالم دگر است
نرگس آں چشم را ہمی خوانند
می نہ دانند کاندر ایں نظر است
دل بچسپاں بہ صندلی رنگے
زندگی بےعلاقہ دردِ سر است
گریہ بےصرفہ میرؔ نتواں کرد
عاقبت اشک پارۂ جگر است

۱۰۷

وصفِ حسنِ تو از محالات است
نظم و نثر ایں ہمہ خیالات است

قیس کو کبھی صحرا میں چشم کم سے مت دیکھو
شہروں کو برہم کر دینے والا نالہ اس کا زیرِ فرمان ہے
یہ کیا کہ وقتِ نزع میرؔ کی آنکھ ہر طرف پڑ رہی ہے
معشوق کے دیدار کی خواہش ضرور اس کی جان کے ساتھ ہے

۱۰۵

اس جفا پیشہ نے جب کمان اٹھائی
طائر سدرہ نے دل کو جان سے اٹھا لیا
عہدِ گل کی بے ثباتی جب ثابت ہوئی
بلبل نے باغ سے آشیاں اٹھا لیا
میرؔ کے دل خراش نالے نے آخر
دوستوں کی آنکھ سے خواب اڑا دیا

۱۰۶

نالہ ہے غم ہے اور چشم تر ہے
عاشقی کی مملکت کتنی خوش سحر ہے
وقت کو شراب خانے میں صرف کر
کہ (اس کے) ہر گوشے میں ایک دوسرا (ہی) عالم ہے
اس چشم کو سب نرگس کہتے ہیں
نہیں جانتے کہ اس میں (ان کا) محلِ نظر ہے
دل کا صندلی رنگ (کے محبوب) کے ساتھ میل بنا
زندگی (کسی سے) تعلّق کے بغیر دردِ سر ہے
میرؔ بے وجہ گریہ نہیں کرنا چاہیے
آخر اشک جگر کا ٹکڑا ہے

۱۰۷

تیرے حسن کی تعریف کرنا محالات میں سے ہے
نظم و نثر یہ سب تخیلات ہیں

کارِ واعظ فقط نہ ترخانی است
ایں لچر مجمعِ کمالات است
بے تو باغ و بہار و گل ہیچ است
کے بہ ایں ہا مرا مبالات است
زرد رخسار و گریہ ناک و نزار
میرؔ را در فراق حالات است

۱۰۸

نے فقط کوہکن از عشق بہ تنگ آمدہ است
پائے بسیار وفاپیشہ بہ سنگ آمدہ است
بہ جہاں آمدنِ تست گذشتن ز جہاں
ہر کہ پیدا شدہ در کامِ نہنگ آمدہ است
بارے یک گونہ از ایں دیدۂ خونابہ فشاں
بر رُخِ زردِ منِ غم زدہ رنگ آمدہ است
می تراود ہمہ کیں از روشِ رفتارش
غالباً یارِ من امروز بہ جنگ آمدہ است
جاں دہم لیک ز دستش نہ دہم تا مقدور
کہ مرا دامنِ او دیر بہ چنگ آمدہ است
آں چہ از مردمِ چشمِ تو دلم دیدہ و رفت
کے چنیں جور ز کفارِ فرنگ آمدہ است
لولیِ چند مگر زائرِ خاکِ میرؔ اند
کہ بہ گوشم ہمہ شب شور شلنگ آمدہ است

۱۰۹

تا بہ دامن پا کشیدم اہلِ دردے بر نہ خاست
خوں دلے، مژگاں ترے، رخسار زردے بر نہ خاست

واعظ کا کام صرف مسخرہ پن نہیں ہے
یہ لچر جامع کمالات ہے
تیرے بغیر باغ اور بہار اور گل کچھ نہیں ہیں
مجھے کب ان سب کی پروا ہے
زرد رخسار اور گریہ ناک اور نزار
میرؔ کو فراق میں حالات ہیں

۱۰۸

صرف کوہکن ہی نہیں عشق سے تنگ آیا ہوا ہے
بہت سے وفا پیشہ (عاشقوں) کے پیر پتھر کے نیچے آئے ہوئے ہیں
تیرا دنیا میں آنا دنیا سے گزرنا ہے
جو بھی پیدا ہوا ہے کامِ نہنگ[1] میں آیا ہوا ہے
بارے اس خوں کے آنسو بہانے والی آنکھوں سے ایک گونہ
میرے زرد چہرے پر رنگ آ گیا ہے
اس کی رفتار کی روش سے تمام کینہ ٹپکتا ہے
غالباً آج میرا یار جنگ پر آمادہ ہے
جان دے دوں مگر اپنے ہاتھ سے تا مقدور جانے نہ دوں
کہ اس کا دامن (بہت) دیر کے بعد میرے ہاتھ آیا ہے
جو کچھ تیری آنکھ کی پتلی کی وجہ سے میرے دل نے دیکھا اور (مجھ پر) گزری
کس پر ایسا ظلم کفارِ فرنگ سے ڈھایا گیا ہے
چند قلندر مگر میرؔ کی قبر کی زیارت کرتے ہیں
کہ میرے کان میں ساری رات اچھل کود کا شور آتا ہے

۱۰۹

یہاں تک کہ میں نے (مایوس ہو کر) جستجو ترک کر دی (کہ) کوئی اہلِ درد نہیں اٹھا
کوئی دل خوں، مژگاں تر، رخسار زرد نہیں پیدا ہوا

---

[1] مگرمچھ کا جبڑا (مجازاً موت)۔

نے مراقب گشتے نے آستیں افشاندنے
مدّتے شد زیں رباطِ کہنہ مردے بر نہ خاست
آگہہ از ویرانیِ کاشانۂ دل کس نہ شد
آہ اُفتاد ایں چنیں قصرے و گردے بر نہ خاست
ہر زماں در آتش و آبم ولے گاہے ز دل
نالۂ گرمے نیامد، آہِ سردے بر نہ خاست
میرؔ تا از پا نشستم رونقِ وادی نہ ماند
باز چو من خوش جنوں صحرانوردے بر نہ خاست

۱۱۰

از دل مگو کہ تیرِ بلا را نشانہ است
وز سینہ ام مپرس کہ زنبورخانہ است
دل می کشد بہ نالۂ مرغِ چمن بسے
ایں مشتِ بال و پر چہ قدر خوش ترانہ است
چندیں ہزار چوں تو تلف کرد روزگار
غافل ز طورِ ایں نہ شوی، ایں زمانہ است
آہِ مرا ببیں و ببر پے بہ سوزِ دل
در سینہ آتشے ست کہ اینش زبانہ است
تا کے کسے ز دینِ کہن قصہ بشنود
اقوالِ شیخ گوش مکن، ہرزہ چانہ است
پیداست کز برائے چہ ایں جا نشستہ ای
اظہارِ ضعف میرؔ بہ کوئش بہانہ است

۱۱۱

طرزِ تنہاگردیِ مجنوں بہ دل چسپیدنی ست
ایں نمدموئے بیابانِ محبت دیدنی ست

نہ امید رکھنے والا، نہ دست بردار ہو جانے والا
مدت ہو گئی اس پرانی سرائے سے کوئی مرد نہیں اٹھا
دل کے کاشانے کی ویرانی سے کوئی آگاہ نہیں ہوا
افسوس کہ اس طرح کا قصر گر گیا اور کوئی غبار نہیں اٹھا
ہر وقت آتش اور آب میں ہوں مگر کبھی دل سے
نالۂ گرم نہیں نکلا، آہِ سرد نہیں نکلی
میرؔ جب سے میں تھک کر بیٹھ گیا وادی کی رونق باقی نہیں رہی
دوبارہ مجھ سا خوش جنوں صحرا نورد نہیں اٹھا

۱۱۰

دل کی مت کہہ کہ تیرِ بلا کا نشانہ ہے
اور میرے سینے کی مت پوچھ کہ زنبور خانہ[1] ہے
دل اکثر مرغِ چمن کے نالے کی طرف کھنچ جاتا ہے
یہ مشتِ بال و پر کیا اچھا گانے والا ہے
تیری طرح کے ہزاروں روزگار نے تلف کر دیے
اس کے طور سے غافل مت رہ، یہ زمانہ ہے
میری آہ کو دیکھ اور سوزِ دل کو سمجھ لے
سینے میں آگ ہے جس کا یہ شعلہ ہے
کب تک کوئی پرانے دین کا قصہ سنتا رہے
شیخ کے اقوال کو مت سن، فضول گو ہے
ظاہر ہے کہ (تو) کس لیے اس جگہ بیٹھا ہے
(تیرا) ضعف کا اظہار میرؔ اس کے کوچے (میں ٹھہرنے کا) بہانہ ہے

۱۱۱

مجنوں کے تنہا بھٹکنے کا انداز دل میں کھب جانے والا ہے
بیابان کا یہ نمدمو[2] دیکھنے کے لائق ہے

---

[1] بھڑوں کا چھتا جو سوراخوں سے بھرا ہوتا ہے۔
[2] جھبرے بالوں والا۔

هست ثابت سستیٔ بنیادِ قصرِ آسماں
یعنی ایں طاقِ مقرنس میرؔ درگردیدنی ست

۱۱۲

دل برائے تو جستجوئے داشت
جملہ خوں بود و آرزوئے داشت
طرزِ گفتارِ میرؔ را دیدم
بےدماغانہ گفتگوئے داشت

۱۱۳

از آہ و نالہ شب ہمہ شب تازہ آفتےست
ہر روز بر سرِ دلِ من طرفہ صحبتےست
شورِ جنونم اے کہ در اول شنیدہ ای
اکنوں ببیں سکوتِ مرا کایں نہایتےست

۱۱۴

ظلمے بر اہلِ مدرسہ زاں یک نگاہ رفت
صوفی ز پا درآمد و ملّا ز راہ رفت
یوسف نہ یک ز عشق بہ سر فتنہ اش دوید
خلقے بہ ریسمانِ محبت بہ چاہ رفت

۱۱۵

دور از او جانِ مرا عہدِ سفر نزدیک است
و ز تپش پارہ شدن ہائے جگر نزدیک است
با خبر از روشِ اہلِ چمن باید بود
رفتنِ رنگِ گل و بادِ سحر نزدیک است

۱۱۶

نالہ ام از کوہسار و اشکم از ہاموں گذشت
حیف بر فرہاد رفت و ظلم بر مجنوں گذشت

قصرِ آسمان کی بنیاد کی کمزوری ثابت ہے
یعنی یہ بنائے عالی کا محل میرؔ ویران ہونے والا ہے

۱۱۲

دل تیرے لیے جستجو کرتا تھا
تمام خوں ہو چکا تھا اور آرزو رکھتا تھا
میرؔ کی باتوں کے انداز کو دیکھا
بے دماغانہ گفتگو کرتا تھا

۱۱۳

آہ و نالہ سے شب ہمہ شب تازہ آفت ہے
ہر روز میرے دل میں طرفہ صحبت ہے
اے کہ (تو نے) شروع میں میرے جنوں کے شور کو سنا ہے
اب میرے سکوت کو دیکھ کہ یہ انجام ہے

۱۱۴

اس ایک نگاہ سے اہلِ مدرسہ پر ظلم ہو گیا
صوفی لڑکھڑا گیا اور ملّا راہ سے بھٹک گیا
فقط یوسف ہی کے سر پر فتنہ برپا نہیں ہوا
(بلکہ) ایک دنیا محبّت کی وجہ سے مصیبت میں پڑی (ہے)

۱۱۵

اس سے دور ہو کر میری جان کو عہدِ سفر نزدیک ہے
اور تپش سے جگر کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا نزدیک ہے
اہلِ چمن کی روش سے باخبر رہنا چاہیے
رنگِ گل اور بادِ سحر کا جانا نزدیک ہے

۱۱۶

میرا نالہ کوہسار سے اور میرا اشک بیاباں سے گزرا
فرہاد پر ستم ہوا اور مجنوں پر ظلم ہوا

هر کہ شد غرقِ ہوس با ما شہیدانش مسنج
کز سرش بگذشت آب و از سرِ ما خوں گذشت

۱۱۷

چشم در آئینہ‌اش ہر دم بہ گیسوئے خود است
آں پری رو غالباً زنجیریِ موئے خود است
کاش یک رہ بگذرد از طرفِ گلشن بے‌نقاب
لالہ و گل را غرورِ خوبیِ روئے خود است

۱۱۸

تنم ز فرطِ غم و درد زرد و لاغر گشت
ز یمنِ عشق کفِ خاکِ من ہمہ زر گشت
شدی چو پیر کتب را بہ طاقِ نسیاں نہہ
حصول نیست ز تحصیل چوں ورق برگشت

۱۱۹

دوستاں یادِ سرِ زلفش بلائے دل شدہ ست
شانہ خالی می کنم چندے کہ پُر مشکل شدہ ست
ہیچ در ضبطم نہ شد از کوششِ بسیار میرؔ
آخر از اشکِ دمادم راہِ کویش گِل شدہ ست

۱۲۰

وقتِ رحیل آہ بہ خوابِ گراں گذشت
تا چشم وا کنم ز نظر کارواں گذشت
رفتم قرارِ مرگ بہ خود دادہ از درت
یعنی کہ بے تو از سرِ جاں می تواں گذشت

۱۲۱

در نقشِ پائے یار چہ دستے کشادہ است
نقاش اگر سرے نہ کشد سخت سادہ است

جو کہ ہوس میں غرق ہوا اس کا ہم (جیسے) اس کے شہیدوں کے ساتھ موازنہ نہ کر
کہ اس کے سر سے پانی گزرا اور ہمارے سر سے خون گزرا

۱۱۷

اس کی آنکھ اپنے آئینے میں ہر وقت اپنی زلفوں پر ہے
وہ پری رو غالباً اپنے بالوں کا زنجیری ہے
کاش (وہ) ایک بار گلشن کی طرف بے نقاب گزرے
لالہ اور گل کو اپنے چہرے کے حُسن پر غرور ہے

۱۱۸

میرا بدن غم اور درد کی افراط سے لاغر ہو گیا
عشق کی سعادت سے میری کفِ خاک تمام سونا ہو گئی
جب بوڑھا ہو گیا کتابوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ دے
علم حاصل کرنے کا فائدہ نہیں جب ورق الٹ گیا

۱۱۹

دوستو! اس کی زلف کی یاد دل کے لیے بلا ہو گئی ہے
کچھ دنوں کے لیے (اس سے) سبک دوش ہوتا ہوں کہ (اب) بے حد مشکل ہو گئی ہے
خود کو ضبط کرنے کی بہت زیادہ کوشش سے میرؔ مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا
آخر دم بدم رونے کی وجہ سے اس کے کوچے کا راستہ کیچڑ (سے بھر گیا) ہے

۱۲۰

افسوس کہ چلنے کا وقت خوابِ گراں میں گزر گیا
جب تک میں آنکھ کھولتا کارواں نظر سے دور ہو گیا
میں تیرے دروازے پر سے اپنی موت کا عہد کر کے چلا گیا
یعنی کہ تیرے بغیر جان سے گزر جانا چاہیے

۱۲۱

یار کے پیروں کے نقش (بنانے) میں کیا مہارت رکھتا ہے
نقاش اگر سر اونچا نہ کرے، سخت بے ہنر ہے

۱۲۲

تصویرِ گردنِ تو بلا حیرت اقتضاست
گردن کشی مصوّر اگر می کند بجاست

۱۲۳

نقّاش نقشِ زلفِ گره گیر ساختہ ست
دیوانہ میرؔ بود کہ زنجیر ساختہ ست

۱۲۴

نقّاش نہ آساں رخِ دلدار کشیدہ ست
یک ماہ بسر کردہ کہ رخسار کشیدہ ست

۱۲۵

سخت بے باک و بلا عشق گزینے بودہ ست
دل کہ خوں گشتہ عجب آفتِ دینے بودہ ست
تکیۂ اوست بہ دروازۂ مے خانہ ہنوز
میرؔ درویشِ خرابات نشینے بودہ ست

۱۲۶

در چمن از روئے خوبِ او ستم بر گل گذشت
و ز سرِ زلفش قیامت بر سرِ سنبل گذشت
سال ہا شد کز قفس آزردہ جانے بر نہ خاست
نالۂ وقتِ سحر قہر است تا بلبل گذشت

۱۲۷

می گفت میرؔ گریہ کناں چوں ز ہم گذشت
کہ ایں پنج روزہ عمر بہ صد درد و غم گذشت
خواہید دید حالتِ کاغذ بہ چشمِ خویش
گر سرگذشتِ من بہ زبانِ قلم گذشت

۱۲۲

تیری گردن کی تصویر نہایت حیرت کا تقاضا کرتی ہے
مصوّر اگر گردن کشی کرتا ہے، بجا ہے

۱۲۳

نقاش نے بل کھائی ہوئی زلفوں کا نقش بنایا ہے
دیوانہ تھا میرؔ کہ زنجیر بنائی ہے

۱۲۴

نقاش نے رخِ دلدار آسانی سے نہیں کھینچا ہے
ایک ماہ بسر کیا ہے تب رخسار (کا نقش) کھینچا ہے

۱۲۵

عشق اختیار کرنے والا بہت بے باک اور بلاکش ہوتا ہے
دل (جو) کہ خون ہو چکا ہے عجب آفتِ دیں رہا ہے
اس کا تکیہ شراب خانے کے دروازے پر ابھی تک ہے
میرؔ شراب خانے میں پڑے رہنے والا درویش ہے

۱۲۶

چمن میں اس کے خوبصورت چہرے سے گل پر ستم ٹوٹ پڑا
اور اس کی زلف سے سنبل کے سر پر قیامت گزر گئی
برسوں ہو گئے کہ قفس سے کوئی آزردہ جان نہیں نکلا
سحر کے وقت کا نالہ قہر ہے جب سے کہ بلبل مر گیا

۱۲۷

مرتے وقت میرؔ رو کر کہہ رہا تھا
کہ یہ پنج روزہ عمر سینکڑوں درد اور غم میں گزر گئی
چاہیے تھا کہ اپنی آنکھ سے کاغذ کی حالت دیکھیں
اگر میری سرگزشت قلم کی زبان (کی حد) سے گزر گئی

۱۲۸

مقصد از طوفِ حرم کے حاصل است
کعبہ از راہش نخستیں منزل است
خوش تر است ار جاں بہ آسانی رود
بے تو اکنوں زندگانی مشکل است
شور در سر چرخ را از مدّتےست
آسماں پیر است لیکن جاہل است

۱۲۹

ادراکِ خوبیِ تو ز ابصار مشکل است
پرداختن دل از غمِ دیدار مشکل است
ما را کہ چوں غبارِ ضعیفیم جزوِ خاک
برخاستن ز کوئے تو بسیار مشکل است
خو کردنم بہ ہجرِ تو بے مصلحت نہ بود
برداشتن دل از تو بہ یک بار مشکل است
ہر لحظہ ام ز جا دلِ بےتاب می رود
گاہے شکیب اگر نہ کند کار مشکل است

۱۳۰

ستم ز سادہ دلی ہاے من بہ جانِ من است
وفا ز ہم چو تو بے مہر در گمانِ من است
رسیدہ ام ز رہِ دور و تاجرِ عشقم
متاعِ درد و الم بارِ کاروانِ من است
شود زیادہ اگر وحشتم بہ دشت برید
غزالِ وادیٔ مجنوں مزاج دانِ من است

۱۳۱

مئے کہ بے تو دہد دست، ناچشیدہ بہ است
دماغ رفتۂ مہجور نارسیدہ بہ است

۱۲۸

طوفِ حرم سے مقصد کسے حاصل (ہوا) ہے
کعبہ اس کی راہ میں پہلی منزل ہے
اچھا ہے اگر جان آسانی سے چلی جائے
تیرے بغیر اب زندگی مشکل ہے
مدّت سے آسمان کے سر میں جنون ہے
آسماں پیر ہے لیکن نادان ہے

۱۲۹

نظروں سے تیری خوبصورتی کا ادراک کرنا مشکل ہے
دل کو غمِ دیدار سے جلا دینا مشکل ہے
ہمیں (جو) کہ ناتواں غبار کی طرح خاک کا جزو ہیں
تیرے کوچے سے اٹھانا بہت مشکل ہے
میرا تیریٔ ہجر کی عادت ڈالنا مصلحت کے بغیر نہیں تھا
تجھ سے اچانک دل اٹھا لینا مشکل ہے
ہر لحظہ میرا بے تاب دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے
اگر صبر کسی وقت کام نہ آئے تو مشکل ہے

۱۳۰

میری سادہ دلی سے میری جان پر ستم ہے
تیرے جیسے بے مہر سے وفا (کی امید) میرے گمان میں ہے
درد کے راستے سے پہنچا ہوں اور عشق کا تاجر ہوں
درد اور الم کی متاع میرے کاروان میں ہے -
اگر میری وحشت بڑھ جائے (مجھے) دشت میں لے جائیں
وادیٔ مجنوں کا ہرن میرے حال اور میری طبیعت سے آشنا ہے

۱۳۱

تیرے بغیر جو شراب میسر آتی ہے، (اس کا) نہ چکھنا بہتر ہے
ہجر کے مارے کے سر میں نشہ نہ چڑھنا بہتر ہے

مباد چشم چرانی کند کسے بہ خطت
بہ گردِ روئے تو ایں سبزہ نادمیدہ بہ است
رہِ حدیث مدہ ورنہ رنجہ خواہی شد
فسانۂ منِ غم دیدہ ناشنیدہ بہ است

۱۳۲

میرؔ آں کہ چشمِ شوق بہ ابروئے یار داشت
ہر دم جگر فگار بہ شمشیر کار داشت
گر قدرِ گردِ راہِ تو نشناخت بد مبر
معذور بود شیخ کہ چشمش غبار داشت
ہر ذرّہ خاکِ بادیہ سر می زند بہ سنگ
مجنوں چو من مگر دلک بے قرار داشت

۱۳۳

دیر در خوں ریزیِ من اے سپاہی پیشہ چیست
بازخواہِ خوں نہ دارم ایں ہمہ اندیشہ چیست

۱۳۴

شب چشمکِ ستارہ حریفاں، اشارہ اے ست
یعنی در ایں رواق عجب ماہ پارہ اے ست

۱۳۵

ایں گلِ ابر کہ گریاں بہ کفِ خاکِ من است
تربیت یافتۂ دیدۂ نم ناک من است

۱۳۶

بعدِ مرگم از قفس چون من اسیرے بر نہ خاست
دل بہ درد آور فغاں از ہم صفیرے بر نہ خاست

کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تیرے خط پر آنکھیں سینکے
تیرے چہرے کے گرد اس سبزے کا نہ اگنا بہتر ہے
بات کرنے کا موقع مت دے ورنہ تجھے افسوس ہوگا
مجھ غم زدہ کا فسانہ ناشنیدہ بہتر ہے

۱۳۲

میرؔ وہ جس کی ابروئے یار پر چشم شوق تھی
اس زخمی جگر کو ہر دم شمشیر ہی سے سابقہ رہا
اگر تیری راہ کی گرد کی قدر نہیں پہچانی، برا مت مان
شیخ معذور تھا کہ اس کی آنکھوں میں غبار تھا
بیاباں کی خاک کا ہر ذرہ پتھر سے سر مار رہا ہے
مجنوں (بھی) ضرور میری طرح بے قرار دل رکھتا تھا

۱۳۳

اے سپاہی پیشہ میرا خون بہانے میں کیا دیر ہے
میں اپنا خوں بہا طلب کرنے والا نہیں رکھتا، اتنی تشویش کیوں

۱۳۴

دوستو! رات کو ستاروں کی چشمک ایک اشارہ ہے
یعنی اس ایوان میں ایک عجب ماہ پارہ ہے

۱۳۵

یہ بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا (جو) کہ میری کفِ خاک پر رو رہا ہے
میری آنسو بھری آنکھوں کا تربیت یافتہ ہے

۱۳۶

میرے مرنے کے بعد قفس سے مجھ جیسا اسیر نہیں نکلا
کسی ہمصفیر[۱] (کے گلے) سے دل میں درد پیدا کر دینے والی فغاں نہیں نکلی

---

[۱] وہ پرند جو ایک ہی قسم کی بولی بولتے ہیں۔

۱۳۷

بر هر غزلِ من اجتماع است
در مجلسِ صوفیاں سماع است
ناچار بہ مرگ دل نہادم
اے جانِ غمیں برو، وداع است
خوباں ہرگز نمی خرندش
با آں کہ وفا عجب متاع است
دامن مفشاں ز خاکساراں
خوبی و تقدّس اختراع است
تا کے شنوم غمِ دلت میرؔ
اکنوں خاموش کن صداع است

۱۳۸

باز دل بر سرِ کوئے تو ز پا افتادہ است
آہ از ایں خستۂ ہجراں کہ بجا افتادہ است

۱۳۹

بہ دستِ ستم کیشِ من ہر زماں است
نہ دانم چہ در سرنوشتِ کماں است

۱۴۰

مباش از خویش غافل گر تمیز است
کہ جاں اے میرؔ مہمانِ عزیز است

۱۴۱

ہر یک ز آہ و اشک پئے جان عاشق است
آب و ہوائے شہرِ وفا ناموافق است

۱۳۷

میری ہر غزل پر اجتماع ہے
صوفیوں کی مجلس میں سماع ہے
ناچار موت پر دل کو ٹھہرایا
اے اداس جاں چلی جا، وداع ہے
خوبصورت لوگ ہرگز اس کو نہیں خریدتے
اس کے باوجود کہ وفا عجب متاع ہے
خاکساروں سے دامن نہ جھٹک
خوبی اور پاکیزگی (محض) اختراع ہے
کب تک تیرا غمِ دل سنوں، میرؔ
اب خاموش رہ، صداع[1] ہے

۱۳۸

تیرے کوچے میں دل پھر سے لڑکھڑا گیا ہے
آہ یہ ہجر کا مارا ٹھیک جگہ پر آ گرا

۱۳۹

ہر وقت میرے ستم پیشہ کے ہاتھ میں ہے
نہیں جانتا کہ کماں کی سرنوشت میں کیا ہے

۱۴۰

اپنے سے غافل مت ہو اگر شعور ہے
کہ جان اے میرؔ مہمانِ عزیز ہے

۱۴۱

آہ اور اشک میں سے ہر ایک عاشق کی جان کا درپے ہے
شہرِ وفا کی آب و ہوا ناموافق ہے

۱۴۲

اگر چہ دستِ مرا با سرم سروکار است
ولے بہ حشر ہمیں دست و دامنِ یار است

۱۴۳

بر سرِ ما بہ دمِ نزع رسیدی بہ عبث
ما کجا ایم، تو تصدیع کشیدی بہ عبث
حاصلے بود، ہمیں بود کہ پامال شدی
در رہِ حادثہ چوں سبزہ دمیدی بہ عبث

۱۴۴

ناساز بود عارضۂ عشق با علاج
مردم بہ یادِ عارضِ خوبِ تو لاعلاج

۱۴۵

اسپ و فیل و علم و شوکت و شاں آخر ہیچ
گشتہ بالفرض از آنِ تو جہاں آخر ہیچ
منعم اے خانہ خراب ایں ہمہ شوقِ تعمیر
سال ہا ساختہ ای جا و مکاں آخر ہیچ

۱۴۶

قدرِ جنسِ وفا نہ دارد شرح
دل بہ طفلانِ شہر دادم طرح

۱۴۷

ہست بر ریش و فش مدارِ شیخ
شانہ کاری ست روزگارِ شیخ
رفت در وجہِ بادہ سجادہ
رونقِ خوش گرفت کارِ شیخ

۱۴۲

اگرچہ میرے ہاتھ کو میرے سر سے سروکار ہے
لیکن حشر میں یہی ہاتھ ہے اور دامنِ یار ہے

۱۴۳

میرے سرہانے دمِ نزع میں عبث پہنچا
ہم کہاں ہیں تو نے عبث تکلیف اٹھائی
زندگی کا حاصل اگر تھا (تو) یہی تھا کہ تُو پامال ہو جائے
(تُو) زمانے کی گردش کی راہ میں سبزے کی طرح عبث اُگا

۱۴۴

علاج سے عشق کا عارضہ موافقت نہیں رکھتا تھا
تیرے خوبصورت گالوں کی یاد میں لاعلاج مرگیا

۱۴۵

ہاتھی اور گھوڑے، علم اور شوکت اور شان آخرِ کار کچھ نہیں
تو ان سے بالفرض گزر بھی گیا (تو بھی) جہاں کچھ بھی نہیں ہے
اے خانہ خراب دولت منداس قدر تعمیر کا شوق
سالہا تو نے جگہ بنائی اور مکان آخرِ کار کچھ بھی نہیں

۱۴۶

وفا کی جنس مول نہیں رکھتی تھی
میں نے دل طفلانِ شہر کو مفت دے دیا

۱۴۷

داڑھی اور عمامے پر شیخ کا دار و مدار ہے
ریاکاری شیخ کی زندگی ہے
سجادہ شراب کی وجہ سے چلا گیا
شیخ کے ہنر میں خوب ترقّی ہوئی

۱۴۸

بہاراں رنگ دارد شاخ در شاخ
گلِ تر می زند چشمک ز ہر شاخ
نہ دارد ہر کہ فکرِ برگِ عشرت
بر آرد از ندامت چوں شجر شاخ

۱۴۹

دوش بے روئے تو از غم کار بر دل تنگ بود
شورشِ فریادِ من فرسنگ در فرسنگ بود
با رخِ زردم سرشکِ سرخ ربطے داشتہ ست
پیش از ایں اے ہم نشیں بر چہرۂ من رنگ بود
بے تامّل از نہالانِ چمن بگذشتہ ای
ورنہ در ہر سایہ اے برگے تہِ نیرنگ بود
خوب شد مجنوں بہ صحرا رفت و نامش محو شد
در محبت پیشگاں آں ناخلف بے ننگ بود
کردہ ام عمرے بہ کوئے عشق خوابِ راحتے
بسترِ من خاک بود و بالشِ من سنگ بود
سینہ صافی روشناسِ خوب و زشتم کردہ است
یادِ آں عہدے کہ ایں آئینہ زیرِ زنگ بود
غالباً آویزشے با غیر کرد و کشتہ شد
دیدہ بودم میرؔ را شب، مستعدِ جنگ بود

۱۵۰

سرو پیشِ سرو از آں قامت روایت می کند
گل بہ گل از خوبیِ رویش حکایت می کند
مصلحت جز بستنِ لب نیست اکنوں ورنہ من
نالہ اے دارم کہ در دل ہا سرایت می کند

۱۴۸

بہار نے شاخ در شاخ رنگ بکھیرے ہیں
گلِ تر ہر شاخ پر سے اشارہ کر رہا ہے
جو بھی برگِ[۱] عشرت کی فکر نہیں رکھتا
شرمندگی اٹھاتا ہے

۱۴۹

کل تیرے چہرے کے بغیر غم سے دل کا حال خراب تھا
میری فریاد کا شور فرسنگ در فرسنگ تھا
میرے زرد چہرے سے سرخ آنسو ایک ربط رکھتا ہے
اس سے پہلے اے ہم نشیں میرے چہرے پر رنگ تھا
تُو چمن کے تازہ پودوں کو دیکھے بغیر گزر گیا ہے
ورنہ ہر پتّے سائے میں ایک طلسم کی جھلک تھی
اچھا ہوا کہ مجنوں صحرا کو چلا گیا اور اس کا نام فراموش ہو گیا
محبت پیشگاں میں وہ ناخلف بے وقار تھا
ایک عمر عشق کے کوچے میں خوابِ راحت (میں بسر) کی ہے
خاک میرا بستر تھی اور پتھر میرا تکیہ تھا
میرے صاف دل نے مجھے خوب اور زشت کا روشناس کر دیا ہے
اس زمانے کی یاد (آتی ہے جب) کہ یہ آئینہ زنگ آلود تھا
غالباً غیر سے الجھا اور مارا گیا
میں نے دیکھا تھا رات میرؔ جنگ پر تیار تھا

۱۵۰

سرو سرو کے سامنے اس کے قامت کی روایت کر رہا ہے
گل گل سے اس کے چہرے کی حکایت (بیان) کر رہا ہے
اب سوائے ہونٹوں کو سی لینے کے کوئی اور بہتری نہیں ہے ورنہ میرے پاس
وہ نالہ ہے جو دلوں میں سرایت کرتا ہے

---

[۱] سازوسامان۔

دل ہمہ خوں گشتہ و پامالِ شوقِ وصلِ تست
دیدہ اکثر آرزوئے خاکِ پایت می کند
بر سخن ہائے دروغش راہ رفتن سادگی ست
ایں کہ می گوید کہ می آیم، عنایت می کند
نے سناں می بایدش، نے خنجر و نے تیغِ تیز
بہرِ قتلم جنبشِ مژگاں کفایت می کند
بندۂ اقبالِ تو گردم کہ با ایں ظلم و جور
بر سرِ ہر کوچہ درویشے دعایت می کند
ہم چو میرؔ آزردہ جانے در جہاں امروز نیست
می چکد خوں از سخن ہر گہ شکایت می کند

۱۵۱

از رہے نازکناں کہ آں بتِ عیّار رود
فتنہ زاں راہ بہ اندیشۂ بسیار رود
ار تماشائے رخت حور برو درماند
ور پری چشمِ تو بیند، دلش از کار رود
سوئے من آمدنِ اوست بداں ساں کہ طبیب
از سرِ ناز پئے دیدنِ بیمار رود
یک نگاہِ پسِ مژگاں و دو صد نومیدی
جانِ قربانیِ اندازِ تو دشوار رود
تا قیامت نگراں زیرِ زمیں خواہد بود
چشمِ عاشق کہ بہ ایں حسرتِ دیدار رود[1]

۱۵۲

احوالِ دل مپرسید، یک لخت چاک گردید
بیمارِ ما گراں بود آخر ہلاک گردید

---

[1] اگلے دو اشعار مخدوش ہیں۔

دل تمام خوں ہو چکا ہے اور تیرے وصل کے شوق کا پامال ہے
آنکھ اکثر تیرے پیروں کی خاک کی آرزو کرتی ہے
اس کی جھوٹی باتوں پر یقین کرنا سادگی ہے
یہ جو کہتا ہے کہ میں آرہا ہوں، عنایت کرتا ہے
نہ اس کو سناں چاہیے ہے نہ خنجر اور نہ تیز تیغ
میرے قتل کے لیے جنبشِ مژگاں کافی ہوگی
تیری خوش نصیبی کا غلام ہو گیا ہوں کہ اس ظلم اور جور کے باوجود
ہر کوچے میں ایک درویش تجھے دعا کر رہا ہے
میرؔ کی طرح آج دنیا میں کوئی آزردہ جاں نہیں ہے
باتوں سے خوں ٹپکتا ہے جب بھی شکایت کرتا ہے

۱۵۱

اس راہ (جس) سے وہ بت عیّار ناز کرتا ہوا جاتا ہے
فتنہ اس راہ بہت خوف کھاتا ہوا گزرتا ہے
اگر حور تیرے چہرے کو دیکھے، (تو) اس پر ٹھٹک کر رہ جائے
اور اگر پری تجھے دیکھے، اس کا دل کام سے جاتا رہے
میری طرف اس کا آنا اس طرح ہے کہ (جیسے) طبیب
ناز کے ساتھ بیمار کو دیکھنے کے لیے جاتا ہے
ایک پسِ مژگاں نگاہ اور دو سو نا امیدیاں
تجھ پر قربان ہونے والے کی جان مشکل سے نکلتی ہے
قیامت تک زیرِ زمین منتظر رہے گی
عاشق کی آنکھ جو اس حسرتِ دیدار کے ساتھ رخصت ہو رہی ہے

۱۵۲

دل کا حال مت پوچھ، یک لخت چاک ہو گیا ہے
میرا بیمار قریب المرگ تھا، آخر ہلاک ہو گیا ہے

بزمِ خوشِ جہاں را چوں شب شکست دیدم
شد دود شمعِ محفل، پروانہ خاک گردید
از پوچ گوئیِ او ہر دل کدورتے داشت
از ہم گذشتِ واعظ محراب پاک گردید
بودہ ست خوش نصیبے، ہم عاقبت بخیرے
آں کس کہ مضجعِ او در پائے تاک گردید
پایانِ کار اے میرؔ در عشقِ نوجواناں
دل چاک چاک گردید، جاں دردناک گردید

۱۵۳

دوش آہم ز سینہ سرزدہ بود
آتشے در سپہر در زدہ بود
دل ز باغِ زمانہ رنگ نہ داشت
گلِ داغے مگر بہ سرزدہ بود
شد مبدّل بہ شام، صبحِ چمن
یک نفس مرغِ نالہ پر زدہ بود
تا من از جیب سر بروں آرم
دامن آں شوخ چشم بر زدہ بود
آخرِ کار شد جراحت میرؔ
عشق زخمے کہ بر جگر زدہ بود

۱۵۴

ابرو چو کنی کج بہ تو دیدن نہ توانند
برخودشکناں غیرِ خمیدن نہ توانند
بالقوۂ خصمانۂ ایں ناز کہ دارد
آن ای کہ کمانِ تو کشیدن نہ توانند
مرغانِ سحر در چمن از حیرت حسنت
چوں طائرِ تصویر پریدن نہ توانند

جہاں کی بزمِ خوش کو رات گذرنے کے بعد دیکھا
شمعِ محفل دھواں تھی، پروانہ خاک ہوگیا تھا
اس کی بے مغز گفتگو سے ہر دل میں کدورت تھی
واعظ کے مرجانے سے محراب پاک ہوگئی
وہ خوش نصیب رہا، (اس کی) عاقبت بھی بخیر
جس کی قبر انگور کی بیلوں کے سائے تلے بنی
آخرِ کار نوجوانوں کے عشق میں اے میرؔ
دل چاک چاک ہوگیا، جاں دردناک ہوگئی

۱۵۳

کل میری آہ سینے سے نکلی تھی
ایک آگ نے آسمان کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا
دل میں باغِ زمانہ کا رنگ نہیں تھا
ایک گلِ داغ مگر کھلا تھا
صبحِ چمن شام میں بدل گئی
مرغِ نالہ نے ایک نفس پر پھڑپھڑایا تھا
جب تک میں گریباں سے سر کو باہر نکالتا
وہ شوخ چشم جانے کے لیے دامن سمیٹ چکا تھا
آخر کار میرؔ جراحت بن گیا
عشق نے جو زخم جگر پر لگایا تھا

۱۵۴

جب تو بھویں چڑھاتا ہے تجھے دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتے
صاحبانِ عجز جھکے بغیر نہیں رہ سکتے
درحقیقت دشمنی کے ساتھ ساتھ یہ ناز کس کے پاس ہے
تو وہ ہے تیرے ہم پلّہ نہیں ہو سکتے ہیں
مرغانِ سحر چمن میں تیرے حسن کی حیرت سے
تصویر کے طائر کی طرح اڑ نہیں سکتے

عشاق بہ تسلیم رضادادۂ عشق اند
ایشاں تہِ تیغِ تو تپیدن نہ توانند
در بزمِ خوشت بہ کہ لبم بستہ بماند
گر سر کنم افسانہ شنیدن نہ توانند
تا کے دو سہ اشک از خطرِ شہرتِ عشقم
آیند بہ مژگاں و چکیدن نہ توانند
در شہر کنم قدغن اگر دست بیابم
تا بوالہوساں جیب دریدن نہ توانند
بےتاب و تواناںِ وفا آہ چہ سازند
از دامنِ او دست کشیدن نہ توانند
ایں یک دو سخن نشنوِ گم کردہ رہِ شعر
آں جا کہ من ام میرؔ رسیدن نہ توانند

۱۵۵

از دست و بازوئے تو ضرر بر ضرر رسید
تیرِ تو سینہ کردہ ز دل بر جگر رسید
اکنوں بہ دست آمدنِ دل چہ ممکن است
آں قطرہ خوں بہ ناحیۂ چشمِ تر رسید
در حالِ نزع گوش زدم شد رسیدنش
وقتے کہ بےخبر شدم، انیم خبر رسید
رفتی ز چشم و دل تہ و بالا شد از تپش
از رفتنِ تو آہ قیامت بہ سر رسید
امروز میرؔ خندہ زناں حرف می زند
از یارِ او کتابتِ شوقے مگر رسید

۱۵۶

چوں بہ کویش می روم ہنگامہ بر من می شود
یار ہم از بہرِ پاسِ خلق دشمن می شود

عشاق تسلیم (کی خو) سے عشق کے رضادادہ ہیں
یہ لوگ تیری تیغ کے تلے تڑپ نہیں سکتے
بزم میں بہتر ہے کہ میرے لب بند رہیں
اگر افسانہ شروع کروں سن نہیں سکیں گے
کب تک دو تین آنسو میرے عشق کی بدنامی کے ڈر سے
پلکوں تک آئیں اور ٹپک نہ سکیں
اگر مقدور ہو تو شہر میں پابندی لگا دوں
کہ بوالہوس گریباں نہ پھاڑ سکیں
وفا کے بے تاب و تواں کیا کریں
اس کے دامن سے ہاتھ نہیں کھینچ سکتے
یہ دو ایک بات نہ ماننے والے، شاعری کی راہ سے بھٹکے ہوئے
(اے) میرؔ جس جگہ میں ہوں وہاں نہیں پہنچ سکتے

۱۵۵

تیرے دست و بازو سے ضرر پر ضرر پہنچا
تیرا تیر دل سے ٹکرا کر جگر میں لگا
اب دل کا ہاتھ آنا کیسے ممکن ہے
وہ قطرۂ خوں چشمِ تر کنارے پہنچ گیا ہے
نزع کی حالت میں اس کے آنے کی خبر سنی
میں جس وقت بے خبر ہو گیا مجھے یہ خبر پہنچی
تو نظر سے دور ہوا اور دل تپش سے تہ و بالا ہو گیا
تیرے چلے جانے سے آہ سر پر قیامت ٹوٹ پڑی
آج میرؔ ہنس ہنس کر بات کر رہا ہے
شاید اسے یار کا پُرشوق خط ملا ہے

۱۵۶

جب اس کے کوچے میں جاتا ہوں مجھ پر ہنگامہ ہو جاتا ہے
یار بھی لوگوں کی طرفداری میں دشمن بن جاتا ہے

سیرِ ما اندوہ گیناں یک قلم بے لطف نیست
نو گلے ہم گاہ ایں جا نرگسی زن می شود
در غمِ دل تکیۂ ما طرفہ ماتم خانہ اے ست
جمع می آیند درویشاں و شیون می شود
گل چو می بینم بہ یادِ روئے او غش می کنم
حال اگر ایں است ترکِ سیرِ گلشن می شود
با بتاں از اختلاطِ میرؔ می دانیم ما
کایں جواں امروز یا فردا برہمن می شود

۱۵۷

فتنہ و آفت و آشوب و بلا می گویند
چشمِ بیمارِ ترا شوخ، چہ ہا می گویند
پردہ بردار کہ در شوقِ تو ہر شام و سحر
جانِ خود را دو سہ درویش دعا می گویند
گر جگر نیست بروں رو ز دیارِ عشاق
درد را مردمِ ایں شہر دوا می گویند
ما ز جورِ تو بہ جاں آمدہ بودیم، چہ شد
گر بگفتیم کہ ایں را چہ ادا می گویند
نیست جاے کہ در او رخنۂ اندازِ تو نیست
ہر چہ در وصفِ تو گویند، بجا می گویند
مدّتے شد کہ اسیرانِ محبت ہر صبح
داستاں ہا ز غمِ دل بہ صبا می گویند
بےقباحت نہ بود شیخ نمازِ معکوس
لوطیاں جملہ ترا پا بہ ہوا می گویند
بوئے انس از گلِ ایں باغ نیامد بہ مشام
ما چہ دانیم کے را مہر و وفا می گویند

ہم غم زدوں کی سیر بھی بالکل بے لطف نہیں ہے
نیا کھلا ہوا پھول بھی کبھی کبھی اشارے کرتا ہے
دل کے غم میں ہمارا تکیہ ایک عجیب ماتم خانہ ہے
درویش جمع ہوتے ہیں اور گریہ وزاری شروع ہو جاتی ہے
جب پھول کو دیکھتا ہوں اس کے چہرے کی یاد میں غش کھاتا ہوں
حال اگر یہی ہے گلشن کی سیر ترک ہوا چاہتی ہے
میرؔ کے بتوں سے ملتے رہنے (کی وجہ) سے ہم جانتے ہیں
کہ یہ جواں آج کل میں برہمن ہوا چاہتا ہے

۱۵۷

فتنہ اور آشوب اور بلا کہتے ہیں
اے شوخ تیری چشمِ بیمار کو کیا کیا کہتے ہیں
پردہ اٹھا کہ تیرے شوق میں ہر شام وسحر
اپنی جان کو دو تین درویش دعا کرتے ہیں
اگر حوصلہ نہیں ہے عاشقوں کے دیار سے باہر چلا جا
درد کو اس شہر کے لوگ دوا کہتے ہیں
ہم تیرے ظلم سے جان بلب ہو گئے ہیں، کیا ہوا
اگر ہم نے کہا کہ اس کو کون سی ادا کہتے ہیں
کوئی جگہ نہیں ہے جہاں تیرے انداز (کی وجہ) سے فساد نہ ہو
تیرے وصف میں جو کچھ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
مدت ہو گئی کہ محبت کے اسیر ہر صبح
غم دل کی داستانیں صبا سے کہتے ہیں
اے شیخ نمازِ معکوس[1] بے قباحت نہیں ہوتی
سارے لوطی تجھے پا بہ ہوا کہتے ہیں
اس باغ سے محبت کی بو مشام تک نہیں آئی
ہم کیا جانیں کسے مہر و وفا کہتے ہیں

---

[1] عملیات میں سے ایک عمل جس میں سر نیچے ٹانگیں اوپر رکھی جاتی ہیں۔

کس کماہی بہ جہاں ذاتِ علیؑ را نہ شناخت
شیعہ مولیٰ و نصیریش خدا می گویند
میرؔ بر شعرِ ترِ خویش مکن ایں ہمہ ناز
دیگراں نیز غزل را بہ صفا می گویند

۱۵۸

دل می کشد بہ صحرا ہنگامِ کار آمد
شورے ست در سرِ من شاید بہار آمد
بےاختیار از خاک خواہیم قد کشیدن
آں پارۂ قیامت گر بر مزار آمد
چوں سرمہ گشت باعث افزونیِ بصر را
گردے اگر بہ سویم زاں رہ‌گذار آمد
با لذّتِ وصالش من آشنا نہ گشتم
کز خویش رفتہ بودم ہر گاہ یار آمد
میرؔ از جفائے خوباں دیروز کشتہ افتاد
ایں نوجوانِ ناکام آخر بہ کار آمد

۱۵۹

آفت کجا ز شورِ تو برپا نمی شود
کے جلوہ می کنی تو کہ غوغا نمی شود
یارب بہ کوچۂ کہ فتادہ ست راہِ دل
دیرے ست در تلاشم و پیدا نمی شود
دل غنچۂ کدام گلِ غیرموسم است
ہر چند می کشیم ولے وا نمی شود
اے دل چہ حظِ یاریِ شہرآشنا بتے
کاو لحظہ اے بہ کامِ تو تنہا نمی شود
گو شمع ساں بہ بزمِ خوشت سر رود بہ باد
ترکِ وفا و مہرِ تو از ما نمی شود

دنیا میں کسی نے ذاتِ علیؓ کو مکمل طور پر نہیں پہچانا
شیعہ مولیٰ اور نصیری خدا کہتے ہیں
میرؔ اپنے شعرِ تر پر اتنا زیادہ ناز مت کر
دوسرے بھی غزل صفائی سے کہتے ہیں

۱۵۸

دل صحرا کی طرف کھنچتا ہے مراد کا زمانہ آ گیا
میرے سر میں ایک شور ہے شاید کہ بہار آئی
خاک سے بے اختیار اٹھ کھڑے ہو جائیں گے
اگر وہ قیامت کا ٹکڑا مزار پر آیا
سرمے کی طرح بینائی میں اضافے کا باعث ہوئی
اگر میری طرف اس راہ گزر سے گرد آئی
میں اس کے وصال کی لذّت سے آشنا نہ ہوا
کہ جب بھی یار آیا، اپنے ہوش سے جاتا رہا تھا
میرؔ معشقوں کی جفا سے کل قتل ہوا پڑا تھا
یہ ناکام نوجواں آخر کام آیا

۱۵۹

تیرے عشق سے کہاں آفت برپا نہیں ہوتی
تو کب جلوہ گر ہوتا ہے کہ شور و غل نہیں ہوتا
یارب دل کی راہ کس کے کوچے میں جا پڑی ہے
مدّت سے میں (اس کی) تلاش میں ہوں اور نہیں ملتی
دل کس غیر موسم کے پھول کی کلی ہے
ہر چند ہم (اسے) کھلانے کی کوشش کرتے ہیں مگر نہیں کھلتا
اے دل شہر بھر سے آشنائی رکھنے والے محبوب سے دوستی کا کیا لطف
کہ وہ ایک لمحہ بھی تیری مراد (پوری کرنے کے) لیے تنہا نہیں ہوتا
تیری خوبصورت بزم میں شمع کی طرح اگر سر اڑ (بھی) جائے
تیری وفا اور محبت کو چھوڑنا ہم سے نہیں ہوگا

ہر چند گفتہ اند کہ اے میرؔ روزِ حشر
دیدارِ عام می شود، امّا نمی شود

۱۶۰

دردِ عشقم بہ چشمِ یار آورد
گریہ آبے بہ روئے کار آورد
نخلِ عشقت رسید چوں بہ مراد
حلق ہائے بریدہ بار آورد
تا رسیدم در ایں خراب آباد
فتنہ بر فتنہ روزگار آورد
داغِ سودائے من کہ گشتہ سیاہ
ایں بلا بر سرِ بہار آورد
میرؔ در انتظارِ گردِ رہش
چشمِ نم ناکِ من غبار آورد

۱۶۱

متصل بے تو خون فشانی کرد
چشمِ بے تہ چہ رازبانی کرد
عشقؔ آخر مرا بہ کشتن داد
دوستے دشمنیِ جانی کرد
بر بلائے فراقِ او اے دل
صبر خوب است اگر توانی کرد
دل منہ بر سلوکِ ظاہرِ او
لطف اگر کرد مہربانی کرد
میرؔ گویند در فراق بمرد
تا چساں بے تو زندگانی کرد

ہر چند اے میرؔ کہا جاتا ہے کہ حشر کے دن
دیدار عام ہوگا، لیکن اگر نہیں ہوا؟

۱٦۰

میرے عشق کا درد مجھے یار کی نظروں میں لایا
گریے نے میرا کام بنا دیا
تیرے عشق کا نخل جب مراد کو پہنچا
کٹے ہوئے حلقوں کا پھل لایا
جب سے اس خراب آباد میں پہنچا (ہوں)
روزگار فتنہ پر فتنہ لایا (ہے)
میرے جنوں کا داغ کہ سیاہ ہوگیا
یہ بلا بہار میرے سر پر لائی
میرؔ اس کی راہ کی گرد کے انتظار میں
میری چشم نمناک غبار لائی

۱٦۱

تیرے بغیر مسلسل خوں فشانی کی
کم ظرف آنکھوں نے کیسی راز داری کی
عشق نے آخر مجھے قتل ہونے کے لیے دے دیا
ایک دوست نے جانی دشمنی کی
اس کے فراق کی بلا پر اے دل
صبر اچھا ہے اگر کر سکے
اس کے ظاہرا سلوک پر دل مت دے
لطف اگر کیا (اس نے) مہربانی کی
میرؔ کہتے ہیں فراق میں مرگیا
کب تک تیرے بغیر زندگی کرتا

۱۶۲

یک لحظہ کاش سوئے منِ خستہ رو کنند
آناں کہ چاکِ سینہ بہ مژگاں رفو کنند
صحبت چگونہ گرم تواں کرد با گلے
کافسردہ می شود ز نزاکت چو بو کنند
بارے تو خود بگو کہ چہ خواہی جواب گفت
گر روزِ حشر با تو مرا رو بہ رو کنند
من عینِ دوست گشتم و ترسم کہ دشمناں
بر من نظر کنند و تماشائے او کنند
یک چند مہربانیِ ظاہر ضرورت است
تا خوگرانِ مہر بہ جورِ تو خو کنند
ہر چند کامِ اہلِ طلب حاصل است لیک
شرطِ محبت است کہ شاں جستجو کنند
دارند غم کشاں دلِ بے خواہش ارنہ میرؔ
خود حاضر است یار اگر آرزو کنند

۱۶۳

عاشق کہ دلِ سوختہ چوں آبلہ دارد
آزردۂ عشق است ز خود ہم گلہ دارد
یک لحظہ فراغت نہ دہد دست ز تشویش
صد پارہ شود دل کہ مرا دہ دلہ دارد
دیرےست کہ از یوسفِ مانیست نشانے
خوبی ست نہ آں جنس کہ ہر قافلہ دارد
دارم سرِ پُرشور ز سودا و خموشم
عشق است کسے را کہ چو من حوصلہ دارد
میرؔ از دل و جاں معتقدِ پیرِ مغاں است
او دستِ ارادت بہ ہمیں سلسلہ دارد

۱۶۲

ایک لحظہ کاش مجھ زخمی کی طرف رخ کریں
وہ جو سینے کے چاک کو پلکوں سے رفو کرتے ہیں
اس گل سے صحبت کس طرح گرم کر سکتے ہیں
(جو) کہ نزاکت سے مرجھا جاتا ہے جب سونگھتے ہیں
آخرِ کار تو خود کہہ کیا جواب دے گا
گر روزِ حشر تجھے میرے روبرو کرتے ہیں
میں عینِ دوست ہو گیا ہوں اور ڈرتا ہوں کہ دشمن
مجھ پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کو دیکھتے ہیں
تھوڑی سی دکھاوے کی مہربانی ضروری ہے
تاکہ محبت کے خوگر تیرے ظلم کی عادت ڈالیں
ہرچند کہ اہلِ طلب کا مقصد حاصل ہے مگر
محبت کی شرط ہے کہ وہ لوگ جستجو کریں
غم اٹھانے والے خواہش سے خالی دل رکھتے ہیں ورنہ میرؔ
یار خود حاضر ہے اگر آرزو کریں

۱۶۳

عاشق کہ آبلے کی طرح جلا ہوا دل رکھتا ہے
عشق کا ستایا ہوا ہے، خود سے بھی گلہ رکھتا ہے
اس کو ایک پل بھی اس فکر سے فرصت نہیں ہے (کہ)
(میرا) دل سو ٹکڑے ہو جائے (اور وہ) مجھے پریشان رکھے
مدت ہوئی کہ ہمارے یوسف کی خبر نہیں ہے
حسن وہ جنس نہیں ہے کہ ہر قافلہ لے کر چلتا ہو
دیوانگی میں پرشور دل رکھتا ہوں اور خاموش ہوں
اس پر شاباش ہے جو مجھ جیسا حوصلہ رکھتا ہے
میرؔ دل و جان سے پیرِ مغاں کا معتقد ہے
وہ اسی سلسلے سے دستِ ارادت رکھتا ہے

۱۶۴

دیدار بعدِ مدّتِ بسیار عام شد
تا من به کوے او برسم، ازدحام شد
در راهِ او قدم نه گذاری که پیش از ایں
خاصِ فقیر بود سلوکے که عام شد
فیروزهٔ حبابیِ گردوں چه فائده
در دستِ ما دو روز اگر بہرِ نام شد
من بندهٔ قدِ تو فقط نیستم به جاں
آزاده اے چو سروِ گلستاں غلام شد
تا رو به روے او نه شود صرفهٔ مه است
ہر گاه شد مقابله کارش تمام شد
بر چہره زلف کرده پراگنده وا کشید
مطلب ازیں ادا که به روزے دو شام شد
اظہارِ عجز کردم و نادم شدم که میرؔ
مِن بعد ترکِ رسمِ دعا و سلام شد

۱۶۵

به امیدِ وصلش آں کس که به جاں رسیده باشد
چه ستم کشیده باشد، چه عذاب دیده باشد
ز سلوکِ آں جفا جو من امیدِ آں نه دارم
که بمیرم و به حسرت لبِ خود گزیده باشد
نه عنایتے، نه لطفے، نه ترحّمے، نه مہرے
به کدام امیدواری دلم آرمیده باشد
دلِ چاک چاک دارد گلِ ایں حدیقه، آیا
ز نسیمِ صبح گاہی چه خبر شنیده باشد
ز تو میرؔ رنجه باشد، چه خیالِ باطل است ایں
مگر آں که خاطرِ او ز کسے کبیده باشد

۱۶۴

دیدار بہت مدّت کے بعد عام ہو گیا
جب تک کہ میں اس کے کوچے تک پہنچتا، ازدحام ہو گیا
اس کی راہ میں قدم نہ رکھ کہ اس سے پہلے
وہ سلوک جو مجھ فقیر کے لیے مخصوص تھا، (اب) عام ہو گیا ہے
آسماں کے حبابِ فیروزہ سے کیا فائدہ
اگر دو دن ہمارے ہاتھ میں برائے نام تھا
فقط میں (ہی) (دل و) جان سے تیرے قد کا بندہ نہیں ہوں
گلستان کے سرو کی طرح آزاد (بھی) غلام ہو گیا ہے
جب تک اس کے چہرے کے سامنے نہیں آتا چاند کی عافیت ہے
جس وقت مقابلہ ہوا اس کا کام تمام ہو گیا
چہرے پر زلف کو بکھرا کر لیٹ گیا
اس ادا سے مطلب یہ کہ ایک دن میں دو شامیں ہو گئیں
عاجزی کا اظہار کیا اور پشیماں ہوا کہ میرؔ
اس کے بعد دعا اور سلام کی رسم (بھی) ترک ہو گئی

۱۶۵

جو اس کے وصل کی امید میں مرنے کی حد تک پہنچ گیا ہو گا
کتنا ستم کشیدہ ہو گا، کتنا عذاب دیدہ ہو گا
اس جفا جو کے رویّے سے میں یہ امید نہیں رکھتا
کہ میں مر جاؤں اور (وہ) پشیمانی میں (دانتوں سے) اپنے ہونٹ کاٹے
نہ عنایت، نہ لطف، نہ ترحم، نہ مہر
کس آسرے پر میرا دل سکوں سے رہے
اس باغ کے گل کا دل چاک چاک ہے
نسیم صبح گاہی سے (اِس نے) جانے کیا خبر سنی ہو گی
میرؔ تجھ سے رنجیدہ ہو گا، یہ کیا خیالِ خام ہے
ضرور اس کا دل کسی اور سے رنجیدہ ہوا ہو گا

۱۶۶

بہ خوش رویاں نمایندت کہ خوش رو ایں چنیں باید
بہ دل دارے کہ باید داد دل او ایں چنیں باید
گل و سنبل بدانند از بہ باغ آئی کہ جاناں را
بہ تن بو ایں چنیں، رو ایں چنیں، مو ایں چنیں باید
بیا اے کج ادا با من کہ بنمایم بہ خوبانت
کہ خال و خط بہ ایں خوبی و ابرو ایں چنیں باید
محبت پیشۂ خود کن کہ مشہورِ جہاں گردد
کہ آئیں ایں چنیں، خوبی چنیں، خو ایں چنیں باید
بہ درویشاں اگر داری سرے با میرؔ الفت کن
کہ بر در چوں تو خوبے را دعاگو ایں چنیں باید

۱۶۷

افسوس آں شکار کز و جاں ببرد و مُرد
و ز جوئے تیغِ او دم آبے نہ خورد و مُرد
مردم ز رشکِ آں کہ غمِ بے شمارِ خویش
در احتضارِ پیشِ تو یک یک شمرد و مُرد
از صبح شورِ میرؔ بہ گوشم نمی رسد
شاید کہ عہدِ نالہ بہ بلبل سپرد و مُرد

۱۶۸

آسمانم غم ز مجنوں کم نہ داد
لیک بختِ شہرتِ عالم نہ داد
پنجہ آخر برد در خونم فرو
آں کہ گاہے دست در دستم نہ داد
حیف گل رفت و دماغِ رفتہ ام
رخصتِ یک سیرِ ایں موسم نہ داد

۱۶۶

تجھے خوشروؤں کو دکھاتے ہیں کہ خوش رو ایسا ہونا چاہیے
وہ دلدار کہ جس کو دل دینا چاہیے ایسا ہونا چاہیے
تیرے باغ میں آنے سے گل اور سنبل جانتے ہیں کہ جاناں کے
بدن کی خوش بو ایسی، چہرہ ایسا، بال ایسے ہونے چاہییں
اے کج ادا میرے ساتھ آ کہ ہم تجھے خوباں کو دکھلائیں
کہ خال و خط اس خوبی کے ساتھ اور ابرو ایسے ہونے چاہییں
اپنا پیشہ محبت بنا کہ دنیا میں مشہور ہو جائے
کہ آئین ایسا، خوبی ایسی، خو ایسی ہونی چاہیے
اگر درویشوں سے تعلق رکھتا ہے میرؔ سے الفت کر
کہ تیرے جیسے حسین کے در پر دعا کرنے والا ایسا ہونا چاہیے

۱۶۷

افسوس اس شکار (پر) کہ اس سے جان بچا لے گیا اور مر گیا
اور اس کی جوئے تیغ سے بھی پانی نہیں پیا اور مر گیا
اس پر رشک سے مرتا ہوں کہ اپنے بے شمار غم
(جس نے) مرتے وقت تیرے سامنے ایک ایک کر کے شمار کیے اور مر گیا
صبح سے میرؔ کا شور میرے کانوں میں نہیں پڑا
شاید کہ (اس نے) وصیّت میں نالے کی ذمہ داری بلبل کے سپرد کی اور مر گیا

۱۶۸

آسماں نے مجھے مجنوں سے کم غم نہیں دیا
لیکن شہرتِ عالم کی تقدیر نہیں دی
(اُس نے) اپنی انگلیاں آخر میرے خون میں ڈبوئیں
جس نے کبھی ہاتھ میرے ہاتھ میں نہیں دیا
حیف گل چلے گئے اور مجھے دماغِ رفتہ نے
اس موسم میں ایک (بار بھی) سیر کی اجازت نہیں دی

چوں زید اندوہ گینے کش سپہر
داد غم انواع و چشمِ نم نہ داد
چوں گلم دوراں بہ باغِ کائنات
فرصتِ یک آب خوردن ہم نہ داد
داغِ بے پروائی عشق ام کہ میرؔ
صد جراحت داد و یک مرہم نہ داد

۱۶۹

منِ ناکام را در عشقِ او کامے نمی باید
مرا بے طاقتی بس باشد، آرامے نمی باید
من از بے لطفیت خود رفتنے مدِ نظر دارم
خشونت ہا ضرورت نیست، دشنامے نمی باید
رود از عرش آں سوتر بہ یک دم جانِ مشتاقم
پۓ ایں مرغ در رہ گوشۂ بامے نمی باید
بیا در مسلخِ عشق و بیفشاں جانِ شیریں را
ترا اے طائرِ قدسی مگر نامے نمی باید
اگر ایں است شوق اے میرؔ خواہی رفت در کویش
کتابت احتیاجے نیست، پیغامے نمی باید

۱۷۰

برائے سیر چوں آں مہ ز خانہ برخیزد
بہ شہر محشرے از ہر کرانہ برخیزد
رمیدنم ز سرِ کوئے او بداں ساں شد
کہ نودمیدہ پرے ز آشیانہ برخیزد
دلے برائے جفا ہردم از کجا آرم
خدا کند کہ وفا از میانہ برخیزد
خراب و در بہ درم روزِ حشر باید دید
کہ خاکِ من ز کدام آستانہ برخیزد

وہ غم زدہ کس طرح زندہ رہے کہ جسے آسماں نے
طرح طرح کے غم دیے اور چشمِ نم نہیں دی
زمانے نے باغِ کائنات میں مجھے پھول کی طرح
پانی پینے کی مہلت بھی نہیں دی
عشق کی بے پروائی سے داغ ہوں کہ میرؔ
سو زخم دیے اور ایک مرہم بھی نہیں دیا

۱۶۹

مجھ ناکام کو اس کے عشق میں کوئی کام لازم نہیں ہے
میرے لیے تکلیف کا نہ سہارنا بہت ہے، آرام لازم نہیں ہے
میں اس کی بےلطفی کی وجہ سے ہوش سے گزر جانا مدِنظر رکھتا ہوں
غصہ ضروری نہیں ہے، گالی (دینا) لازم نہیں ہے
ایک دم میں میری جانِ مشتاق عرش سے بھی آگے نکل جاتی ہے
اس پرندے کے لیے راہ میں بام کے کنارے کی ضرورت نہیں ہے
عشق کی قربان گاہ میں آ اور جانِ شیریں نثار کر
اے طائرِ قدسی، (اِس کے بغیر) شاید تیرا نام نہ ہو
اگر اتنا ہی شوق ہے اے میرؔ اس کے کوچے میں جانا چاہیے
خط کی ضرورت نہیں ہے، پیغام لازم نہیں ہے

۱۷۰

جب وہ مہ سیر کے لیے گھر سے نکلتا ہے
شہر میں ہر طرف سے محشر اٹھتا ہے
اس کے کوچے سے میرا نکلنا اس طرح تھا
(جیسے) کہ نو دمیدہ پر[1] آشیانے سے نکلتا ہے
جفا کے لیے ہر وقت دل کہاں سے لاؤں
خدا کرے کہ درمیاں سے وفا اٹھ جائے
مجھ خراب اور دربدر کو روزِ حشر میں دیکھنا چاہیے
کہ میری خاک کس آستانے سے اٹھتی ہے

---

[1] وہ پرندہ جس کے نئے نئے پر نکلے ہوں۔

حدیثِ غیر بہ بسترفتادہ گوش کند
ز غم چو بر لبم آید فسانہ، برخیزد
مگر فریفتۂ آئینہ اش کہ در برِ او
نشنید، آہ کشد، عاشقانہ برخیزد
دمے نمی شودم فرصت از کشیدنِ جور
چو یار رحم نماید، زمانہ برخیزد
برآورد نگہش گرد از دلم آرے
رسد چو تیر، غبار از نشانہ برخیزد
یکے بہ عجز برو پیشِ میرؔ و ہمت خواہ
بہ وقتِ صبح چو بہرِ دوگانہ برخیزد

۱۷۱

جلوہ اش چوں ابتدا در ناز کرد
با دلِ عاشق عجب انداز کرد
شد کباب از آتشِ غیرت دلم
گر بہ کویش طائرے پرواز کرد
در چمن رفتی و بہرِ دیدنت
گلبن از ہر شاخ چشمے باز کرد
وقتِ آں کس خوش کہ چوں گل در بہار
برگِ عیشے بر لبِ جو ساز کرد
بر دماغم خورد از بس ضعفِ دل
بلبلے گر از چمن آواز کرد
چشم تر ناگشتۂ من بے رُخش
گریہ ہاے دردِ دل پرداز کرد
خواب امشب ہم بہ یاراں شد حرام
قصۂ غم میرؔ باز آغاز کرد

بستر پر لیٹ کر غیر کی باتیں سنتا ہے
جوں ہی میرے لبوں پر غم کا فسانہ آتا ہے، اٹھ جاتا ہے
ضرور اس کا آئینہ اس پر فریفتہ ہے کہ وہ اس کے سامنے
بیٹھتا ہے، آہ کھینچتا ہے، عاشقانہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے
ظلم سہتے رہنے سے ایک دم بھی مجھے مہلت نہیں
جب یار رحم کھاتا ہے، زمانہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے
اس کی نگہ نے میرے دل سے گرد باہر نکال دی، سچ ہے
جب تیر لگ جاتا ہے، نشانے سے غبار اٹھتا ہے
کبھی انکسار کے ساتھ میرؔ کے سامنے جا اور دعا چاہ
جب صبح کے وقت (تو) دوگانہ کے لیے اٹھے

۱۷۱

اس کے جلوے نے جب ناز کی ابتدا کی
عاشق کے دل کے ساتھ عجب انداز میں پیش آیا
میرا دل غیرت کی آگ سے کباب ہو گیا
اگر اس کے کوچے پر سے کسی طائر نے پرواز (بھی) کی
تو چمن میں گیا اور تجھے دیکھنے کے لیے
ہر شاخ سے گلاب نے آنکھ کھولی
اس کا وقت اچھا (گزرا) کہ بہار میں گل کی طرح (جس نے)
نہر کے کنارے پر عیش کا سامان سجایا
ضعفِ دل (کی وجہ) سے مجھے بہت ناگوار گزرا
چمن سے اگر بلبل نے آواز دی
تیرے چہرے (کے دیدار) کے بغیر میری ناگشتہ[1] نم ناک آنکھوں نے
دردِ دل (کی وجہ) سے رونا شروع کر دیا
آج رات بھی دوستوں کے لیے خواب حرام ہو گیا
میرؔ نے قصۂ غم کو دوبارہ چھیڑ دیا

---

[1] درست (جو بھیگی نہ ہوں)۔

۱۷۲

دردے کہ مرا دوش از او حالِ دگر بود
پروردۂ نان و نمکِ داغِ جگر بود
ایں دل کہ ہمہ خوں شد و از دیدۂ فرو ریخت
عمرے بہ سرِ راہ بہ امیدِ خبر بود
آں جذب نہ ماندہ ست کہ از پہلوئے او میرؔ
در دستِ دعا گوشۂ دامانِ اثر بود

۱۷۳

ابرِ تر شوقِ مے فزوں تر کرد
ایں ہوا آتشِ مرا بر کرد
پیکرم جملہ زرد شد، یعنی
عشق ایں مشتِ خاک را زر کرد
دردمندِ غمِ تو آخر کار
مردن خویشتن مقرّر کرد
عشق می داشتم نہاں لیکن
خشکیِ ہر دو لب مرا تر کرد
تا چہ اندوہ میرؔ در دل داشت
گریہ سر کرد، چوں سخن سر کرد

۱۷۴

رفتہ رفتہ در برِ من خوں دلِ صدچاک شد
کار آخر بر مرادِ دیدۂ نم ناک شد
بر حذر می باش در وقتِ طلوعِ آفتاب
عالمے از چشمِ شورِ آسماں در خاک شد
قطرہ از مژگاں فتاد و موج زن گردید بحر
سر کشید از دل غبار و طرحِ نُہ افلاک شد

۱۷۲

وہ درد کہ جس سے کل میرا حال دگر تھا
داغِ جگر کے نان و نمک پر پلا تھا
یہ دل کہ تمام خوں ہو گیا اور آنکھوں سے بہہ گیا
ایک مدّت سے سرِ راہ خبر کی امید میں تھا
وہ جذب باقی نہیں ہے کہ میرؔ جس کے فیض سے
دستِ دعا میں دامانِ اثر کا کونا ہوتا تھا

۱۷۳

ابرِ تر نے شراب کا شوق زیادہ کر دیا
اس آرزو نے میری آگ بھڑکا دی
میرا بدن تمام زرد ہو گیا، یعنی
عشق نے اس مشتِ خاک کو سونا بنا دیا
تیرے غم کے دردمند نے آخرِ کار
اپنا مرنا مقرّر کر لیا
میں عشق پوشیدہ رکھتا تھا، لیکن
ہونٹوں کی خشکی نے میرا راز ظاہر کر دیا
میرؔ دل میں کس قدر غم رکھتا تھا
گریہ شروع کیا، جب (بھی) بات شروع کی

۱۷۴

رفتہ رفتہ میرے پہلو میں دلِ صد چاک خوں ہو گیا
آخرِ کار دیدۂ نمناک کی مراد کو پہنچ گیا
طلوعِ آفتاب کے وقت سے ڈرتے رہا کر
ایک دنیا آسمان کی نحس چشم سے خاک میں مل چکی ہے
قطرہ پلکوں سے ٹپکا اور بحر کو موج زن کر دیا
غبار دل سے اٹھا اور نو آسمانوں کی بنیاد بن گیا

من خود از بس لاغری مُردم بہ کنجِ صیدگاہ
وقتِ صیدے خوش کہ خونش زیب آں فتراک شد
مست بودن میرؔ در مےخانہ عالم خوش است
طالعِ رندے کہ تزویجش بہ دختِ تاک شد

۱۷۵

تا قیامت دلِ تپاں دارد
کشتۂ تیغِ او نشاں دارد
گلِ کفشِ تو بلبلے باشد
کہ بہ پائے گل آشیاں دارد
بہ سخن میرؔ را میار کہ او
زیرِ لب نالہ و فغاں دارد

۱۷۶

چند پرسی کہ محبت بہ منِ زار چہ کرد
چہ بگوئیم کہ سیلاب بہ دیوار چہ کرد
جاں بہ خواری شد و اے وائے نہ پرسید کسے
کایں بہ انواعِ عقوبات، سزاوار چہ کرد
عائدِ خلق جہاں گشتہ زیانِ جاں ہا
آں کہ آورد ترا بر سرِ بازار، چہ کرد
نے تہِ تیغ کسے رفت و نہ گردید کباب
کس چہ پردازد از او مرغِ گرفتار چہ کرد
در جگر قطرۂ خوں نیست کہ اشکش سازم
ہائے بےصرفگیِ دیدۂ خوں بار چہ کرد
سینہ ام چاک کن و سوئے دلِ خستہ ببیں
تا بدانی مژہ برہم زدنِ یار چہ کرد
سینہ از کثرتِ داغم ہمگی گشت سیاہ
چہ دہم شرح کہ محرومیِ گلزار چہ کرد

میں خود لاغری سے صید گاہ کے کونے میں مر گیا
اس شکار کی قسمت اچھی (تھی) جس کا خون اس فتراک[1] کی زینت بنا
میرؔ دنیا کے مے خانے میں مست رہنا اچھا ہے
اس رند کی قسمت (اچھی تھی) کہ جس کی شادی انگور کی بیٹی سے ہوئی

۱۷۵

قیامت تک تپتا ہوا دل رکھے گا
اس کی تیغ سے قتل ہونے والا (یہ) نشانی رکھے گا
تیری جوتی پر (کڑھا ہوا) پھول کوئی بلبل ہوگا
کہ پھول کے پاؤں میں آشیاں بنایا ہے
میرؔ کو بات مت کرنے دو کہ وہ
زیرِ لب نالہ اور فغاں رکھتا ہے

۱۷۶

کیا پوچھتا ہے کہ محبت نے مجھ ناتواں کے ساتھ کیا کیا
کیا کہیں کہ سیلاب نے (در و) دیوار کے ساتھ کیا کیا
جاں خواری میں چلی گئی اور افسوس کسی نے نہ پوچھا
کہ ان طرح طرح کی سزاؤں کے مستحق نے کیا کیا تھا
دنیا کے لوگوں پر جان کا زیاں عائد ہو گیا
وہ جو تجھے بازار میں لایا، (اس نے) کیا کیا
نہ کسی کی تیغ کے تلے گیا اور نہ کباب بنا
وہ کس چیز میں مشغول تھا، مرغِ گرفتار نے کیا کیا
جگر میں قطرۂ خوں نہیں ہے کہ میں اس کو اشک بناؤں
ہائے دیدۂ خونبار کے بے فائدہ جانے نے کیا کیا
میرا سینہ چاک کر اور زخمی دل کی طرف دیکھ
تاکہ جان سکے کہ یار کی پلکوں کے جھپکنے نے کیا کیا
داغ کی کثرت سے میرا سینہ تمام سیاہ ہو گیا
کیا بیان کروں کہ گلزار سے دوری نے کیا کیا

---

[1] وہ تسمہ جو زین کے ساتھ آگے پیچھے لگا ہوتا ہے اور جس میں شکار لٹکایا جاتا ہے۔

بر سرِ رہ گذرش می شنوم خود را کشت
لائقِ میرؔ نہ بودہ ست چنیں کار، چہ کرد

۱۷۷

شورشِ دل تا ثریا می رود
کارِ آہ و نالہ بالا می رود
در دمے صد بار آید جاں بہ لب
کس چہ داند آں چہ بر ما می رود
کے بہ حرفش می رسد سحرِ حلال
بحث در اعجازِ عیسیٰ می رود
ایں چنیں تا چند خواہد ماند میرؔ
از درت امروز و فردا می رود

۱۷۸

سحر ہر روز خورشید از سرِ کویت گذر دارد
نمی داند مگر آں سادہ کہ ایں رہ صد خطر دارد
نہ دارد طاقتِ صبرِ بلا جانِ المناک ام
محبّت چند روزے کاش از من دست بردارد
تو اے بے رحم ہر شب واکشی بر بسترِ نازے
چہ دانی حالِ غمگینے کہ سنگے زیرِ سر دارد
چو من یک لحظہ میلِ خوابِ راحت نیست نرگس را
مگر چشمِ ترا اے شوخ آں ہم در نظر دارد
نمی دانم چہ دارد آہ عشقِ فتنہ گر یارب
کہ با ما غم کشاں ہر لحظہ اندازِ دگر دارد
بہ وقتِ رخت بستن دیدنِ یاراں بود لازم
تو ہم یک دم ببیں ما را کہ جاں عزمِ سفر دارد
من اے ہم دم مصیبت دیدہ اے چوں میرؔ کم دیدم
سخن از محنتِ خود تا بگوید چشمِ تر دارد

سنتا ہوں کہ اس کی راہ میں خود کو مار ڈالا
یہ کام میرؔ کے لائق نہیں تھا، کیا کیا

۱۷۷

دل کی شورش ثریا تک پہنچ رہی ہے
آہ اور نالے کا کام ترقی پر ہے
ایک دم میں سو بار جان لب پر آ رہی ہے
کون جانتا ہے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے
اس کی بات کو سحرِ حلال کب پہنچتا ہے
بات عیسیٰ کے معجزے تک چلی جاتی ہے
اس طرح کب تک میرؔ پڑا رہے گا
آج کل میں تیرے دروازے سے چلا جاتا ہے

۱۷۸

ہر سحر خورشید اس کے کوچے سے گزرتا ہے
مگر وہ سادہ لوح نہیں جانتا کہ اس راہ میں سینکڑوں خطرے ہیں
میری المناک جان بلا پر صبر کی طاقت نہیں رکھتی
کاش محبت چند روز مجھ سے ہاتھ اٹھا لے
اے بے رحم تو ہر رات بسترِ ناز پر (آرام سے) لیٹتا ہے
اس غم زدہ کا حال کیا جانے جو سر کے نیچے پتھر رکھتا ہے
میری طرح نرگس کو بھی ایک پل (کے لیے بھی) خوابِ راحت سے رغبت نہیں ہے
ضرور وہ بھی تیری چشمِ شوخ کو نظر میں رکھتی ہے
یا رب (میں) نہیں جانتا، آہ، عشقِ فتنہ گر کیا چاہتا ہے
کہ وہ ہم غم کشوں کے ساتھ ہر لحظہ اور ہی طرح پیش آتا ہے
سفر کے لیے تیار ہوتے وقت دوستوں کی ملاقات لازم ہوتی ہے
تو بھی ایک پل ہمیں دیکھ کہ جان سفر کا عزم رکھتی ہے
میں نے اے ہمدم میرؔ کی طرح مصیبت دیدہ کم دیکھا ہے
اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہی اس کی آنکھیں تر ہو جاتی ہیں

۱۷۹

تنہا نہ در برِ من دل اضطراب دارد
در راہِ اشتیاقش جاں ہم شتاب دارد
ہم چوں حباب غافل یک چشم دیدہ وا کن
زلفیست موجِ دریا کاو پیچ و تاب دارد
یک صبح دیدہ بودم آں چشمِ پُر خمر را
کیفیتِ نگاہش عالم خراب دارد
از سوزِ سینہ آخر خود را زدم بہ دریا
چند آتشِ جدائی جانم کباب دارد
از جا مرو بہ حرفِ بےمغزِ واعظِ شہر
عمامہ اے کہ دارد، رہنِ شراب دارد
تا چند زندہ ماند میرؔ ایں چنیں بہ ہجراں
زودش بکش کہ قاتل ایں خوں ثواب دارد

۱۸۰

ایں بےکسی نگر کہ کسے چشمِ تر نہ کرد
یک ابر ہم بہ خاکِ غریباں گذر نہ کرد
نازم بہ کینہ جوئیِ دربانِ سنگ دل
مردم بر آستانۂ یار و خبر نہ کرد
زخمے بہ من رسید کہ خود ہم ستود و گفت
صد آفریں ترا کہ کسے ایں جگر نہ کرد
زیں غم چہ خوں کہ در جگرِ پارہ پارہ نیست
کاں نازنیں ز شرم بہ عالم نظر نہ کرد
زاں نالہ ہا کہ از جگرِ سنگ بگذرند
محرومی ام ببیں کہ یکے ہم اثر نہ کرد
مانندِ شمع کشتۂ بےدردیِ وَیم
با من چہ دشمنی کہ نسیمِ سحر نہ کرد

۱۷۹

صرف میرے پہلو میں دل ہی بے قرار نہیں ہے
اس کے اشتیاق کی راہ میں جان کو بھی جلدی ہے
حباب کی طرح غافل تھوڑی سی آنکھ کھول
موجِ دریا زلف ہے کہ وہ پیچ و تاب رکھتی ہے
ایک صبح اس خمار سے پر آنکھوں کو دیکھا تھا
اس کی نگاہ کی کیفیت نے میرا حال خراب کر دیا
سوزِ سینہ (کی وجہ) سے آخر خود کو سمندر میں پھینک دیا
کب تک جدائی کی آتش میری جان کو جلاتی رہتی
واعظِ شہر کی کھوکھلی باتوں پر جگہ سے مت ہل
اس کے پاس جو عمامہ تھا (اسے) رہنِ شراب رکھ دیا ہے
میرؔ ہجر میں اس طرح کب تک زندہ بچے گا
قاتل اس کو جلد قتل کر کہ اس خوں سے ثواب ملے گا

۱۸۰

اس بے کسی کو دیکھ کہ کسی نے چشم تر نہیں کی
ایک ابر بھی خاکِ غریباں پر سے نہیں گزرا
سنگ دل دربان کی کینہ جوئی پر ناز کرتا ہوں
میں یار کے آستانہ پر مر گیا اور خبر نہیں کی
مجھ پر ایک زخم (ایسا) لگا کہ (وہ) خود بھی کھڑا ہو گیا اور کہا
تجھ پر صد آفریں ہے کہ کسی نے ایسا حوصلہ نہیں دکھایا تھا
جگرِ چاک چاک میں کیا کیا خوں نہیں ہوا، اس غم سے
کہ اس نازنیں نے شرم سے میرے حال پر نظر نہیں کی
ان نالوں میں سے کہ پتھر کے جگر سے گزر جاتے ہیں
میری محرومی دیکھ کہ ایک نے بھی اثر نہیں کیا
ہم اس کی بے مروّتی (کی وجہ) سے بجھی ہوئی شمع کے مانند ہیں
مجھ سے نسیمِ سحر نے کیا دشمنی نہیں کی

خارے بہ پائے من نہ خلیدہ ست در رہش
کاو رفتہ رفتہ میرؔ سر از دل ببر نہ کرد

۱۸۱

می سزد گر ز بتاں چشمِ وفاے دارد
ہر کہ آئینہ صفت دستِ دعاے دارد
غیرتِ عشق چساں در دلم آتش نہ زند
ہر خس و خار بہ او ربطِ جداے دارد
پے تواں برد بہ کویش ز نگاہِ عشاق
شوقِ دل گم شدگان راہ بہ جاے دارد
ہر طرف آہ و ہمیں اشکِ دمادم دیدم
کوچۂ یار عجب آب و ہواے دارد
ماہ و خورشید و گل و لالہ نمی دانم میرؔ
دلبر آن است کہ آنے و اداے دارد

۱۸۲

سلوک و خوبیِ خوباں کہ ظلم کیشانند
کساں کہ اہلِ وفاے اند خوب می دانند
ز دلبراں مگر ایں چشم داشتم کہ ز ناز
بہ خونِ ناحقِ من تیغ را بخوابانند
بہ ہجر زیستنے جانِ سخت می خواہد
فدائیانِ تو بیش از دمے نمی مانند
رہِ سلوک در ایں کارواں سراسر کن
غنیمت اند عزیزاں کہ جملہ مہمانند
تو در نہ یافتہ ای ذوقِ عشق را ناصح
بتاں کہ دشمنِ جاں اند خوش تر از جانند
قدم دریغ مدار از مزار غم کیشاں
کہ از برائے تو با خاکِ تیرہ یکسانند

میرے پاؤں میں ایک کانٹا بھی اس کی راہ میں (ایسا) نہیں چبھا
جس نے کہ رفتہ رفتہ میرؔ دل سے (اپنا) سر باہر نہیں نکالا

۱۸۱

درست ہے اگر بتوں سے وفا کی توقع رکھتا ہے
ہر ایک جو آئینہ کی طرح دستِ دعا رکھتا ہے
عشق کی غیرت کس طرح میرے دل میں آگ نہ لگائے
ہر خس و خار اس سے جدا ربط رکھتا ہے
عشاق کی نگاہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کوچے میں
دل گم شدگان کا شوق صحیح راستے پر لے جا رہا ہے
ہر طرف آہ و بکا اور یہی دم بدم کا رونا دیکھا
کوچۂ یار عجب آب و ہوا رکھتا ہے
ماہ اور خورشید اور گل و لالہ کو میرؔ میں نہیں جانتا
دلبر وہ ہے جو کہ آن اور ادا رکھتا ہے

۱۸۲

خوباں کہ ظلم پیشہ ہوتے ہیں (ان کا) سلوک اور خوبی
جو اہلِ وفا ہیں خوب جانتے ہیں
دلبروں سے ضرور یہ امید رکھتا ہوں کہ ناز سے
میرے خونِ ناحق میں تیغ کو سلا دیں
ہجر میں جینے کے لیے سخت جان چاہیے
تیرے فدائی ایک سانس سے زیادہ نہیں بچیں گے
اس کارواں میں راہِ سلوک کی سیر کر
عزیزاں قابلِ قدر ہیں کہ سب مہمان ہیں
ناصح تو نے ذوقِ عشق نہیں پایا ہے
معشوق کہ دشمنِ جان ہیں، جان سے پیارے ہیں
غم کشوں کے مزار سے قدم دور نہ رکھ
کہ (یہ) تیرے لیے خاکِ تیرہ میں مل گئے ہیں

ز فرطِ شوق بسے گشتہ ام کنوں اے کاش
مرا بہ گردِ سرِ دلبراں بگردانند
بہ خدمتِ صنم اے راہباں نہ شد تقصیر
ز اہلِ صومعہ پرسید، شاں مسلمانند
گذشت نوبتِ قدسیؔ و صائبؔ و طغراؔ
در ایں زماں ہمہ دیوانِ میرؔ می خوانند

۱۸۳

ہوش از خرامِ ناز بہ یک بار می برد
وآں چشمِ نیم‌مست دل از کار می برد
من بےدماغ و ہر سحر آوازِ عندلیب
دامانِ دل کشیدہ بہ گلزار می برد
با ایں متاع اگر سوئے بازار می رود
دل را بہ یک نگہ ز خریدار می برد
دامن کشاں گذشتنش از اہلِ خانقاہ
چندیں ہزار خرقہ بہ بازار می برد
یک چند زندہ اش دگر از دور می شنو
کے خضر جاں ز دستِ غمِ یار می برد
یارب جہاں چہ جا ست کزیں منزل آدمی
با خود بہ خاک حسرتِ بسیار می برد
روزے ہزار بار ز شوقِ درِ کسے
ایں پاشکستہ دست بہ دیوار می برد
اتا نمی رود قدمم پیشتر یکے
ہر بار ضعف دست و دل از کار می برد
جانش بہ لب رسید و نہ گشتی دُچار میرؔ
رختِ سفر ز کوئے تو ناچار می برد

میں فرطِ شوق میں بہت پھرا ہوں، اب اے کاش
مجھے دلبروں کے سر کے گرد پھرائیں
صنم کی خدمت میں اے راہبو تقصیر نہیں کی
اہلِ صومعہ[۱] سے پوچھیے وہ مسلمان ہیں
قدسیؔ، صائبؔ اور طغراؔ کی نوبت گزر گئی
اس زمانے میں سب میرؔ کا دیوان پڑھتے ہیں

۱۸۳

خرامِ ناز سے ہوش ایک بار اڑا لیتا ہے
اور وہ نیم مست چشم دل کو دیوانہ کر دیتی ہے
میں بے دماغ اور ہر سحر عندلیب کی آواز
دل کے داماں کو گلزار کی طرف کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے
اس متاع کے ساتھ اگر بازار کی طرف جاتا ہے
دل کو ایک نگاہ میں خریدار سے لے اڑتا ہے
خانقاہ والوں (کے پاس) سے اس کا دامن کشاں گزرنا
کئی ہزار خرقوں کو بازار میں لے جاتا ہے
ابھی اس نے زندہ چھوڑ دیا ہے مگر بعد میں دیکھنا
کب تک خضر غمِ یار کے ہاتھوں سے جان بچا لاتا ہے
یا رب دنیا کیا جگہ ہے کہ اس منزل سے آدمی
خاک میں اپنے ساتھ ہزاروں حسرتوں کو لے جاتا ہے
ایک روز میں ہزار بار کسی کے در کا شوق
اس پا شکستہ کو دست بہ دیوار لے جاتا ہے
لیکن میرا ایک سے زیادہ قدم نہیں بڑھتا
ہر بار ناتوانی دست و دل کو معطل کر دیتی ہے
اس کی جاں ہونٹوں پر آ گئی اور تو میرؔ سے دُچار نہیں ہوا
ناچار (وہ) تیرے کوچے سے رختِ سفر اٹھاتا ہے

---

[۱] عیسائیوں کا عبادت خانہ، ہر عبادت گاہ، مجازاً مسجد۔

۱۸۴

گریہ چوں شیشہ در گلو دارد
دل نہ دانم چہ آرزو دارد
گل و آئینہ و مہ و خورشید
ہر کسے رو بہ سوئے او دارد
لعلِ بے تہ کہ می زند بر سنگ
پیشِ لب ہائے او چہ رو دارد
سایہ اش با پری بہ ہر گاہے
از سرِ ناز گفتگو دارد
چوں زَید در زمانِ بےلطفی
آں کہ با التفات خو دارد
چرخ یارب نمی رسد جاے
از برائے کہ جستجو دارد
بہ گرہ بستہ است چوں گوہر
ہر کہ یک قطرہ آبرو دارد
جرعہ بر خاکِ میرؔ خواہد ریخت
یار از آں مے کہ در سبو دارد

۱۸۵

نگاہم با تہِ کار آشنا بود
بہ ہر مشتِ غبارے کبریا بود
چہ می پرسی کہ ہر روزِ جوانی
نگارے بود لیکن بےوفا بود
ز بلبل در گلستان یادگارے
پرِ چندے نسیمے در قفا بود
سحرگہ بر سرِ پروانہ رفتم
کفِ خاکسترِ گرمے بہ جا بود

۱۸۴

صراحی کی طرح (اس کے) گلو میں آنسو ہے
میں نہیں جانتا دل کیا آرزو رکھتا ہے
گل اور آئینہ اور مہ اور خورشید
یہ سب اس کی طرف متوجّہ رہتے ہیں
بے حقیقت لعل وہ پتھر پر مار دیتا ہے
اس کے لبوں کے سامنے کیا قدر رکھتا ہے
اس کا سایہ ہر قدم پر پری کے ساتھ
ناز سے گفتگو کرتا ہے
نامہربانی کے زمانے میں کیسے زندہ رہے
وہ جسے کہ التفات کی عادت پڑی ہوئی ہو
آسماں یا رب منزل تک نہیں پہنچتا
(وہ) کس کی جستجو کرتا ہے
(اس نے اسے) گہر کی طرح گرہ میں باندھ لیا ہے
جس کے پاس بھی ایک قطرہ آبرو ہے
میرؔ کی خاک پر ایک گھونٹ چھڑکنا چاہیے
یار اس شراب سے جو تیرے سبو میں ہے

۱۸۵

میری نگاہ کام کی اصل سے آشنا تھی
ہر مٹھی بھر غبار میں خدا تھا
کیا پوچھتا ہے کہ جوانی میں ہر دن
ایک محبوب (میسّر) تھا مگر بے وفا تھا
بلبل کی گلستان میں نشانی
اے نسیم (باغ کے) پچھلے حصّے میں چند پر (باقی) رہ گئے تھے
صبح کو پروانے کے پاس گیا
گرم کفِ خاکستر موجود تھی

بہ صد خونِ جگر من پیش بردم
وگرنہ شہرتِ مجنوں بلا بود
غلط کردم کہ وا بوسیدم از خود
نہ دانستم در ایں قالب خدا بود
مگر در خانقہ دستے فشاندی
کہ صد پیراہنِ نیکاں قبا بود
تو اے سرمایۂ ہستی چہ ہستی
کہ خلقے گشت از بہرِ تو نابود
نہ دیدم میرؔ را در کوئے او لیک
غبارِ ناتوانے با صبا بود

۱۸۶

دوشم چو بید لرزہ بہ جسمِ نزار بود
خود جسمِ من نہ بود دلِ بے‌قرار بود
بشکست خورد عشقِ زبردست عاقبت
بازوئے من کہ بالشِ نازِ نگار بود
بہر کسے کہ مشتِ غبارم بہ باد رفت
او زیرِ لب نہ گفت کہ ایں جا مزار بود
روزے ہزار مرتبہ از جاں گذشتہ ام
راہِ جدائیِ تو چہ مشکل گذار بود
بارے زخم نمودی و آسودہ ساختی
جانِ بہ لب رسیدہ در ایں انتظار بود
تا بودہ ام ز وقتِ خودآگاہ بودہ ام
دستم بہ کار بود و دلِ من بہ یار بود
جائے کہ خارزار نمودار گشتہ است
دیروز اے ستم زدہ ایں جا بہار بود

جگر کو سو خون کر کے میں آ گے آ گیا
ورنہ مجنوں کی بلا کی شہرت تھی
میں نے غلط کیا کہ خود سے روگردانی کی
یہ نہیں سمجھا کہ اس قالب میں خدا تھا
ضرور خانقہ میں تو نے (گاتے وقت) ہاتھوں کو جنبش دی ہے
کہ پارساؤں کی قبائیں صد چاک تھیں
تو اے سرمایۂ ہستی کیا ہستی ہے
کہ ایک دنیا تیرے لیے فنا ہو گئی
میرؔ کو اس کے کوچے میں دیکھا نہیں، لیکن
ایک ناتواں غبار صبا کے ساتھ تھا

۱۸۶

کل رات جسمِ ناتواں پر بید کی طرح لرزہ طاری تھا
خود میرا جسم نہ تھا، دلِ بے قرار تھا
عشقِ زبردست نے آخرِ کار توڑ ڈالا
میرا بازو (جو) کہ محبوب کا بالشِ ناز تھا
جس کے لیے میری مشتِ غبار ہوا میں اڑی
اس نے زیرِ لب (بھی) نہیں کہا کہ اس جگہ مزار تھا
ہر روز ہزار مرتبہ (میں) جان سے گزرتا تھا
تیری جدائی کی راہ کتنی مشکل گزار تھی
آخرِ کار مجھے چہرہ دکھایا اور آسودہ کیا
لبوں پر آئی ہوئی جان اسی انتظار میں تھی
جب تک زندہ تھا اپنے زمانے سے خود آگاہ تھا
میرا ہاتھ کام میں لگا تھا اور میرا دل یار میں لگا تھا
اس جگہ کہ (جہاں) خارزار نمودار ہو چکا ہے
کل اے ستم زدہ اس جگہ بہار تھی

تا چشمِ خویش باز نمایم خراب گشت
بنیادِ قصرِ عمر چہ ناپائیدار بود
کردی جفا و جور بہ طرحے کہ شد ہلاک
ہر چند میرؔ طرح کشِ روزگار بود

۱۸۷

مستمندِ عشق می داند کہ سودا می کند
دیدنِ طفلانِ تہ بازار رسوا می کند
کعبہ خود دارد طلب کاندر بیاباں واقع است
کام می جوید دل از وے سعیِ بےجا می کند
دل اگر ایں است کار از دست خواہد رفت میرؔ
از تپیدن ہر نفس ہنگامہ برپا می کند

۱۸۸

از سرِ مژگاں، نہ تنہا در غمت خوں می رود
آں چہ در دل داشتم از دیدہ بیروں می رود
گریۂ ہر لحظۂ من شکوۂ دیرینہ اے ست
نیم جانے دارم آں ہم بے تو اکنوں می رود
آہ از آں عاشق ستم آخر چہ می خواہد کہ میرؔ
می کشد آزارِ بسیارے و ممنوں می رود

۱۸۹

زندگانی کہ اعتبارے بود
در فراقش بہ دوش بارے بود
شد بہ ہر شاخ ماتمِ بلبل
باغ گوئی کہ سبزوارے بود
کوہکن مفت جانِ شیریں داد
سخت ناآزمودہ کارے بود

جب تک اپنی آنکھ دوبارہ کھولتا، اجڑ گیا
قصرِ عمر کی بنیاد کتنی ناپائیدار تھی
تو نے جفا اور ظلم اس طرح سے کیا کہ ہلاک ہو گیا
ہر چند کہ میرؔ روزگار کا فرماں بردار تھا

۱۸۷

عشق میں غم اٹھانے والا جانتا ہے کہ جنون ہو جاتا ہے
بازاری لڑکوں کا دیکھنا رسوا کرتا ہے
کعبہ خود طلب رکھتا ہے کہ وہ بیاباں میں واقع ہے
اس سے دل کی مراد مانگتا ہے، بے جا سعی کرتا ہے
دل اگر یہی ہے میرؔ کام ہاتھ سے نکل جائے گا
تڑپ کر ہر سانس کے ساتھ ہنگامہ برپا کرتا ہے

۱۸۸

تیرے غم میں صرف خون ہی پلکوں سے نہیں بہتا ہے
جو کچھ دل میں رکھتا ہوں، آنکھوں سے باہر آ جاتا ہے
میرا ہر وقت کا رونا پرانا شکوہ ہے
نیم جان رکھتا ہوں، تیرے بغیر اب وہ بھی جا رہی ہے
آہ اس عاشق پر ستم کرنے والے سے میرؔ آخر کیا چاہتا ہے کہ
بہت زیادہ آزار اٹھاتا ہے اور ممنون (ہو کر) جاتا ہے

۱۸۹

زندگی کہ ایک اعتبار تھی
اس کے فراق میں بارِ دوش ہو گئی
ہر شاخ پر بلبل کا ماتم تھا
باغ تو کہے کہ سبزوار تھا
کوہکن نے جانِ شیریں مفت میں گنوائی
بہت ناتجربہ کار تھا

---

[1] ایران کا ایک مشہور شہر۔

کرد یکساں بہ خاکِ گور مرا
آں کفِ خاک یادگارے بود
نے تپیدے و نے گرفتہ شدے
پیش از ایں دل عزیز یارے بود
ساعدِ آں نہالِ گلشنِ حسن
گوئیا سیم شاخ دارے بود
زندگی عاجزانہ کرد و بمرد
میرؔ درویشِ خاکسارے بود

۱۹۰

راہِ دل ہر کہ کند سر جگرش باید کرد
در نخستیں قدمے ترکِ سرش باید کرد
گر چہ تدبیرِ شکستِ دل از او ہم نہ شود
لیکن از حالِ خرابم خبرش باید کرد
حیف باشد کہ رود دل پۓ لعل و یاقوت
سیرِ خوش رنگیِ گل برگِ ترش باید کرد
قابلِ صحبتِ آں مغبچہ ہر کس نہ بود
شیخ را حلقۂ بیرونِ درش باید کرد
چند چوں موے شب و روز بہ خود پیچیدن
دست اگر دست دہد در کمرش باید کرد
ہر کہ چشمانِ ترا مائلِ خود می خواہد
اوّلاً از ہمہ قطعِ نظرش باید کرد
ہر کرا میرؔ بود قصدِ بہ چشم آمدنے
تابِ دل صرف بہ کسبِ ہنرش باید کرد

مجھے خاکِ گور کے برابر کر دیا
وہ کفِ خاک یادگار تھی
نہ تپش رکھتا تھا اور نہ رنجیدہ رہتا تھا
اس پہلے دل، ایک عزیز دوست تھا
اس حسن کے گلشن کے نہال کا بازو
گویا سیم شاخ دار[۱] تھا
عاجزانہ زندگی کی اور مر گیا
میرؔ ایک خاکسار درویش تھا

۱۹۰

جو بھی راہِ دل سر کرنا (چاہتا) ہے اس کو حوصلہ پیدا کرنا چاہیے
پہلے قدم پر اپنا سر ترک کرنا چاہیے
اگرچہ شکستِ دل کا مداوا اس سے بھی نہیں ہوگا
لیکن میرے حالِ خراب کی اس کو خبر کرنی چاہیے
حیف ہوگا کہ دل لعل و یاقوت کی جستجو کرے
اس کے تازہ گل برگ کی خوش رنگی کی سیر کرنی چاہیے
اس مغ بچہ کی صحبت کے قابل ہر کوئی نہیں ہوتا
شیخ کو اس کے در کے حلقے سے باہر نکال دینا چاہیے
زلف کی طرح رات دن خود سے الجھنا کب تک
ہاتھ اگر ساتھ دے اس کی کمر میں ڈالنا چاہیے
جو بھی تیری آنکھوں کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتا ہے
سب سے پہلے اس کو اور سب سے قطع نظر کرنا چاہیے
جس کو بھی (اس کی) نگاہوں میں آنے کا شوق ہے
دل کی توانائی کو اس کے ہنر کو سیکھنے میں صرف کرنا چاہیے

---

[۱] خالص چاندی۔

۱۹۱

دردمندے کہ عشق خو اُفتاد
با غم و درد کارِ او اُفتاد

رشتۂ الفتِ بُت آخر کار
ہم چو زنار در گلو اُفتاد

دیدن او بہ حشر ہم رمزے ست
طبعِ شوخش بہانہ جو اُفتاد

زلف بکشود، فتنہ اے برخاست
چشم بنمود، ہائے و ہو اُفتاد

قد برافراشتے، قیامت شد
گام برداشتے، غلو اُفتاد

نامہ ام چوں پرِ فتادہ بہ راہ
در دیارِ تو کو بہ کو اُفتاد

جملہ تن گوش شو کہ واعظِ شہر
بر زباں ہا ز گفتگو افتاد

سینہ معلوم می شود خالی ست
تا چہ از دیدہ ام فرو اُفتاد

پہلوان ام بہ فنِ شعر اے میرؔ
ہر کہ شد روکشم، بہ رو اُفتاد

۱۹۲

موذّن سحرگہ اذاں می دہد
عجائب اذّیت از آں می دہد

چرا گم نہ گردم کہ ہر سالکے
بجائے من او را نشاں می دہد

بہ آں نخلِ امید بر می خورم
اگر مرگ چندے اماں می دہد

۱۹۱

وہ دردمند جو عشق کا خوگر ہو گیا
اس کا کام درد اور غم سے پڑا
بت کی الفت کا رشتہ آخرکار
زنار کی طرح گلے میں پڑ گیا
حشر میں بھی اس کا دیدار ایک فریب ہے
اس کی شوخ طبع بہانہ جو ہو گئی ہے
زلف کھولی اور ایک فتنہ اٹھ کھڑا ہوا
آنکھ اس کی دیکھنے سے ہائے وہو شروع ہو گی
کھڑے ہونے سے قیامت ہو گئی
قدم اٹھانے سے غوغا مچ گیا
میرا خط راستہ میں پڑے ہوئے پر کی طرح
تیرے دیار میں کوبکو پڑا رہا
ہمہ تن گوش ہو کہ واعظ شہر
(اپنی) گفتگو سے بدنام ہو گیا ہے
سینہ خالی (خالی) معلوم ہوتا ہے
میری آنکھوں سے کیا گر گیا ہے
اے میرؔ میں فن شعر کا پہلوان ہوں
جو بھی میرے سامنے آیا منھ کے بل گرا

۱۹۲

موذّن صبح کے وقت اذان دے رہا ہے
اس سے عجیب اذیّت پہنچا رہا ہے
میں کیوں گم نہ ہو جاؤں کہ ہر سالک
میرے بجائے اُس کا پتہ بتا رہا ہے
اس امید کے پیڑ سے پھل کھاؤں
اگر موت کچھ دن امان دیتی ہے

مگیرید نامِ بتے پیشِ من
پۓ خوش بتاں بندہ جاں می دہد
بہ ایں کم زبانیِ بسیار میرؔ
زباں آوراں را زیاں می دہد

۱۹۳

در ملکِ دل ز کثرتِ شوقش فتور شد
چشمِ ترم بحیرۂ عسرالعبور شد
دارد نظر بہ سرمہ بتِ شوخ چشمِ من
یکساں شدن بہ خاکِ سیاہم ضرور شد
وا شد گرہ ز گیسوۓ او، فتنہ سر کشید
در جنبش آمد آں لبِ شیریں و شور شود
افگند پردہ از رخ و نورے نمود کرد
مژگاں بہم زد از رہِ شوخی، ظہور شد
کارم خراب کردۂ بےتابیِ دل است
ہر دم سماجت از حد و شرمِ حضور شد
مقصود بود خدمتِ معقولِ شیخ لیک
از من نیامدہ، آہ چہ سازم، قصور شد
در کینِ میرؔ صرفۂ یارانِ عہد نیست
ہر کس کہ تیز جانبِ او دید، کور شد

۱۹۴

گردشِ نرگسِ مستِ تو شب آزارم کرد
تا سحر ہم نفسِ گریۂ سرشارم کرد
موجب خواہشِ بسیار نہ دل گشت و نہ چشم
دیدنِ گرمِ تو اے شوخ طلبگارم کرد
ناتواں گشتم و بر بسترِ غم افتادم
آرزومندیِ دیدارِ تو بیمارم کرد

میرے سامنے کسی بت کا نام نہ لیں
خوبصورت بتوں کے لیے بندہ جان دیتا ہے
اتنی زیادہ کم زبانی کے باوجود میرؔ
زباں آوروں[1] کو زبان سکھاتا ہے

۱۹۳

ملک دل میں اس کے شوق کی زیادتی سے شورش برپا ہوئی
میری چشمِ تر وہ سمندر بن گئی جسے پار کرنا مشکل ہے
میرا بتِ شوخ چشم سرمے کی خواہش رکھتا ہے
مجھے خاکِ سیاہ سے یکساں ہونا ضروری ہے
اس کے گیسو سے گرہ کھلی اور فتنے نے سر اٹھایا
وہ لبِ شیریں جنبش میں آئے اور شور برپا ہو گیا
اُس نے رخ سے پردے کو اٹھایا اور ایک نور ظاہر ہو گیا
اس نے شوخی سے پلکوں کو ملایا اور ظہور ہو گیا
ہمارا کام دل کی بے تابی کا خراب کیا ہوا ہے
ہر وقت کی منّت سماجت اس کی حیا کی (حدِ برداشت) سے زیادہ ہو گئی تھی
شیخ کی معقول خدمت مقصود تھی لیکن
افسوس مجھ سے نہیں ہوئی، کیا کروں، قصور ہو گیا
میرؔ کی دشمنی میں یارانِ عہد کا فائدہ نہیں ہے
جس نے بھی اس کی طرف دشمنی سے دیکھا، اندھا ہو گیا

۱۹۴

تیری نرگس مست کی گردش نے رات مجھے آزار دیا
صبح تک (اس نے) مجھے گریۂ سرشار[2] کا ہم نفس بنا دیا
بہت زیادہ خواہش کا موجب نہ دل ہوا نہ آنکھیں
تجھے قریب سے دیکھنے نے اے شوخ مجھے طلب گار کر دیا
ناتواں ہو گیا اور بسترِ غم پر گر گیا
تجھے دیکھنے کی آرزو نے مجھے بیمار کر دیا

---

[1] صاحب زبان، شاعر، فصیح۔
[2] آنسوؤں سے رونا۔

رفتم از خویش و فراغت ز دو عالم کردم
بے خبر بودن از آرام، خبردارم کرد
کاش می داشتم اے میرؔ زباں را در کام
آخر ایں زمزمۂ صبح گرفتارم کرد

۱۹۵

خوش باشد اگر قصدِ جفا داشتہ باشد
آں رفت کہ سر بر سرِ ما داشتہ باشد
من ہم جگرے داشتم از سنگ کہ خوں شد
عشق است کسے را کہ وفا داشتہ باشد
راہے نتواں برد بہ سرِ کوچۂ زلفش
ایں بخت مگر بادِ صبا داشتہ باشد
از نعشِ شہیدے کہ رود دیر تواں یافت
کایں کشتہ بہ دل از تو چہا داشتہ باشد
ہر وقت سجودے بہ درِ او نتواں برد
ایں نیست نمازے کہ قضا داشتہ باشد
دادے کنم اے لالہ رُخاں با دلِ پُرداغ
انصاف اگر شہرِ شما داشتہ باشد
با خاک برابر شدنِ میرؔ دلیل است
اغلب کہ سرِ آں کفِ پا داشتہ باشد

۱۹۶

سرگذشتِ من ادا از ہر زبانے می شود
ایں حکایت رفتہ رفتہ داستانے می شود
گر بہ ایں اندازِ خود را می نماید چند روز
خالِ رخسارِ تو اے مہ، داغِ جانے می شود
ایں نہ پنداری کہ خواہی شد بہ پیری ناتواں
قامتِ خم گشتہ ہم بارِ گرانے می شود

میں خود سے بے گانہ ہوا اور دو عالم سے فراغت پالی
آرام سے بے خبر ہونے نے مجھے خبردار کر دیا
کاش اے میرؔ میں زبان کو منہ میں رکھتا
آخر اس صبح کے زمزمے نے مجھے گرفتار کرا دیا

۱۹۵

اچھا ہوگا اگر وہ جفا کا قصد کیے ہوئے ہو
وہ (وقت) گزر گیا کہ میرے سر پر سر رکھے ہوئے ہوتا تھا
میں بھی پتھر کا جگر رکھتا تھا جو کہ خون ہو گیا
اس پر شاباش ہے جو وفا رکھتا ہو
اُس کے کوچۂ زلف میں راستہ نہیں پا سکتے
ایسا نصیب (صرف) بادِ صبا کو ہی ملا ہے
شہید کا جنازہ (تیرے کوچے سے) رُک رُک کر گذر رہا ہے
کہ یہ دل کا مارا ہوا تجھ سے کیا کیا (خواہش) رکھتا ہوگا
ہر وقت اس کے دروازے پر سجدہ نہیں کر سکتے
یہ نماز نہیں ہے کہ قضا ہو سکتی ہے
اے لالہ رخان میرے دلِ پُرداغ سے انصاف کرو
اگر تمہارے شہر میں انصاف ہوتا ہو
میرؔ کا خاک کے برابر ہونا (اس بات کی) دلیل ہے (کہ)
ضرور (وہ) اس کفِ پا کی خواہش رکھتا ہوگا

۱۹۶

میری سرگزشت ہر زبان سے ادا ہو رہی ہے
یہ حکایت رفتہ رفتہ داستان بن رہی ہے
اگر (تو) اس انداز سے خود کو چند روز دکھاتا رہے گا
اے مہ، تیرے رخسار کا تل، جان کا داغ ہو جائے گا
یہ مت گمان کر کہ بڑھاپے میں ناتواں ہو جائے گا
جھکا ہوا قد بھی بارِ گراں بن جاتا ہے

ذرّہ ذرّہ خاکِ من لبریز شورِ عشقِ اوست
چوں بہم می آید ایں اجزا جہانے می شود
در نظر قدرِ بلندے دارم از عجز و نیاز
ایں زمینِ پست روزے آسمانے می شود
دل قوی دارید رنداں، شیخ شاہدباز شد
عاقبت ایں بےحقیقت قلتبانے می شود
از نیازِ ہر زمانِ میرؔ می دانیم ما
کہ ایں جوانِ رفتہ خاکِ آستانے می شود

۱۹۷

شیوہ ات در سادگی جز ناز و استغنا نہ بود
عالمے برباد می رفت و ترا پروا نہ بود
عہدِ خطّت خوش کہ با رحم آشنایت کردہ است
گفتگوئے لطف آمیز ایں چنیں با ما نہ بود
آں چناں گشتم کہ گم گشتم ولے سودے نہ داد
گوہرِ نایابِ مطلب ہیچ جا پیدا نہ بود
تاب ہا خوردم کہ دستم داد مقبولیِ خلق
ورنہ رہ چوں رشتۂ تسبیح در دل ہا نہ بود
کرد از چشمم تراوش آں چہ در دل داشتم
جوئے خشک افتادۂ من پیشتر دریا نہ بود
آسماں از سفلگی گم کرد ما را ناگہاں
جائے ما پیدا در ایں جا بود و ما را جا نہ بود
ایں چہ واقع شد کہ از دامن گذشتش چاکِ جیب
در بہارِ رفتہ خود میرؔ ایں قدر رسوا نہ بود

میری خاک کا ذرہ ذرہ اس کے عشق کے جنون سے بھرا ہے
جب یہ اجزا بہم آتے ہیں، ایک دنیا بن جاتی ہے
عجز و نیاز (کی وجہ) سے نظروں میں بلند قدر رکھتا ہوں
یہ پست زمین ایک روز آسمان ہو جائے گی
رندو دل مضبوط رکھو، شیخ شاہد باز[1] ہو چکا ہے
یہ ذلیل آخرِ کار عورتوں کا دلّال بن جائے گا
میرؔ کی ہر وقت کی آرزومندی سے ہم سمجھتے ہیں
یہ رفتہ جوان کسی آستان کی خاک ہو جائے گا

۱۹۷

سادگی میں تیرا شیوہ ناز و استغنا کے سوا کچھ اور نہیں تھا
ایک دنیا برباد ہو گئی تھی اور تجھے پروا نہیں تھی
تیرے خط نکل آنے کا زمانہ اچھا ہے کہ (اس نے) تیری رحم سے آشنائی کرا دی ہے
(پہلے) ہم سے اس طرح کی لطف آمیز باتیں نہیں تھیں
اتنا پھرا کہ گم ہو گیا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا
مطلب کا گوہرِ نایاب کہیں نہیں نظر آیا
بہت تکلیفیں اٹھائیں تب جا کر مجھے خلق میں مقبولیت حاصل ہوئی
وگرنہ تسبیح کے دھاگے کی طرح دلوں میں راہ نہیں (بن سکتی) تھی
جو کچھ دل میں رکھتا تھا میری آنکھوں سے ٹپکنے لگا ہے
میری خشک پڑی ہوئی نہر پہلے سمندر نہیں تھی
آسماں نے کمینگی سے ہمیں اچانک گم کر دیا
یہاں پر ہماری جگہ بن گئی تھی اور ہمارے لیے جگہ نہیں تھی
ایسا کیا پیش آیا کہ اس کے گریباں کا چاک دامن سے گزر گیا
پچھلی بہار میں تو میرؔ اتنا رسوا نہیں ہوا تھا

---

[1] بدکار عورتوں سے میل جول رکھنے والا۔

۱۹۸

دو روزے شد کہ دل از غم قیامت در جہاں دارد
فغاں و نالہ و شور از زمیں تا آسماں دارد
کرا راہ است در بزمِ خوشش کز من بہ او گوید
فقیرے جملہ تن آزردہ، سر بر آستاں دارد
بہ دوشِ غیرِ دست افگندہ دیر استادہ می باشد
نشیند چوں بہ من، شمشیر و خنجر درمیاں دارد
دل استقلال ظاہر می کند در عینِ بےتابی
ہمانا اضطراب خویش را از من نہاں دارد
بہ عہدِ ستِ گل دل را چہ بندد کس در ایں گلشن
کہ ایں محبوبِ کم‌گو خود زباں زیرِ زباں دارد
نہ خواہد لرزہ رفت از مضجعِ او تا دمِ محشر
شہیدِ زخمِ تیر ایں جفاکاراں نشاں دارد
ز ضعف و ناتوانی بارِ خاطر نیستم ہر گز
نہ دانم آں ستم‌گر از چہ بر من سرگراں دارد
نمی دانم کہ در شہرِ نکورویاں چہ رسم است ایں
کہ گر کس نامِ مہر ایں جا بگیرد، ترجماں دارد
بیا اے ہم‌نشیں گر دیدنِ میرؔ آرزو داری
ہنوز آں رفتنی در جسمِ غم فرسود جاں دارد

۱۹۹

برگِ گلے بہ دست ز گلشن صبا رسید
یعنی خطے ز کوچۂ آں بےوفا رسید
گل گل شگفتہ است چمن موسمِ گل است
ساقی تو ہم بیا کہ دماغِ ہوا رسید

۱۹۸

دو دن ہوئے کہ دل نے غم سے دنیا میں قیامت اٹھا رکھی تھی
فغاں اور نالہ اور شور زمیں سے آسمان تک کر رکھا تھا
کسے اس کی بزمِ خوش میں رسائی ہے کہ وہ اس سے میرے بارے میں کہتا
ایک فقیر، سراپا افسردگی، آستاں پر سر جھکائے ہوئے ہے
غیر کے کاندھے پر ہاتھ رکھے دیر تک کھڑا رہے گا
میرے ساتھ جب بیٹھتا ہے شمشیر اور خنجر درمیاں میں رکھتا ہے
دل عین بے تابی میں تحمل ظاہر کرتا ہے
یقیناً یہ اپنا اضطراب مجھ سے پوشیدہ رکھتا ہے
گل کے بے ثبات وعدے پر دل کو کون اس گلشن سے لگائے
کہ یہ کم گو محبوب خود زبان زیر زبان رکھتا ہے[1]
زلزلہ اس کی قبر سے دمِ محشر تک نہیں جائے گا
ان جفاکاروں کے تیر کے زخم کے شہید کی پہچان یہ ہے
ضعف اور ناتوانی سے ہرگز بارِ خاطر نہیں ہوں
نہیں جانتا وہ ستم گر کس وجہ سے مجھ سے سرگراں رہتا ہے
نہیں جانتا کہ خوبصورت لوگوں کے شہر میں یہ کیا رسم ہے
کہ اگر کوئی یہاں محبت کا نام لے، (اسے) جرمانہ دینا پڑتا ہے
اے ہم نشیں آ اگر میرؔ کو دیکھنے کی آرزو رکھتا ہے
ابھی تک وہ جانے پر مجبور، غم سے تباہ جسم میں جان رکھتا ہے

۱۹۹

صبا گلشن سے برگ گل ہاتھ میں لیے آئی -
یعنی اس بے وفا کے کوچے سے خط پہنچا ہے
چمن طرح طرح کے رنگ میں کھلا ہے، موسمِ گل ہے
ساقی تو بھی آ جا کہ آرزو کا نشہ چڑھ گیا ہے

---

[1] بات پر قائم نہیں رہتا۔

پُرکاری اش ببیں بہ قراولِ زدہ ست حرف
تا آں زماں کہ زخمِ تفنگے بہ ما رسید
حیرانِ داغِ لالہ ام ایں خام دست را
میراثِ سینہ سوختگاں از کجا رسید
درویشم و دلم بہ نیازے خوش است میرؔ
قربانِ آں سرم کہ کسے را بہ پا رسید

۲۰۰

یا رحم در دلِ تو خدائے جہاں دہد
یا طاقتِ شکیب بہ ایں ناتواں دہد
دل رفت و ہیچ جاے سراغش نہ یافتم
یارب کسے ز گم شدۂ من نشاں دہد
صد سال می تواں بہ امیدِ وصال زیست
گر بےقراریٔ شبِ ہجراں اماں دہد
مُردن بہ دوریٔ تو دہد جانِ تازہ اے
میرم ز رشکِ آں کہ جدا از تو جاں دہد

۲۰۱

از معارض خطِ خوبِ تو فراغے دارد
خطِ خوبانِ دگر پاۓ کلاغے دارد
آتشم زد بہ دل اے لالہ تنک آبیِ تو
ورنہ ہر سوختہ جاں یک دو سہ داغے دارد
خاکِ دل خوں شدۂ داغِ وفا خواہد بود
تربتے کاؤ بہ سر از لالہ چراغے دارد
از سرِ کوچۂ آں زلف گذشتہ ست مگر
کہ نسیمِ سحر اے میرؔ دماغے دارد

اس کی پرکاری دیکھ بندوقچی سے باتیں کرتا رہا
جتنی دیر میں کہ ہمیں بندوق کا زخم لگے
لالہ کے داغ پر حیران ہوں کہ اس خام دست[1] تک
سینہ سوختگاں کی میراث کہاں سے پہنچی
میرؔ میں درویش ہوں اور میرا دل عجز سے خوش ہے
اس سر پر قربان جو کسی کے پاؤں پر جھک گیا

۲۰۰

یا تیرے دل میں خدائے جہاں رحم دے
یا اس ناتواں کو صبر کی طاقت دے
دل چلا گیا اور کہیں اس کا سراغ نہیں پایا
یارب کوئی میرے گم شدہ کا پتہ بتائے
وصال کی امید میں سو سال جی سکتے ہیں
اگر شبِ ہجر کی بے قراری امان دے
تیرے فراق میں مر جانا نئی زندگی بخشتا ہے
اس پر رشک سے مرتا ہوں جو تجھ سے دور رہ کر جان دیتا ہے

۲۰۱

تیرے خوش نما خط کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں
دوسرے معشوقوں کا خط گھسیٹ کر لکھی ہوئی تحریر کی طرح ہے
اے لالہ تیری کم ظرفی نے میرے دل میں آگ لگا دی
ورنہ ہر دل جلا چند داغ (تو) رکھتا (ہی) ہے
وفا کے غم میں دل کا خون کرنے والے کی خاک ہو گی
کہ اس کی تربت کے سرہانے لالہ کا چراغ ہے
شاید اس زلف کے کوچے سے گزری ہے
کہ اے میرؔ نسیمِ سحر کا دماغ نہیں ملتا

---

[1] ناتجربہ کار۔

۲۰۲

گر چہ روئے گلِ نوو اشدہ دیدن دارد
نالۂ مرغِ چمن نیز شنیدن دارد

ایں کنارم کہ لبالب ز بر و دوشِ تو بود
حالیا کار بہ خمیازہ کشیدن دارد

پنجہ اش نیز چو عاشق بہ گریبانِ خود است
گل ہم آیا ہوسِ جیب دریدن دارد

ہر زماں تا مژہ می آید و بر می گردد
ایں دلِ خوں شدہ اندازِ چکیدن دارد

من عزادارِ شکیبائیِ مرحوم میرؔ
بر دلِ من الفِے چند بریدن دارد

۲۰۳

نومید ز جاں گشت بہ ہر کس کہ نگہ کرد
ایں چشمِ سیاہِ تو بسے خانہ سیہ کرد

یک صبح نہ شد با رخِ خوبِ تو برابر
ہر چند کہ گل مشورہ شب ہا بہ کلہ کرد

شد کشتہ بہ سرکوچۂ او میرؔ بہ خواری
معلوم نہ گردید کہ مسکیں چہ گنہ کرد

۲۰۴

در محبّت محنتِ بسیار می باید کشید
بہرِ یک نظّارہ صد آزار می باید کشید

بے ترشّح بادۂ گل رنگ بے کیفیّت است
دامنِ ابرے سوئے گلزار می باید کشید

چہرۂ زیبائے او من بعد خواہی نقش بست
اول اے نقّاش دستِ یار می باید کشید

۲۰۲

گرچہ نئے کھلے ہوئے پھول کا چہرہ دیکھنے کے لائق ہے
مرغِ چمن کا نالہ بھی سننے کے لائق ہے
میری یہ آغوش کہ تیرے بدن سے بھری ہوئی تھی
اب خمیازہ کھینچنے سے کام رکھتی ہے
اس کا ہاتھ بھی عاشق کی طرح اپنے گریباں پر ہے
گل بھی کیا گریبان چاک کرنے کی حسرت رکھتا ہے
ہر بار پلکوں تک آتا ہے اور لوٹ جاتا ہے
یہ خوں شدہ دل بہہ نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے
میرؔ میں اپنے صبرِ مرحوم کا عزادار ہوں
میرے دل پر (اظہارِ غم کے لیے) چند زخم ڈالنے کی ضرورت ہے

۲۰۳

جان سے ناامید ہو گیا جس پر بھی نگاہ کی
تیری اس چشمِ سیاہ نے بہتوں کو بے خانماں کر دیا
ایک صبح بھی تیرے خوبصورت چہرے کے جتنا (خوبصورت) نہیں ہوا
ہر چند کہ پھول نے بہت سی راتوں کو (اپنے) رخسار سے مشورہ کیا
میرؔ اس کے کوچے میں ذلت کے ساتھ مارا گیا
معلوم نہیں ہوا کہ بے چارے نے کیا گناہ کیا تھا

۲۰۴

محبت میں بہت رنج اٹھانا چاہیے
ایک نظارہ کے لیے سو آزار کھینچنا چاہیے
ہلکی ہلکی بارش کے بغیر بادۂ گل رنگ بغیر کیفیت کے ہے
ابر کا دامن گلزار کی طرف کھینچنا چاہیے
اس کے زیبا چہرے کا بعد میں نقش بنانا چاہیے
پہلے اے نقاش یار کا ہاتھ کھینچنا چاہیے

مدعا نایاب و راہِ جستجو دور و دراز
پا بہ دامن ہم‌نشیں ناچار می باید کشید
من نمی گفتم کہ از ناخن جبیں مخراش میرؔ
قدر دانے نیست دست از کار می باید کشید

۲۰۵

ہر کہ بر بسترِ فراق افتاد
چشمِ او دیدہ ام بہ طاق افتاد
شد مرا قدرِ عافیت معلوم
کارِ دل چوں بہ اشتیاق افتاد
دوش از پرتوِ رخِ ساقی
آتشے در ہے رواق افتاد
میرؔ و من دیر دردِ دل کردیم
چوں ملاقات اتفاق افتاد

۲۰۶

نہ شوی غرّہ بر ایں ہستیِ ایامے چند
کز عزیزانِ جہاں نیست بخبر نامے چند
کاش بادِ سحر ایں جا شدہ یک رہ برود
کہ ز من ہم برساند بہ تو پیغامے چند
جملہ تن خوں شدہ از دیدہ چکید آخر کار
ایں دلِ خودسرم از یاریِ خودکامے چند
من و پروانہ و بلبل ہمہ یک جا جمعیم
درگرفتہ ست بہم صحبتِ بدنامے چند
تلخِ او میرؔ بود مفتِ مذاقم چوں شہد
کاش بنوازدم آں شوخ بہ دشنامے چند

مدعا نایاب اور جستجو کی راہ دور اور دراز
اے ہم نشیں پاؤں کو دامن میں مجبوراً کھینچ لینا چاہیے
میں نے کہا نہیں تھا اے میرؔ کہ ناخن سے پیشانی پر خراش مت لگا
کوئی قدر دان نہیں ہے، کام سے ہاتھ کھینچنا چاہیے

۲۰۵

جو بھی فراق میں بستر پر گرا
میں نے دیکھا ہے اس کی آنکھیں عالمِ نزع میں پتھرا گئیں
مجھے عافیت کی قدر معلوم ہوئی
دل کا کام جب تمنّا سے پڑا
کل ساقی کے چہرے کے عکس سے
مقطّرا شراب میں ایک آگ لگ گئی
میرؔ اور میں نے دیر تک دردِ دل بیان کیا
جب اتّفاق سے ملاقات ہوگئی

۲۰۶

اس چند روزہ ہستی پر تجھے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے
کہ عزیزانِ جہاں چند ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں
کاش بادِ سحر اس جگہ سے ایک بار ہو کر گزرتی
کہ مجھ سے بھی چند پیغام تجھ تک پہنچاتی
تمام کا تمام خوں ہو کر آخر آنکھوں سے بہہ نکلا
میرا یہ خودسر دل چند مطلب پرستوں کی دوستی میں
میں، پروانہ اور بلبل سب ایک جگہ جمع ہیں
چند بدناموں کو صحبت موافق آ گئی ہے
اس کی تلخ باتیں میرؔ میرے ذائقے کے لیے مفت کے شہد کی طرح ہوں گی
کاش وہ شوخ مجھے چند دشناموں سے نوازے

---

۱ صاف کی ہوئی۔

۲۰۷

هزار چاک بہ پیراہن اہلِ دل دارند
از ایں حریرقبایاں کہ خوش برِ کارند
برائے عبرتِ یاراں ضرورت است اے کاش
دو روز کشتۂ ما را بہ خاک نسپارند
رود ز خاطرِ مجنوں، جنونِ مجنوں میرؔ
اگر بہ طورِ خودم چند روز بگذارند

۲۰۸

چشمِ تو غارتِ خردِ شیخ و شاب کرد
یک سرمہ‌داں شراب بسے را خراب کرد
از بزمِ یار دوش پشیماں بر آمدم
امید لطف بود مرا، او عتاب کرد
سرمست در رسیدی و دست و بغل شدی
قربانِ مے شوم کہ ترا بےحجاب کرد
مے خورد با رقیب شب و روئے ما نہ دید
ایں بےمروّتی دلِ ما را کباب کرد
اہلِ نظر سزد کہ زبانش قلم کنند
چشمِ ترا کسے کہ بہ نرگس حساب کرد
شرحِ سلوکِ او چہ دہم چوں شدم بہ پیش
زد دوش با مخالف و بر من خطاب کرد
میرؔ از غمِ تو قابلِ دیدن نہ ماندہ است
نامت بہ گوش خورد کہ چشماں پُر آب کرد

۲۰۹

گر شود دہر گلستاں کہ تماشا نہ کنند
غنچہ‌خسپانِ تو ہرگز مژہ را وا نہ کنند

۲۰۷

اہلِ دل پیراہن پر ہزار چاک رکھتے ہیں
ان ریشمی پوشاک پہننے والوں کی وجہ سے جو نہایت خوش اسلوب ہیں
دوستوں کی عبرت کے لیے ضروری ہے اے کاش
دو دن میری نعش کو خاک کے سپرد نہ کریں
میرؔ مجنون کا جنوں مجنوں کے دماغ سے نکل جائے
اگر چند روز اُسے میری طرح رہنے دیں

۲۰۸

تیری آنکھ نے بوڑھوں اور جوانوں کی عقل کو غارت کیا
ایک سرمہ دان (بھر) شراب نے بہتوں کو خراب کیا
بزمِ یار سے کل (میں) پشیماں نکلا
مجھے لطف کی امید تھی اس نے خفگی (کا اظہار) کیا
تو نشے میں مست آیا اور ہم آغوش ہوا
شراب کے قربان جاؤں کہ تجھے بے باک بنا دیا
رقیب کے ساتھ رات شراب پی اور ہمارا چہرہ نہ دیکھا
اس بے مروّتی نے ہمارے دل کو (جلا کر) کباب کر دیا
اہلِ نظر کو مناسب ہے کہ اس کی زبان قلم کر دیں
جس نے تیری آنکھ اور نرگس کو یکساں کہا
اس کے سلوک کی شرح کیا کروں، جب (میں) اس کے سامنے آیا
(اس نے) رقیب سے کاندھا بھڑایا اور مجھے باتیں سنائیں
میرؔ تیرے غم (کی وجہ) سے دیکھنے کے قابل نہیں رہ گیا ہے
تیرا نام کان میں پڑا (نہیں) کہ آنکھوں میں آنسو بھر لایا

۲۰۹

اگر دنیا گلستاں ہو جائے (تو) کون نہیں دیکھے گا
(مگر) تیرے غنچہ خسپاں[۱] ہرگز پلکوں کو نہیں کھولیں گے

---

۱ مفلسی میں اوڑھنے کے لیے کچھ نہ ہونے کی وجہ سے سکڑ کر سونے والے۔

در دیارے کہ وفا شیوۂ اہلِ آں جاست
رسم ایں است کہ میرند و تمنّا نہ کنند
فتنہ در زیرِ سر از دیدنِ پنہاں دارند
گرچہ از شرم بتاں چشم بہ بالا نہ کنند
ناز پیرایۂ حسن است نکورویاں را
ایں ادا گر نہ بود در دلِ من جا نہ کنند
موکشانِ سرِ آں زلف کسانِ عجب اند
گر جراحت بشود زخم کہ پروا نہ کنند
لعلِ جاں‌بخشِ تو ہر گاہ سخن آغازد
لائق آں است کہ مذکورِ مسیحا نہ کنند
تلخ کامانِ وفا طرفہ کسان اند اے میرؔ
کہ بجز مرگ بہ خود ہیچ گوارا نہ کنند

۲۱۰

تا کارِ دل بہ چوں تو سراپا جفا فتاد
بر خاک جملہ خوں‌شدہ از دیدہ ہا فتاد
سوئے دل و جگر سحر از آہِ سوزناک
جست آتشے و لیک نہ دانم کجا فتاد
با من کسے کہ دید ترا، گفت از عجب
کایں گوہر از چہ راہ بہ دستِ گدا فتاد
می گفتمش کہ گیسوئے پُر پیچ او بلاست
حرفم نہ کرد گوش دل و در بلا فتاد
در بزم مطربے غزلِ میرؔ خواندہ بود
زاہد بہ سر درآمد و صوفی ز پا فتاد

۲۱۱

سرم پگاہ سبک از شراب می گردد
طلوعِ کیف از ایں آفتاب می گردد

اس دیار میں جہاں کے رہنے والوں کا شیوہ وفا ہے
رسم یہ ہے کہ مر جاتے ہیں اور تمنا نہیں کرتے
(دراصل) سر میں چھپ کر دیکھنے کا سودا رکھتے ہیں
اگرچہ شرم سے محبوب آنکھ اوپر نہیں اٹھاتے
ناز اچھے چہرے والوں کے حسن کا انداز ہے
اگر یہ ادا نہیں ہوتی (تو) میرے دل میں جگہ نہیں کرتے
اس زلف کے موکشاں کچھ عجیب لوگ ہیں
زخم اگر ناسور ہو جائے (تو بھی) پروا نہیں کرتے
تیرا لعلِ جاں بخش جس وقت بات شروع کرے
مناسب یہی ہے کہ مسیحا کا (اس وقت) ذکر نہ کریں
وفا کا تلخ ذائقہ چکھنے والے کیسے عجیب لوگ ہیں اے میرؔ
کہ موت کے سوا اپنے لیے کچھ بھی گوارا نہیں کرتے

۲۱۰

جب سے دل کا کام تجھ جیسے سراپا جفا سے پڑا
(وہ) آنکھوں سے تمام خوں ہو کر خاک پر گر پڑا
دل اور جگر کی طرف صبح آہِ سوز ناک سے
ایک آگ بلند ہوئی تھی لیکن نہیں جانتا کہاں پر گری
جس کسی نے بھی تجھے میرے ساتھ دیکھا تعجب سے کہا
کہ یہ گوہر کس طرح سے (اس) گدا کے ہاتھ لگا
میں نے اس سے کہا تھا کہ اس کے گیسوے پر پیچ بلا ہیں
دل نے میری بات نہیں سنی اور بلا میں گرفتار ہو گیا
بزم میں مطرب نے میرؔ کی غزل گائی تھی
زاہد سر کے بل گرا اور صوفی لڑکھڑا گیا

۲۱۱

میرا دماغ صبح کو شراب سے چاق و چوبند ہو جاتا ہے
سرور اسی آفتاب سے طلوع ہوتا ہے

تو بر مرادِ دلِ غیر مست می گردی
دلم ز آتشِ غیرت کباب می گردد
ز موج خیزیِ بحرِ جہاں فریب مخور
کہ ایں محیط بہ یک دم سراب می گردد
ہمیشہ گل ز رخت سرخ و زرد می باشد
مدام بادہ ز لعلِ تو آب می گردد
ز حالِ میرؔ چہ گوید کسے کہ آں بے‌کس
بہ کوچۂ تو بہ حالِ خراب می گردد

۲۱۲

ہر گہ بہ شرحِ ہجر دل از کار می رود
چشمم چو مہرِ وصل بہ طومار می رود
سروے بہ جنبش آمد و من از فریبِ شوق
پنداشتم کہ یار بہ گلزار می رود
ہرگز نمی فتد بہ کسے چشمِ بے‌خودش
مستِ گزارہ است و چہ ہشیار می رود
حسن است و شورِ قصۂ یوسف نہ خواندہ ای
در آخر ایں متاع بہ بازار می رود
نرگس ز خاکِ منتظراں رُستہ یک قلم
حرفے ست ایں کہ حسرت دیدار می رود
رہ می رود چناں کہ اثر نیست ظاہرش
ایں عمرِ برق جلوہ چو عیّار می رود
از میرؔ پاشکستہ چہ آید کہ آں ضعیف
تا کوئے یار دست بہ دیوار می رود

تو غیر کے دل کی خواہش پر شراب میں مست ہو جاتا ہے
میرا دل غیرت کی آگ سے (جل کر) کباب ہو جاتا ہے
دنیا کے سمندر کے طوفان اٹھانے سے فریب مت کھا
کہ یہ سمندر اچانک سراب بن جاتا ہے
پھول سدا تیرے چہرے کے سامنے شرمندہ رہتا ہے
شراب ہمیشہ تیرے ہونٹوں کے سامنے تاثیر کھو دیتی ہے
کوئی میرؔ کا حال کیا سنائے کہ وہ بے کس
تیرے کوچے میں خراب حال پھرتا رہتا ہے

۲۱۲

جب کبھی ہجر کی تفصیل (بیان کرنے) میں دل ناکام ہو جاتا ہے
میری آنکھ مہر وصل[1] کی طرح طومار باندھ دیتی ہے
ایک سرو حرکت میں آیا اور میں نے فریبِ شوق میں
گمان کیا کہ یار گلزار کو جا رہا ہے
ہرگز کسی پر اس کی بے خود آنکھ نہیں پڑتی
نشے میں مست ہے اور کیسا ہوش میں جا رہا ہے
حسن ہے اور (تو نے) یوسف کے قصے کی شہرت نہیں سنی ہے
آخرکار یہ متاع بازار میں پہنچ جاتی ہے
نرگس منتظروں کی خاک سے یک قلم[2] اگی
کہا جاتا ہے کہ حسرتِ دیدار چلی جاتی ہے
اس طرح راہ چل رہی کہ اس کا پتہ (ہی) نہیں لگتا
یہ برق جلوہ عمر کتنی تیزی سے گذرتی ہے
میرِ پا شکستہ پر کیا گزری کہ وہ ناتواں
کوئے یار تک دست بہ دیوار جاتا ہے

---

[1] لپٹے ہوئے طومار (کاغذ کی لمبی پٹی) کو کھلنے سے روکنے والی مہر۔
[2] تمام۔

۲۱۳

ز غم خلق میرد، لبت خندہ دارد
ترا حق تعالیٰ بسے زندہ دارد
پےاش رود چشم تا می خرامد
خرامش چہ طرزِ خوش آئندہ دارد
اگر سرخ و زرد است یاقوت شاید
کہ لعلِ تواش سخت شرمندہ دارد
کجا مختلط می شود با من و تو
دلے از جہاں ہر کہ برکندہ دارد
بہ رخسارۂ او برابر نہ گردد
چہ شد ماہ اگر روئے تابندہ دارد
بہ ہر فرد موجود بالذّات باشد
خدا ہم نہ دانم چہ با بندہ دارد
دمے چند با میرِ آوارہ بنشیں
عجائب مزاجِ پراگندہ دارد

۲۱۴

تسکینِ جانِ غم زدہ در تن نمی شود
یعنی کہ بے تو زیستن از من نمی شود
تاریک دانِ سینۂ من بے رخِ کسے
دارد ہزار رخنہ و روشن نمی شود
زیں لطفِ گاہ گاہِ تو اے کامِ جانِ خلق
با من کدام دوست کہ دشمن نمی شود
گل پُرمکلّف است ولے بے تو ہرگزم
میلانِ دل بہ دیدن گلشن نمی شود

۲۱۳

خلق غم سے مرتی ہے اور تیرے لبوں پر ہنسی ہے
تجھے حق تعالیٰ بہت دنوں تک زندہ رکھے
اس کے پیچھے پیچھے آنکھ چلتی ہے جب تک وہ خراماں رہتا ہے
اس کا خرام کتنا پیارا انداز رکھتا ہے
یہ جو یاقوت سرخ و زرد[1] ہے، شاید
کہ تیرے ہونٹوں نے سخت شرمندہ کر رکھا ہے
کب مجھ سے (یا) تجھ سے ملتا ہے
(اپنا) دل جس نے دنیا سے اٹھالیا ہے
اس کے رخسار کے برابر نہیں ہوا
کیا ہوا اگر چاند کا چہرہ روشن ہے
ہر فرد کے ساتھ موجود بالذات ہوتا ہے
نہیں جانتا خدا بھی بندہ سے کیا چاہتا ہے
کچھ دیر میرؔ آوارہ کے ساتھ بیٹھ
عجیب پراگندہ مزاج رکھتا ہے

۲۱۴

جانِ غم زدہ کو بدن میں چین نہیں آتا
یعنی کہ تیرے بغیر زندہ رہنا مجھ سے ممکن نہیں ہے
کسی کے چہرے کے بغیر میرے سینے کا تاریک دان
ہزار روزن رکھتا ہے مگر روشن نہیں ہوتا
تیرے اس گاہ گاہ لطف سے اے خلق کے معشوق
کون (سا) دوست (ہے جو میرا) دشمن نہیں ہو جائے گا
گل بہت زیادہ دعوت دے رہا ہے لیکن تیرے بغیر ہرگز میرے
دل میں گلشن کی سیر کی خواہش نہیں ہوتی

---

[1] شرمندہ۔

طبعِ تو گر بہ شیخ نہ سازد بعید نیست
صحبت برآر میرؔ ز کودن نمی شود

۲۱۵

ہیچ کارم میرؔ حسبِ مدعا در غم نہ شد
مردنے مرکوزِ خاطر داشتم آں ہم نہ شد
اے فلک طورِ ستم از دلبرِ من یاد گیر
ریخت خونِ یک جہاں از ناز و ابرو خم نہ شد
نیست ہرگز جامۂ احرامِ زاہد معتبر
ماند عمرے در حریمِ کعبہ و محرم نہ شد
از عصا و سبحہ و سجّادہ و صوم و صلوٰۃ
رہ نمائے عالمے شد شیخ و خود آدم نہ شد
جا بہ چشمِ مرداں چوں سرمہ کرد از یمنِ عجز
شد بہ خاکِ تیرہ یکساں میرؔ و قدرش کم نہ شد

۲۱۶

عنقریب است کزیں بے سروسامانے چند
دامنے چند بیابند و گریبانے چند
سینۂ من کہ مشبّک بہ نظر می آید
بے محابا زدہ ام بر سرِ مژگانے چند
گردباد و من و مجنوں بہ غمت یک جا ایم
گشتہ چسپاں چہ قدر ربطِ پریشانے چند
در رہِ شعر کسم راہ نما نیست مگر
حرفے چندے ست بہ یادم ز سخن دانے چند
وائے بر ما کہ در ایں دیرِ کہن بعد از مرگ
می گذاریم کفِ خاکے و عصیانے چند

اگر تیری طبیعت شیخ سے نہیں ملتی، بعید نہیں ہے
احمق سے میرؔ دوستی نہیں بڑھ سکتی

۲۱۵

کوئی بھی کام میرؔ غم میں حسبِ مدعا نہیں ہوا
ایک مرنا مرکوزِ خاطر رکھتا تھا، (سو) وہ بھی نہ ہوا
اے فلک میرے دلبر سے ستم کا طریقہ سیکھ
ناز سے ایک جہاں کا خون بہا دیا اور ابرو (تک) خم نہیں ہوئے
زاہد کا جامۂ احرام ہرگز معتبر نہیں ہے
ایک مدّت حریمِ کعبہ میں رہا اور محرم نہیں ہوا
عصا، تسبیح، سجّادہ، اور روزے نماز سے
شیخ ایک دنیا کو ہدایت کرنے والا بن گیا لیکن خود آدمی نہیں بنا
عجز کی تاثیر سے لوگوں کی آنکھوں میں سرمے کی طرح جگہ پائی
میرؔ خاکِ تیرہ میں مل گیا اور اس کی عزّت کم نہیں ہوئی

۲۱۶

جلد ہی ہوگا ان چند بے سروسامانوں کی نشانی
چند دامن پائیں گے اور چند گریباں
میرا سینہ کہ (جو) مشبّک [1] نظر آ رہا ہے
(میں نے) بے دریغ چند مژگانوں سے متصادم کیا ہے
گردباد اور میں اور مجنوں تیرے غم میں ایک جگہ ہیں
چند ربط پریشان کتنے مربوط ہو گئے ہیں
شعر کی راہ میں کوئی میرا رہنما نہیں ہے مگر
مجھے چند سخن دانوں کی چند باتیں یاد ہیں
ہم پر افسوس کہ بعد مرنے کے اس دیرِ کہن [2] میں
کفِ خاک اور کچھ گناہ چھوڑ کر جا رہے ہیں

---

[1] وہ شے جس میں سوراخ ہی سوراخ ہوں۔
[2] دنیا۔

جانبِ خانقہ اے کافرِ بدکیش مرو
رحم بنمائے بہ احوالِ مسلمانے چند
بود نزدیک کہ افسردہ شود آتشِ عشق
میرؔ پیدا شد و بر وے زدہ دامانے چند

۲۱۷

دیدی آخر کہ محبت چہ ادا با ما کرد
کوچہ در کوچہ بہ پیرانہ سری رسوا کرد
شہر در شہر ز اندازِ قدت غوغا بود
طرزِ رفتارِ تو ہنگامۂ نو برپا کرد
وائے بر آں کہ از او چشمِ ترحم دارد
کشتہ شد خلقے و آں شوخ کجا پروا کرد
شیخ را باطنِ دل خستہ جواناں زدہ است
کہ بدیں گونہ بہ پیرانہ سری سودا کرد
دارد اندازِ خرامش روشِ آبِ حیات
مردہ ریگے اگر آمد تہِ پا، احیا کرد
انس با کس نہ بود در وطنِ مالوفم
شہر را وحشتِ دیوانگیم صحرا کرد
مست اکثر بہ سرِ کوئے تو می آید میرؔ
ایں خرابات نشیں رفتگیے پیدا کرد

۲۱۸

چہ باید کرد حیران ایم اکنوں کار مشکل شد
بلائے چوں دلِ بےتاب ناگاہے مقابل شد
نمایاں گشت شوق از پردہ، چشمے در نمود آمد
بہ خود پیچیدہ دردِ جاں گدازے، ہیئت دل شد

خانقہ کی جانب اے بے دین کافر مت جا
چند مسلمانوں کے حال پر رحم کھا
قریب تھا کہ عشق کی آگ بجھ جاتی
میرؔ آ گیا اور اس پر (اپنے) دامن سے کچھ ہوا دی

۲۱۷

تو نے دیکھا کہ محبت نے آخر ہمارے ساتھ کیا ادا دکھلائی
بڑھاپے میں کوچہ در کوچہ رسوا کیا
تیری قامت کے انداز سے شہر در شہر شور تھا
تیری رفتار کے انداز نے نیا ہنگامہ برپا کر دیا
اس پر افسوس ہے جو اس سے رحم کی امید رکھتا ہے
ایک دنیا قتل ہو گئی اور اس شوخ نے کب پروا کی
شیخ کے بوڑھے دل کا باطن نوجوانوں کا مارا ہوا ہے
کہ (اس نے) بڑھاپے میں اتنا زیادہ دیوانہ پن کیا
اس کے خرام کا انداز آبِ حیات کی طرز رکھتا ہے
پاؤں کے نیچے اگر مردہ ریگ[۱] آ گئی، (اسے) زندہ کر دیا
مجھے اپنے عزیز وطن میں کسی سے انس نہیں تھا
شہر کو میری دیوانگی کی وحشت نے صحرا کر دیا
اکثر تیرے کوچے میں میرؔ مست (ہو کر) آتا ہے
اس خرابات نشیں نے ایک بے خودی اختراع کی ہے

۲۱۸

کیا کرنا چاہیے، (ہم) حیراں ہیں، اب کام مشکل ہو گیا
دلِ بے تاب جیسی بلا اچانک مقابل آ گئی ہے
شوق پردے سے نمایاں ہوا، آنکھ نمود میں آ گئی
ایک دردِ جاں گداز خود میں الجھا (اور) دل کی شکل اختیار کر گیا

---

[۱] مردوں کے بچے کھچے آثار۔

ز رو افگندہ برقع در چمن چوں جلوہ گر گشتی
گل از خود رفت، سنبل گشت والہ، سرو مائل شد
محبت از محبّاں دست ہرگز بر نمی دارد
اگر شد جسمِ مجنوں خاک، گردِ راہِ محمل شد
تو زخمے زن خلافِ رسمِ عشق از ما نمی آید
کدامیں کشتۂ تیغِ ستم بدخواہِ قاتل شد
نہ ماند آیا ز فرطِ گریہ خوں در پیکرِ زارم
کہ داغِ سینہ ام بےنورتر از چشمِ بسمل شد
قریبِ صبح خوابم برد و کوچیدند ہمراہاں
بہ سر ہم چوں منش خاکے کہ از اوقات غافل شد
اخیرِ عمر در طبعِ سلیم آوارگی آمد
چہ گویم آہ راہِ من غلط نزدیکِ منزل شد
بجز پامالیِ کشتِ امید اے میرؔ در آخر
بگو بارے کہ از ورزیدنِ عشقت چہ حاصل شد

۲۱۹

عزمِ رہ گر مہِ من خواہد کرد
عالمے ترکِ وطن خواہد کرد
ہر کہ عریاں بدنش خواہد دید
در زماں خلعِ بدن خواہد کرد
چشمِ گل شام و سحر بر راہ است
یار کے رو بہ چمن خواہد کرد
بے تو ایں گریۂ خونیں آخر
چشم را زخمِ کہن خواہد کرد
می چکد خوں ز لبِ بستۂ میرؔ
از غمش تا چہ سخن خواہد کرد

برقع کو رخ سے ہٹا کر چمن میں جب تو جلوہ گر ہوا
گل پاگل ہو گیا، سنبل فریفتہ ہو گیا، سرو مائل ہو گیا
محبت عاشقوں سے ہرگز دست بردار نہیں ہوتی
مجنوں کا جسم اگر خاک ہوا، راہِ محمل کی گرد ہو گیا
تو زخم لگا، عشق کی رسم کے خلاف ہم سے نہیں ہوتا
کوئی ستم کی تیغ کا مارا (کب) قاتل کا بدخواہ ہوا ہے
کیا رونے کی زیادتی سے میرے ناتواں جسم میں خوں باقی نہیں رہا تھا
کہ میرے سینے کا داغ چشمِ بسمل سے (بھی) زیادہ بے نور تھا
صبح کے قریب مجھے خواب لے گیا اور ہمرہاں کوچ کر گئے
میرے جیسے کے سر پر خاک کہ وقت سے غافل ہو گیا تھا
آخرِ عمر میں طبعِ سلیم میں گمراہی آ گئی
کیا کہوں، افسوس کہ میری راہ منزل کے قریب (آ کر) غلط ہو گئی
کشتِ امید کی پامالی کے سوا اے میرؔ آخر
کچھ کہہ کہ تجھے عشق اختیار کرنے سے کیا حاصل ہوا

۲۱۹

اگر میرا محبوب سفر کا ارادہ کرے گا
ایک دنیا ترکِ وطن کر جائے گی
جو بھی اسے عریاں بدن دیکھے گا
(اپنے) بدن کو دنیا (ہی) میں چھوڑ دے گا
گل کی آنکھیں صبح و شام اس کے راستہ پر (لگی) ہیں
یار کب چمن کی طرف رخ کرے گا
تیرے بغیر یہ گریۂ خونیں آخر
آنکھ کو ناسور بنا دے گا
میرؔ کے بند ہونٹوں سے خوں ٹپک رہا ہے
(وہ) اس کے غم کی بات کب تک کرے گا

۲۲۰

بہ گلشن بے آں کہ گردیدہ باشد
گلِ نازکے چوں تو کم دیدہ باشد
بدیں رنگ اگر از درِ باغ آئی
ندامت کشد ہر کہ گل چیدہ باشد
نیامد بہ چشمِ من امروز سنبل
ز گیسوئے او شانہ دزدیدہ باشد
چہ ناعاقبت بیں کسے بود ظالم
نخست آں کہ عشقِ تو ورزیدہ باشد
بہ خود نیست امروز از صبح نرگس
مگر چشمِ مخمورِ او دیدہ باشد
یقین است آں کم سخن حالِ زارم
پس از مرگِ من ہم نہ پُرسیدہ باشد
خرامت بہ طرزے، کلامت بہ طورے
ترا کم کسے میرؔ فہمیدہ باشد

۲۲۱

تا کجا آہ بدیں گونہ بسر باید برد
از سرِ کوئے توام رختِ سفر باید برد
یار دیرے ست کہ وارفتۂ جاں دادنِ ما ست
گر بمیریم بہ او زود خبر باید برد
وائے بر من کہ بہ ایں جانِ سراپا خواہش
از گلستانِ توام داغِ جگر باید برد
نعشِ من دیر از آں کوچہ گذر خواہد کرد
بعدِ جاں دادنم از راہِ دگر باید برد
خستۂ چشمِ تو بہتر ز اطبا نہ شود
میرؔ را بر درِ اربابِ نظر باید برد

۲۲۰

جو بھی گلشن میں بہت گھوما ہوگا
(اس نے) تجھ جیسا نازک پھول کم دیکھا ہوگا
اس رنگ سے اگر تو باغ کے دروازے سے آیا
جس نے بھی پھول چنا ہوگا، شرمندہ ہو جائے گا
سنبل آج میری نظر میں نہیں جچا
اس کے گیسو سے کترا رہا ہوگا
ظالم وہ کتنا ناعاقبت بین تھا
جس نے تیرے عشق کو سب سے پہلے اختیار کیا ہوگا
آج صبح سے نرگس ہوش میں نہیں ہے
ضرور اس کی نشے میں چور آنکھوں کو دیکھا ہوگا
یقین ہے اس کم سخن نے میرا حالِ زار
میرے مرنے کے بعد بھی نہیں پوچھا ہوگا
تیری چال ایک خاص طرز کی، تیری بات ایک خاص طور کی
تجھے میرؔ کسی نے کم (ہی) سمجھا ہوگا

۲۲۱

آہ اس طرح کب تک بسر کیا جا سکتا ہے
تیرے کوچے سے مجھے رختِ سفر اٹھانا چاہیے
بہت دنوں سے یار ہماری جان دینے کا منتظر ہے
اگر ہم مر جائیں اسے جلد خبر پہنچانی چاہیے
مجھ پر افسوس کہ اس سراپا خواہش جان کے ساتھ
تیرے گلستان سے مجھے داغِ جگر لے کر جانا پڑے گا
میرا جنازہ اس کوچے سے (تو) رک رک کر گزرے گا
جان دینے کے بعد مجھے کسی اور راستے سے لے جانا چاہیے
تیری آنکھوں کا بیمار طبیبوں سے اچھا نہیں ہوتا
میرؔ کو اربابِ نظر کے دروازے پر لے جانا چاہیے

۲۲۲

وارفتگاں ز کوئے تو ہرگاہ می روند
جاں می دہند ہر قدم و راہ می روند
ناچار ہر سحر ز درت بےکسانِ عشق
در دیدہ ہا سرشک و بہ لب آہ می روند
ما خود فقط بہ زلف و زنخ مبتلا نہ ایم
خوباں بہ ریسمانِ تو در چاہ می روند
با روئے ضوفشاں چو بہ مہتاب می رسی
انجم بہ چشم روشنیِ ماہ می روند
مستانہ پا منہ کہ جہاں شیشہ‌خانہ است
رہ رو چناں کہ مردمِ آگاہ می روند
افتادگانِ عشق بہ تحریکِ اشتیاق
با کوہِ درد و غم چو پرِ کاہ می روند
اے میرؔ غفلت از سفرِ مرگ خوب نیست
یاراں و دوستاں ہمہ ناگاہ می روند

۲۲۳

دل نہ دانستم کہ سوئے آں دہن خواہد کشید
و ز سکوتِ من بہ جائے ایں سخن خواہد کشید
گر ز طرفے دست و تیغِ یار خواہد شد بلند
عالمے سر در گریبانِ کفن خواہد کشید
گر فروغِ چہرہ اش ایں است اِمشب، شمع را
اشتیاقِ او بروں از انجمن خواہد کشید
در گلستانم مبر با خود کہ جاں خواہم سپرد
بلبلے گر نالہ از طرفِ چمن خواہد کشید

۲۲۲

وارفتگان تیرے کوچے سے جب گزرتے ہیں
ہر قدم پر جان دیتے ہیں اور راستہ چلتے ہیں
ناچار ہر صبح تیرے دروازے سے عشق کے بے کس
آنکھوں میں آنسو اور لب پر آہ کے ساتھ چلے جاتے ہیں
فقط ہم خود ہی زلف اور زنخ[۱] میں مبتلا نہیں ہیں
خوباں بھی تیری رسی سے کنویں میں چلے جاتے ہیں[۲]
اپنے ضوفشاں چہرے کے ساتھ جب تو چاندنی میں پہنچتا ہے
ستارے چاند، کو مبارکباد دینے کے لیے جاتے ہیں
پاؤں مستانہ نہ رکھ کہ دنیا شیشہ خانہ ہے
اس طرح راستہ چل جیسے آگاہ لوگ چلتے ہیں
عشق کے ناتواں شوق کے اکسانے پر
درد و غم کا پہاڑ اٹھائے تنکے کی طرح اڑے جاتے ہیں
اے میرؔ موت کے سفر سے غفلت اچھی نہیں ہے
یار دوست سبھی اچانک چلے جاتے ہیں

۲۲۳

نہیں جانتا تھا کہ دل اس دہن کی طرف کھینچے گا
اور میرے سکوت سے اس سخن کی طرف کھینچے گا
اگر کسی طرف سے یار کا ہاتھ اور تیغ بلند ہو گئی
ایک دنیا کفن کے گریبان میں سر ڈال دے گی
اگر اس کے چہرے کا نور آج رات ایسا ہی ہے، (تو) شمع کو
اس کا شوق انجمن سے باہر کھینچ لائے گا
اپنے ساتھ مجھے گلستان میں نہ لے جا کہ جان دے دوں گا
ایک بلبل (بھی) اگر چمن کی جانب سے نالہ بلند کرے گا

---

۱ ٹھوڑی۔
۲ معشوق بھی تیری بدولت مصیبت میں پھنستے ہیں۔

دل بہ غربت چند یارب ہر سحر چوں آفتاب
جامِ خوں بر یادِ یارانِ وطن خواہد کشید
نقشِ چسپاں پوشِ من خواہد چساں نقّاش بست
گر نہ دامانش بہ زور از دستِ من خواہد کشید
مدّتے در پردہ وحشت کردہ ای ایں بار میرؔ
جوشِ سودایت بروں از پیرہن خواہد کشید

۲۲۴

عشق می خواہد کہ دل را بر سرِ کار آورد
نعرہ بر لب در سماعم سوئے بازار آورد
آں سراپا ناز مغرور است ورنہ روزگار
سال ہا باید کہ چوں من نازبردار آورد
گر بہ ایں رنگیں خرامی بگذری از طرفِ باغ
سرو را شوقِ تماشایت بہ رفتار آورد
در غمِ مجنوں اگر کاہید جسمِ من بجاست
رفتنِ یارِ موافق رنجِ بسیار آورد
گر بہ یک برقع فگندن غش کند عاشق، چہ لطف
دل چناں باید کہ تابِ جلوۂ یار آورد
تا کجا از ناکسی شرمندہ برگردم ز راہ
ویں دلِ بےطاقتم سوئے تو ہر بار آورد
اشتیاقِ چشمِ مستِ او ز خلوت ہر زماں
گوشہ گیراں را بروں آشفتہ دستار آورد
ایں ہوا را بیں کہ منّت می گذارد صد چمن
گر صبا برگِ گلے سویم ز گلزار آورد
آہ از اعجازِ رنگِ آں لبِ خاموش میرؔ
صورتِ دیوار اگر باشد بہ گفتار آورد

یارب غریب الوطنی میں دل کب تک ہر صبح آفتاب کی طرح
وطن کے دوستوں کی یاد میں خوں کا جام کھینچے گا
نقاش کس طرح میرے تنگ پوش کا نقش باندھ پائے گا
جب تک کہ اس کا دامن زبردستی میرے ہاتھ سے نہ چھینے
(تونے) مدّت سے در پردہ وحشت کی ہے اس بار میرؔ
تیرے جنوں کا جوش (تجھے) پیراہن سے باہر کھینچ نکالے گا

۲۲۴

عشق چاہتا ہے کہ دل کو برسرِ کار لائے
وجد میں مجھے نالہ برلب سوئے بازار لائے
وہ سراپا ناز مغرور ہے ورنہ زمانے (کو)
سالہا چاہیے ہیں کہ مجھ جیسا ناز بردار پیدا کرے
(تو) اگر اس رنگیں خرامی سے باغ کی طرف گزر کرے
سرو کو تجھے دیکھنے کا شوق رفتار میں لے آئے
اگر مجنوں کے غم میں میرا جسم گھل گیا، درست ہے
ہم مزاج دوست کے گزر جانے کا بہت زیادہ غم ہوتا ہے
اگر صرف برقع کے الٹنے سے عاشق غش کھا جائے، کیا لطف
دل ایسا ہونا چاہیے کہ جلوۂ یار کی تاب لا سکے
کہاں تک بے کسی (کی وجہ) سے راستے سے شرمندہ لوٹ جاؤں
اور میرا یہ بے طاقت دل ہر بار تیری طرف لے آئے
اس کی چشمِ مست کا شوق خلوت سے ہر زماں
گوشہ گیروں کو بکھری ہوئی دستار کے ساتھ باہر لے آتا ہے
اس اشتیاق کو دیکھ کہ سو چمن کا شکر گذار ہو جاتا ہے
اگر صبا گلزار سے ایک پنکھڑی (بھی) میری طرف لاتی ہے
آہ ان خاموش لبوں کے رنگ کے معجزے سے میرؔ
(کوئی) اگر صورتِ دیوار (بھی) ہو گفتار میں آجائے گا

۲۲۵

پیش از ایں دردِ محبت بیش بود
ہر کجا داغے ست، ایں جا ریش بود
عاقبت دل شد نشانِ تیرِ او
ایں سخن نشنو جہالت کیش بود
دوش وصلِ او میسّر شد ولے
دل ز بےتابی بہ فکرِ خویش بود
وقتِ آخر زیرِ لب فرہاد گفت
کایں محبت بد ستم اندیش بود
عزّتِ مجنوں ضرور افتادہ است
عہدِ او از من دو روزے پیش بود
کار با دنیا و ما فیہا نہ داشت
دیدہ ام من میرؔ را، درویش بود

۲۲۶

ناگہاں کاکلِ صنم ز مقابل وا شد
جلوہ اے در نظر آمد کہ از او دل وا شد
چشمِ خوں بستۂ خود بے تو سحر بکشادم
مژہ ام ہم چو پرِ طائرِ بسمل وا شد
للہ الحمد پۓ جرعۂ مے زاہد را
بر درِ مےکدہ آں عقدِ انامل وا شد
بستنش باز نہ دانم کہ چساں صورت بست
دیدہ اے کاو بہ رخ ہم چو تو قاتل وا شد
روزگارے ست کہ دل قفلِ درِ زندان است
می شدش گاہ در ایامِ اوائل وا شد
آخرالامر دلِ خود بہ گدازے دادم
گرہِ کارِ منِ غم زدہ مشکل وا شد

۲۲۵

اس سے پہلے محبت کا درد بہت تھا
جس جگہ بھی داغ ہے اس جگہ زخم تھا
آخر کار دل اس کے تیر کا نشانہ بن گیا
یہ بات نہ سننے والا نادانی کی خو رکھتا تھا
کل اس کا وصل میسّر ہوا تھا، لیکن
دل بے تابی کے سبب اپنی (ہی) فکر میں تھا
آخر وقت میں فرہاد نے زیرلب کہا
کہ یہ محبت بڑی ظالم تھی
مجنوں کی عزت کرنا لازم ہے
اُس کا عہد مجھ سے دو ایک دن پہلے تھا
دنیا اور مافیہا سے کام نہیں رکھتا تھا
میں نے میرؔ کو دیکھا ہے، درویش تھا

۲۲۶

اولِ صبحِ صادق اچانک ظاہر ہوئی
ایسا جلوہ نظر میں آیا کہ اس سے دل کِھل اٹھا
صبح کو (جب) اپنی خوں بستہ آنکھ تیرے بغیر کھولی
میری مژہ بھی طائرِ بسمل کے پر کی طرح کھلی
للہ الحمد جرعۂ مے کے واسطے زاہد کو
مے کدے کے دروازے پر وہ انگلیوں پر حساب کرنا آ گیا
اس کا پھر بند ہونا میری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح ممکن ہوا
وہ آنکھ جو تیرے جیسے قاتل کے رخ پر کھلی
زمانہ ہو گیا ہے کہ دل قید خانے کے دروازے کا قفل ہے
یوں تھا کہ وہ شروع کے دنوں میں کبھی کھلتا تھا
آخرِ کار میں نے اپنا دل کسی گداز کو دے دیا
مجھ غم زدہ کے مقصد کی گرہ مشکل سے کھلی

تا چہ گویم کہ چہ از دستِ تہی بر من رفت
اندر آں دم کہ بہ پیشم لبِ سائل وا شد
در عزاداریٔ یک خواہشِ مجنوں چوں بید
بارہا موئے سرِ صاحبِ محمل وا شد
حرفِ بےفائدہ میرؔ ز راہم می برد
خوب شد از سرم آں ہادیِ باطل وا شد

۲۲۷

چشمے بہ یک طرف کہ دلم رشک پارہ کرد
روے ترا شگافِ درے گر نظّارہ کرد
پایانِ کار خواہشِ قصاب بچّہ اے
در مسلخم ببرد و سزائے قنارہ کرد
ہر چند بود قطرۂ آبے سرشکِ گرم
چوں بازگشت از مژہ کارِ شرارہ کرد
اے مہ ز جنبشِ دُرِ گوشِ تو فتنہ خاست
در روزگارِ ما چہ قِراں ایں ستارہ کرد
جز بندہ دست در کمرِ او کسے نہ زد
ایں کارِ دست بستہ ہمیں ہیچ کارہ کرد
گفتم کہ پیر گشتہ ام اکنوں کجا روم
قدِ خمیدہ جانبِ خاکم اشارہ کرد
از درہمیِ حالِ فرستادہ ظاہر است
کاں شوخ چشم خطِ مرا پارہ پارہ کرد
کارے نہ کرد در دلِ نرمِ تو ہیچ گاہ
گو نالہ رخنہ در جگرِ سنگِ خارہ کرد

کیا کہوں کہ دستِ تہی سے مجھ پر کیا گزری
اُس وقت جب میرے سامنے لبِ سائل کھلا
مجنوں کی ایک خواہش کے ماتم میں بید کی طرح
بارہا صاحبِ محمل کے سر کے بال کھلے
میرؔ کی بے فائدہ باتیں مجھے راہ سے بھٹکا دیتی ہیں
اچھا ہوا میرے سر پر سے وہ جھوٹا ہدایت کرنے والا ٹلا

۲۲۷

آنکھ تو ایک طرف میرے دل کو رشک نے ٹکڑے (ٹکڑے) کر دیا
تیرے چہرے کا اگر شگافِ در نے (بھی) نظارہ کیا
آخرِ کار ایک قصاب بچّہ کی خواہش
مجھے مسلخ[1] میں لے گئی اور قنارہ[2] کا مستحق بنا دیا
ہر چند کہ گرم آنسو پانی کی بوند تھا
جب پلکوں سے نکلا (اس نے) شرارے کا کام کیا
اے ماہ تیرے کانوں کے موتیوں کی جنبش سے فتنہ اٹھا
ہمارے زمانے میں اس ستارے نے کیا قراں[3] کیا
بندے کے سوا کسی اور نے اس کی کمر میں ہاتھ نہیں ڈالا
یہ دشوار کام اسی ناچیز نے کیا
میں نے کہا کہ بوڑھا ہو گیا ہوں اب کہاں جاؤں
جھکے ہوئے قد نے مجھے خاک کی جانب اشارہ کیا
قاصد کے حال کی پریشانی سے ظاہر ہے
کہ اس شوخ چشم نے میرا خط چاک چاک کر دیا
کبھی بھی تیرے نازک دل پر کوئی اثر نہیں کیا
اگرچہ نالے نے سنگِ خارا کے دل میں شگاف ڈال دیا

---

[1] کھال اتارنے کی جگہ۔
[2] ذبح کیے ہوئے جانور کو لٹکانے کی سلاخ۔
[3] دو ستاروں کا ایک برج میں جمع ہونا۔

شورے ست در زمانہ ز جوشِ سرشکِ من
دریا چہ خوب کرد کہ چندے کنارہ کرد
از ذکرِ تلخ کامی اش اکنوں چہ فائدہ
با زہرِ مرگ دردِ ترا میرؔ چارہ کرد

۲۲۸

چوں تیغِ ناز آں ستم اندیش برکشید
در جیبِ خاک فتنہ سرِ خویش درکشید
اشکم مشابہ است بہ یاقوتِ سوختہ
شاید کہ کارِ سوختگی تا جگر کشید
بر بختِ سبزِ خویشتنش ناز می رسد
آں کس کہ سروِ قامتِ او را بہ بر کشید
پیداست جائے آدمِ خاکی بہ بزمِ قدس
ایں مشتِ خاک تا چہ مقام آہ سر کشید
شعرم بہ طرز بود عجب نیست میرؔ اگر
از خاک برگرفتہ سپہرم بہ زر کشید

۲۲۹

کماں بہ دست چو گیرد جفائے تازہ کند
دچارِ ہر کہ شود یکّہ و جنازہ کند
بہ راہِ تست شب و روز چشمِ گل در باغ
کہ خاکِ پائے تو آرد بہ دست و غازہ کند

۲۳۰

دلبراں جز جفا نمی دانید
راہ و رسمِ وفا نمی دانید

زمانے میں میرے آنسوؤں کے جوش کی شہرت ہے
سمندر نے اچھا کیا کہ کچھ دن کنارہ کرلیا
اس کی تلخ کامی[1] کے ذکر سے اب کیا فائدہ
میرؔ نے موت کے زہر سے تیرے درد کا علاج کرلیا

۲۲۸

جیسے ہی اس ستم اندیش نے تیغِ ناز کھینچی
فتنے نے خاک کے دامن میں اپنا سر چھپالیا
میرا اشک یاقوتِ سوختہ[2] سے مشابہ ہے
شاید کہ جلنے کا کام جگر تک پہنچ گیا
اپنی خوش نصیبی پر ناز کرنے لگتا ہے
جو بھی اُس کے سرو قامت کو آغوش میں کھینچتا ہے
بزمِ قدس میں آدمِ خاکی کی جگہ موجود ہے
اس مشتِ خاک نے آہ کس مقام تک سر کھینچا ہے
میرے شعر ایک خاص انداز کے تھے، عجب نہیں ہے کہ جو میرؔ
آسمان نے مجھے خاک سے اٹھا کر سونے میں تولا

۲۲۹

جب ہاتھ میں کمان پکڑتا ہے تازہ ظلم کرتا ہے
جو بھی سامنے آتا ہے اسے یکّہ وجنازہ[3] کردیتا ہے
باغ میں گل کی آنکھ دن رات تیری راہ پر لگی ہے
کہ تیرے پاؤں کی خاک ہاتھ میں اٹھائے اور (اپنے چہرے کا) غازہ کرے

۲۳۰

دلبر جفا کے سوا کچھ نہیں جانتے
وفا کی راہ ورسم نہیں جانتے

---

[1] ناامیدی۔
[2] سفید یاقوت (یاقوت کو آگ پر رکھنے سے اس کا رنگ عارضی طور پر سفید ہوجاتا ہے)۔
[3] ایسا نشانہ لگانا کہ پڑتے ہی شکار مرجائے۔

آہ او سادہ نیست، پُرکار است
میرؔ صاحب شما نمی دانید

۲۳۱

حدیثِ درد بہ زاہد مگو، نمی داند
ترا ز اشکِ ریائی بہ آب می راند
جہاں کتابِ مصوّر، سپہر صورت خواں
زمانہ اے ست دگر چوں ورق بگرداند

۲۳۲

بر ورق نقّاش مشکل صورتِ دلبر کشید
در خیالِ آں جبیں بسیار دردِ سر کشید

۲۳۳

گرچہ نقشِ گیسوے آں ماہ را مانیؔ کشید
نقشش امّا خوب ننشست و پریشانی کشید

۲۳۴

کے نقشِ ساقِ یار بہ خوبی تواں کشید
نقّاش خوب کرد کہ پا از میاں کشید

۲۳۵

تصویرِ آں دو نرگسِ بیمار می کشند
صورت گراں چنیں عبث آزار می کشند

۲۳۶[1]

گر بے نقاب چہرۂ آں رشکِ مہ شودا

۲۳۷

نالہ ہاے بلبل از شوقِ فراوانِ تو بود
گل کہ از ہم ریخت آں ہم دل پریشانِ تو بود

---

[1] غزل ۲۳۶ ایک شعر پر مشتمل ہے اور مخدوش ہے۔

آہ، وہ سادہ نہیں، پرکار ہے
میؔر صاحب آپ نہیں جانتے

۲۳۱

درد کی باتیں زاہد سے مت کہو، (وہ) نہیں جانتا
تجھے جھوٹے آنسوؤں سے دھوکہ دیتا ہے
دنیا با تصویر کتاب (ہے)، آسماں صورت خواں[1] (ہے)
انقلاب آجاتا ہے جیسے ہی ورق پلٹتا ہے

۲۳۲

کاغذ پر نقاش نے دلبر کی صورت مشکل سے کھینچی
اس پیشانی کے خیال میں بہت دردِ سر برداشت کیا

۲۳۳

اگرچہ اس محبوب کی زلفوں کا مانؔی نے نقش کھینچا
اس کا نقش لیکن ٹھیک نہیں اترا اور (اس نے) پریشانی اٹھائی

۲۳۴

کب یار کی پنڈلی کا نقش اچھی طرح کھینچ سکتے ہیں
نقّاش نے اچھا کیا کہ درمیاں سے پاؤں کھینچ لیا

۲۳۵

ان دو نرگسِ بیمار کی تصویر کھینچتے ہیں
مصوّر یوں عبث آزار کھینچتے ہیں

۲۳۶

اگر اُس رشکِ ماہ کا چہرہ بے نقاب ہوجائے

۲۳۷

بلبل کے نالے تیرے شوقِ فراواں (کی وجہ) سے تھے
گل جو اس کے ساتھ منتشر ہوگیا (وہ بھی) تیری وجہ سے پریشان دل تھا

---

[1] وہ جو بازاروں میں قیامت کے مناظر اور جنت، دوزخ، فرشتوں وغیرہ کی تصویریں دکھا کر حیات بعد موت کے حالات سنائے۔

تا نگاہِ واپسیں ہم دردمندانِ ترا
کاوشے در سینہ از برگشتہ مژگانِ تو بود

۲۳۸

تا متصل ز دیدۂ من خوں نمی رود
از دل بخارِ جورِ تو بیروں نمی رود
ناصح دماغِ خود بہ عبث صرف می کند
مہر از دلم بہ حیلہ و افسوں نمی رود

۲۳۹

دل از بےطاقتی در سینہ خوں شد
دماغے داشتم، صرفِ جنوں شد
بہ پاکاں کار کے گیرد فلک تنگ
کہ عیسیٰ از سرِ سوزن بروں شد

۲۴۰

نے شور بہ سر ماندہ و نے زور بہ پا ماند
از عمر ہمیں حسرت بسیار بجا ماند
زاہد کہ بہ تقوائے تمامے ز جہاں رفت
در رہنِ مےاش خرقہ و تسبیح و ردا ماند
پُرغافلی از وقتِ عزیز آہ وگرنہ
ہر گام در ایں بادیہ یوسف ز تو وا ماند

۲۴۱

شد آں عہدے کہ می گفتم ز چشمم آب می ریزد
کنوں زیں رخنہ چشمہ چشمہ خونِ ناب می ریزد
شبم را روز کن ساقی بہ یک افشاندنِ دستے
ز چاکِ آستینت پرتوِ مہتاب می ریزد

نگاہِ واپسیں تک (بھی) تیرے دردمندوں کے
سینے میں تیری پھری ہوئی پلکوں کی ایک خلش تھی

۲۳۸

جب تک میری آنکھوں سے مسلسل خوں نہیں بہتا
دل سے تیرے ظلم کا غصّہ نہیں جاتا
ناصح اپنا دماغ بے کار خرچ کر رہا ہے
میرے دل سے محبت حیلہ اور افسوں سے نہیں جا سکتی

۲۳۹

دل بے طاقتی سے سینے میں خوں ہو گیا
دماغ رکھتا تھا، جنوں میں خرچ ہو گیا
پاک لوگوں کا راستہ فلک کب تنگ کرتا ہے
کہ عیسیٰ سرِ سوزن سے باہر آ گیا

۲۴۰

نہ سر میں شور باقی رہا نہ پیروں میں طاقت باقی رہی
زندگی میں یہی بے انتہا حسرت بچی رہ گئی ہے
زاہد کہ تمام تقوے کے ساتھ جہاں سے چلا گیا
اس کا خرقہ اور تسبیح اور چادر شراب (کے عوض) رہن رہ گئے
(تو) وقتِ عزیز سے آہ بہت غافل ہے وگرنہ
اس بیابان میں ہر قدم پر یوسف تجھ سے چھوٹا جا رہا ہے

۲۴۱

وہ وقت گزر گیا کہ میں کہتا تھا، میری آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے
اب اس رخنے سے چشمہ کے آنسو بہہ رہے ہیں
میری رات کو ساقی ہاتھ کی ایک جنبش سے دن کر دے
تیری آستین کے چاک سے پرتوِ مہتاب چھن رہا ہے

۲۴۲

کدام دل شدہ شب در خروش می آید
کہ شورِ سینہ خراشی بہ گوش می آید
ز میرؔ نیست عجب پائمالِ غم گشتن
تو ہر چہ گوئی از آں سرفروش می آید

۲۴۳

بس کہ در ہر کوچہ از جورِ کسے بیداد شد
عاقبت شہرِ جہاں آباد، جورآباد شد
من نیَم تنہا پریشاں حال مثلِ گردباد
در ہوائے گیسوئے او عالمے برباد شد
آخر اے کافر ز طورِ چشمِ مستی شیوہ ات
کعبہ ویراں گشتہ و بت خانہ اے آباد شد

۲۴۴

طرزِ دیدن ہوش از سر، طاقت از پا می برد
جنبشِ مژگانِ شوخش دَق ز دل ہا می برد
گر بہ قربانِ سراپایش رود دشمن بجاست
دوستاں، ہر جائے خوبِ او دل از جا می برد

۲۴۵

غمش تا درِ ایں دلِ تنگ زد
سرشکم بہ مژگاں دم از رنگ زد
تنک آب بودہ ست معذور دار
اگر کوہکن سنگ بر سنگ زد

۲۴۲

کون عاشق رات کو فریاد کرتا ہے
کہ سینہ خراشی کا شور کانوں میں پڑتا ہے
میرؔ سے عجب نہیں کہ غم سے پائمال ہو جائے
تو جو کچھ کہتا ہے، وہ سرفروش کر سکتا ہے

۲۴۳

بس کہ ہر کوچے میں کسی کے ظلم سے بیداد تھی
آخرکار جہاں آباد[1] کا شہر جور آباد[2] ہو گیا
میں ہی گردباد کی طرح تنہا پریشاں حال نہیں ہوں
اس کی زلفوں کی آرزو میں ایک دنیا برباد ہو گئی
آخر اے کافر تیری مستی شیوہ آنکھوں کے انداز سے
کعبہ ویران ہو گیا اور بت خانہ آباد ہو گیا

۲۴۴

دیکھنے کے انداز نے سر سے ہوش، پاؤں سے طاقت چھین لی
اس کی شوخ پلکوں کا جھپکنا دلوں سے ملال لے گیا
اگر دشمن اس کے سراپا پر قربان ہوتا ہے درست ہے
دوستو، اس کا ہر حسین عضو دل کو (اپنی) جگہ سے (اڑا) لے جاتا ہے

۲۴۵

اس کے غم نے جب اس دلِ تنگ کے دروازے پر دستک دی
میرے آنسو خون بن کر پلکوں پر ٹھہر گئے
(وہ) کم ظرف تھا، (اُسے) معاف کر دیں
اگر کوہکن نے پتھر پر پتھر مارا[3]

---

[1] دلی۔
[2] ظلم آباد۔
[3] معمولی سے کام کو زور و شور کے ساتھ انجام دیا۔

۲۴۶

خاکِ زیرِ قدمت خلق تمنّا دارد
خوں اگر بر سرِ ایں خاک شود جا دارد

۲۴۷

از ورد سحرگاہ نہ شد خاطرِ من شاد
صد عقدہ چو تسبیح بہ کارِ دلم افتاد

۲۴۸

او چہ داند کہ ز ما نالہ عجب می داند
نوحہ و زاریِ ما را دلِ شب می داند

۲۴۹

لالہ از خاک و گل از شاخ بروں می آید
مژدہ اے عقل کہ ہنگامِ جنوں می آید
ہر دم از دیدۂ تر لجۂ خوں می آید
از تہِ پردۂ دل تا چہ بروں می آید

۲۵۰

امشب کہ در کنارِ من آں کامِ جان نہ بود
حالے گذشتہ است کہ جاں درمیان نہ بود

۲۵۱

دی پرتوِ رخسارِ تو در جلوہ گری بود
آئینہ خورشید چراغِ سحری بود

۲۵۲

کے بدیں گونہ کسے طرزِ جفا می داند
کافرے چوں تو نہ دیدیم، خدا می داند

۲۵۳

با من آں رشکِ ماہ صاف نہ شد
جرمِ ناکردہ ام معاف نہ شد

۲۴۶

خلق تیرے قدموں کے نیچے کی خاک کی تمنا رکھتی ہے
اگر اس خاک کے لیے خوں ریزی ہو جائے، بجا ہے

۲۴۷

صبح کے وظیفے سے میری طبیعت خوش نہیں ہوئی
تسبیح کی طرح دل کے مقصد کے حصول میں سوگرہیں پڑ گئیں

۲۴۸

اسے کیا خبر جو ہمارے نالہ کرنے پر تعجب کرتا ہے
ہمارے نوحے اور رونے سے آدھی رات (کا وقت) باخبر ہے

۲۴۹

خاک سے لالہ اور شاخ سے گل باہر نکل رہا ہے
اے عقل مژدہ ہو کہ جنوں کا زمانہ آ رہا ہے
ہر وقت دیدۂ تر میں خون کا بھنور بن رہا ہے
دل کے پردے کے اندر سے کیا کیا کچھ باہر آئے گا

۲۵۰

آج رات کہ میری آغوش میں وہ آرزوئے جاں نہیں تھا
وہ حال گزرا ہے کہ جان درمیان (میں) نہیں تھی

۲۵۱

کل (جب) تیرے رخسار کا پرتو جلوہ گری کر رہا تھا
خورشید کا آئینہ چراغِ سحری تھا

۲۵۲

کب کوئی جفا کے اتنے طریقے جانتا ہے
(ہم نے) تجھ جیسا کافر نہیں دیکھا، خدا جانتا ہے

۲۵۳

مجھ سے اس رشکِ ماہ کی کدورت نہیں گئی
میرا ناکردہ جرم معاف نہیں ہوا

۲۵۴

شب نالۂ من گوش زدِ مرغِ چمن شد
ہنگامہ ز بےخوابیِ او بر سرِ من شد

۲۵۵

نے محوِ روئے او شد نے از لبش تر آمد
بے چشم و رو گلِ تر از آب بد برآمد

۲۵۶

بر سرِ من از جنوں ہنگامہ اے برپا نمود
آسمانِ بےتمیز آخر مرا رسوا نمود

۲۵۷

گر چہ در نقشِ خطش اعجازِ عیسیٰ می کنند
لیکن ایں صورت گراں صورت نویسی می کنند

۲۵۸

از کعبہ میرؔ راہ بروں کس چرا برد
لیکن تو قصدِ بت کدہ داری، خدا برد

۲۵۹

بہ من چو غیر بہ راہِ تو پائے بردارد
مرا خدا برد او را خدائے بردارد

۲۶۰

تماشا کرد ہر کس جرأتِ من سخت حیراں شد
بہ حدّے زخم ہا خوردم کہ آں شمشیر خنداں شد
نصیبِ کس نہ گردد در جہاں یارب دلِ تنگے
ز آبادی بہ صحرا رفتم، آں ہمہ رشکِ زنداں شد
قدِ من تا دوتا شد از نسیمے رنگ می بازد
بہ پیری پرتوِ عمرم چراغِ زیرِ داماں شد

۲۵۴

رات میرا نالہ مرغِ چمن کے کانوں تک پہنچا
اس کی بے خوابی سے (ہونے والا) ہنگامہ میرے سر آیا

۲۵۵

نہ (تو) اس کے چہرے میں محو ہوا، نہ اس کے ہونٹوں کے سامنے شرمندہ ہوا
حیا اور شرم کے بغیر گلِ تر (گویا) کیچڑ سے نکلا

۲۵۶

میرے سر پر جنوں سے ایک ہنگامہ برپا کر دیا
بے لحاظ آسمان نے آخر مجھے رسوا کر دیا

۲۵۷

اگرچہ تیرے خط کی تصویر بنانے میں عیسیٰ کا معجزہ دکھاتے ہیں
لیکن یہ صورت گر (محض) صورت نویسی[1] کرتے ہیں

۲۵۸

کعبے سے میرؔ کوئی کیوں باہر جانے کی راہ لے گا
لیکن تو بت کدے کا قصد رکھتا ہے، خدا لے جائے

۲۵۹

میرے ساتھ جب غیر تیری راہ میں قدم اٹھائے
مجھے خدا پہنچائے، اسے خدا اٹھالے

۲۶۰

جس نے میری جرأت دیکھی سخت حیران ہوا
(میں نے) اس حد تک زخم کھائے کہ اس شمشیر میں دندانے نکل آئے
یارب دنیا میں دلِ تنگ کسی کا نصیب نہ ہو
آبادی سے صحرا میں چلا گیا وہ بھی رشکِ زنداں ہو گیا
جب سے میرا قد دوہرا ہوا ہے نسیم سے (بھی میرا) رنگ اڑ جاتا ہے
بڑھاپے میں میری عمر کا سایہ چراغِ زیرِ داماں ہو گیا ہے

---

[1] مطلب سمجھے بغیر نقل کر دینا۔

۲۶۱

از تعلّق در جہاں پایم بہ گِل اے میرؔ بود
خاکِ ایں صحرائے دل کش سخت دامن گیر بود
برمدار ایں مشتِ خاکستر بہ دستِ کم صبا
صحبتم با آتشیں رویاں لبے درگیر بود
کس نیامد بر سرِ نعشم کہ زیرِ لب نہ گفت
کایں جوانِ جملہ خواہش، محض بے تقصیر بود

۲۶۲

چشمِ دل چوں بہ ثباتِ کمِ دنیا افتاد
ایں عمارت ہمہ از طاقِ دلِ ما افتاد
گفتم آں آتشِ سوزانِ سرِ طور چہ شد
دل اشارت بہ جگر کرد کہ ایں جا افتاد

۲۶۳

از لوثِ کبر صاف دلاں پاک بودہ اند
مردانِ ایں طریق ہمہ خاک بودہ اند
ایں غنچہ ہاے گل کہ کلہ کج نہادہ اند
خوبانِ نازپیشہ و بے باک بودہ اند
ایں چشمہ ہا کہ از دلِ خاک اند جوش زن
چشمانِ عاشقانِ الم ناک بودہ اند

۲۶۴

بہ گوشِ اہلِ دل آوازۂ ہوس نہ رسد
بہ وادی اے کہ منم، نالۂ جرس نہ رسد
ز بے وفائی گاذر پسر سخن چہ کنم
زمانہ اے ست کہ صابونِ کس بہ کس نہ رسد

۲۶۱

تعلق کی وجہ سے جہاں میں اے میرؔ پا بہ گِل رہا تھا
اس دل کش صحرا کی خاک دامن کو بہت زیادہ کھینچنے والی تھی
(اے) صبا اس مشتِ خاکستر کو تنگ ہاتھوں سے مت اٹھا
آتشیں رویوں کے ساتھ میری صحبت بہت ناموافق (رہی) تھی
(ایسا) کوئی میرے جنازے پر نہیں آیا کہ (جس نے) زیرِ لب (یہ) نہیں کہا
کہ یہ سرتاپا خواہش جوان بالکل بے قصور تھا

۲۶۲

دل کی آنکھ جب دنیا کی ناپائیداری پر پڑی
یہ تمام عمارت ہمارے دل کے طاق سے گر گئی
میں نے کہا وہ سرِطور کی آتشِ سوزاں کیا ہوئی
دل نے جگر کی طرف اشارہ کیا کہ اس جگہ آ گئی

۲۶۳

صاف دل والے تکبّر کی آلودگی سے پاک رہے ہیں
اس مسلک کے لوگ تمام خاک ہو رہے ہیں
یہ پھولوں کے غنچے کہ کلاہ کو ٹیڑھی رکھے ہوئے ہیں
ناز پیشہ اور بے باک معشوق ہوا کرتے تھے
یہ چشمے کہ خاک کے دل سے ابل رہے ہیں
الم ناک عاشقوں کی آنکھیں ہوا کرتے تھے

۲۶۴

اہل دل کے کانوں میں ہوس کی آواز نہیں پہنچتی
میں جس وادی میں ہوں (وہاں) جرس کی آواز نہیں پہنچتی
گاذر پسر[1] کی بے وفائی کا کیا بیان کروں
زمانہ ہو گیا کہ کسی کا صابن کسی تک نہیں پہنچا[2]

---

[1] دھوبی کا لڑکا۔
[2] ایک دوسرے کے کام نہیں آئے۔

۲۶۵

در باغ چوں بہ ناز قد آں نازنیں کشید
شمشادِ نازپیشہ الف بر زمیں کشید
بے روئے او گریستنِ میرؔ کم نہ شد
بر چشمِ تر اگرچہ بسے آستیں کشید

۲۶۶

قطرۂ آب کہ دوش از سرِ مژگاں افتاد
آتشے بود کہ در گوشۂ داماں افتاد
وجعِ اسناں پۓ خوں خوردنِ ما می میرد
غالباً چاشنی اش در بُنِ دنداں افتاد

۲۶۷

سرم زیں پیش خاکِ پائے او بود
ہمیں ویرانۂ دل جائے او بود
بہ صد خوبی گل آمد پیش لیکن
مرا بے تو کجا پروائے او بود

۲۶۸

شد داغِ دل سیاہ ، ببینم چہ می شود
تا موسمِ گل آہ، ببینم چہ می شود
صعب است راہِ دورِ جدائی اگرچہ لیک
پا می نہم بہ راہ، ببینم چہ می شود

۲۶۹

شورِ عشقِ ایں چمن آناں کہ در سر داشتند
ہر سحر مانندِ شبنم دیدۂ تر داشتند
از چمن بگذر کہ گل ہا جملہ تن گردیدہ چشم
بر امیدِ دیدنت از خاک سر بر داشتند

۲۶۵

باغ میں جب اس نازنین نے ناز سے قد کھینچا
ناز پیشہ شمشاد شرمندہ ہو گیا
اس کو دیکھے بغیر میرؔ کا رونا کم نہیں ہوا
اگرچہ بہت دلاسا دیا

۲۶۶

پانی کی بوند کہ کل پلکوں سے گری
ایک آگ تھی کہ گوشۂ داماں پر گری
دانتوں کا درد میرا خوں پینے کے لیے مرا جا رہا ہے
غالباً اس کی چاشنی دانتوں کی جڑ تک پہنچ گئی ہے

۲۶۷

میرا سر اس سے پہلے اس کی خاکِ پا تھا
یہی دل کا ویرانہ اس کا مقام تھا
گل سو خوبی کے ساتھ پیش آیا، لیکن
مجھے تیرے بغیر اس کی پروا کب تھی

۲۶۸

داغِ دل سیاہ ہو گیا دیکھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے
موسم گل تک آہ، دیکھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے
جدائی کی دور دراز راہ اگرچہ مشکل ہے، لیکن
راستے میں قدم رکھتا ہوں، دیکھتا ہوں کہ کیا ہوتا ہے

۲۶۹

وہ جو اس چمن کا جنوں سر میں رکھتے ہیں
ہر سحر شبنم کی طرح دیدۂ تر رکھتے ہیں
چمن سے گزر کہ پھول ہمہ تن آنکھ بن کر
تیرے دیکھنے کی امید میں خاک سے سر اٹھائے ہوئے ہیں

۲۷۰

گل بر گلِ رخسارت چوں مہ نظرے دارد
سنبل بہ سرِ زلفت چوں مشک سرے دارد

۲۷۱

اگر بہ ترکِ ہوس دل نہاد جا دارد
ستم رسیدۂ عشقِ تو دل کجا دارد
ہزار بار بہ بزمِ تو آمدم، رفتم
کسے نہ گفت کہ مسکیں چہ مدّعا دارد

۲۷۲

حذر از دردمندے کن کہ محزوں نالہ اے دارد
بہ دنبالِ شکایت از جگر پر کالہ اسے دارد
مکن ایں ہا کہ ناکام از سرِ کویت رواں گردم
نگاہِ یاسِ نومیداں بلا دنبالہ اے دارد

۲۷۳

عشق دل را بیشتر رو می دہد
بدبلا را آہ پہلو می دہد
آں چہ از انداز معلوم است میرؔ
سنبلِ تر خط بہ آں مو می دہد

۲۷۴

دل ملاقاتِ بت سیم برے می خواہد
خبرش نیست کہ ایں کار زرے می خواہد
نگذری تا ز سرِ خویش قدم مگذاری
رفتنِ راہ محبت جگرے می خواہد

۲۷۵

در روزِ جزایم چو بہ ایں طور در آرند
اعمال نہ دانم چہ قیامت بہ سر آرند

۲۷۰

گل تیرے چاند جیسے رخسار پر نظر رکھتا ہے
سنبل تیری مشک جیسی زلفوں کی خواہش رکھتی ہے

۲۷۱

شاید ترکِ ہوس کا ارادہ دل میں جگہ بنا لے
(لیکن) تیرے عشق کے ستم رسیدہ کے پاس دل کہاں ہے
(میں) ہزار بار تیری بزم میں آیا گیا
کسی نے نہیں پوچھا کہ (یہ) غریب کیا مدعا رکھتا ہے

۲۷۲

(اس) دردمند سے ڈر کہ (یہ) غم زدہ فریاد کرتا ہے
فریاد کے پیچھے پیچھے (اس نے) جگر کا ٹکڑا (بھی) لگا دیا ہے
ایسا نہ کر کہ تیرے کوچے سے ناکام روانہ ہو جاؤں
ناامیدوں کی حسرت کی نگاہ برے عواقب رکھتی ہے

۲۷۳

عشق دل کی طرف زیادہ متوجہ ہوتا ہے
افسوس کہ بلائے بد کی پشت پناہی کرتا ہے
انداز سے کچھ یوں معلوم ہوتا ہے میرؔ
(کہ) سنبلِ تر ان زلفوں کی خوبی کا اعتراف کرتا ہے

۲۷۴

دل چاندی جیسے بدن والے محبوب سے ملاقات چاہتا ہے
اس کو خبر نہیں کہ اس کام کے لیے زر چاہیے
جب تک کہ اپنے سر سے نہ گزر جا، قدم مت رکھ
محبت کے راستے پر چلنے کے لیے حوصلہ چاہیے ہے

۲۷۵

روزِ جزا جو مجھے اگر اس طور سے لائیں گے
مجھے نہیں معلوم (میرے) اعمال (میرے) سر پر کیا قیامت ڈھائیں گے

آں رفت کہ از بہرِ تماشائے تو خوش بود
ایں رخنہ کہ داریم بہ دل کاش بر آرند

۲۷۶

ہر کس کہ بہ عشقِ تو سرے داشتہ باشد
داغِ جگرے، چشمِ ترے داشتہ باشد
برخیز و بہ دامانِ نسیمِ سحر آویز
شاید کہ از آں گل خبرے داشتہ باشد

۲۷۷

شب ابرے کہ بر عالمِ خاک بود
نظرکردۂ چشمِ نم ناک بود

۲۷۸

سیلِ دگر بہ سنگ[1]

۲۷۹

بوالہوس را تابِ ایں جور و ستمگاری نہ بود
آں چناں رفت از سرِ کویش کہ پنداری نہ بود
در جہاں محشر بپا کردیم و لب بستیم میرؔ
بیش از ایں ما را دماغِ نالہ و زاری نہ بود

۲۸۰

کے بہ دام آیند ہر دم در کمینِ فرصت اند
چوں غزال ایں شوخ چشماں برّہ بندِ وحشت اند
داغ ہا دارم ز بزم آرائیِ خوباں بہ دل
با کس و ناکس بسانِ شمع گرمِ صحبت اند
از برائے دلبراں صاحب دلاں جاں می دہند
حسنِ معنی آشنایاں رفتگانِ صورت اند

---

[1] غزل ۲۷۸ ایک شعر پر مشتمل ہے اور مخدوش ہے۔

وہ (وقت) گزر گیا کہ تجھے دیکھنے کے لیے مناسب تھا
اس رخنے کو جو ہمارے دل میں ہے کاش بند کر دیا جائے

۲۷۶

جو بھی تیرے عشق سے تعلق رکھتا ہوگا
داغِ جگر، چشمِ تر رکھتا ہوگا
اٹھ اور نسیم سحر کے دامن کے ساتھ لپٹ
شاید کہ اسے اس گل کی خبر ہو

۲۷۷

رات جو بادل عالمِ خاک پر تھا
چشمِ نمناک کا تربیت یافتہ تھا

۲۷۸

دوسرا سیلاب پتھر سے ...

۲۷۹

بوالہوس کو اس ظلم اور ستم کی برداشت نہیں تھی
اس کے کوچے سے اس طرح گیا کہ تو گمان کرے کہ (کبھی) تھا (ہی) نہیں
میرؔ ہم نے جہاں میں محشر بپا کیا اور ہونٹ سی لیے
اس سے زیادہ ہمیں نالہ وزاری کی طاقت نہیں تھی

۲۸۰

(یہ) کب دام میں آتے ہیں، ہر دم موقع کی گھات میں ہیں
غزالوں کی طرح یہ شوخ چشم وحشت کرنے میں ماہر ہیں
دل پر خوباں کی بزم آرائیوں سے بہت سے داغ رکھتا ہوں
(کہ وہ) ہر کس و ناکس سے شمع کی طرح گرمِ صحبت ہیں
دلبروں کے لیے صاحبِ دل جان دے دیتے ہیں
حسنِ معنی کے آشنا، صورت کے مارے ہوئے ہیں

تیغ بر کیف می رسی و بر نمی دارند سر
ناتوانانِ محبت زیرِ بارِ منّت اند
در تن اکنوں نیست غیر از استخوانے چند و پوست
میرؔ صاحب را کہ می بینم، تمامی عبرت اند

۲۸۱

کہ گفتہ بود بہ سویم گہے قدم مگذار
امیدہاست مرا، ناامید ہم مگذار
ز تیغِ نازِ تو سہل است خونِ مشتاقاں
تو ترکِ جور مکن، شیوۂ ستم مگذار
بیا بیا و ز خاک مذّلتم برگیر
بسانِ نقشِ قدم چشم بر رہم مگذار
بہ از سخن بہ جہاں یادبودِ آدم نیست
ز دستِ خویش دمے کاغذ و قلم مگذار
ز گریہ میرؔ ببیں کارِ ابر بالا شد
تو نیز گوشۂ دامانِ چشمِ نم مگذار

۲۸۲

رحمے بکن تا کے ستم آخر جفاکار ایں قدر
یک سینہ و زخم ایں ہمہ، یک جان و آزار ایں قدر
با ایں متاعِ دلبری ظالم مناسب نیستت
گردیدنِ بےگاہ و گہ در کوے و بازار ایں قدر
اےگردِ سرگردم ترا از دل چو پا بیروں نہی
در چشم ہم یک رہ بیا، رہ نیست دشوار ایں قدر
از دیدنے بفریبدم وز گفتنے بشکیبدم
من سادہ و ابلہ چنیں، او شوخ و پُرکار ایں قدر
میرؔ ایں معیشت تا بہ کے، پیدا کن اندک غیرتے
خواہش ترا ایں مرتبہ، او از تو بیزار ایں قدر

تو ہاتھ میں تیغ لیے آیا ہے اور (اُن کے جسموں پر) سر نہیں
محبت کے ناتواں احسان کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں
تن میں اب چند ہڈیوں اور کھال کے سوا (کچھ) نہیں ہے
میرؔ صاحب کو جو میں دیکھتا ہوں تمام عبرت ہیں

۲۸۱

کس نے کہا تھا کہ میری طرف کبھی قدم مت رکھ
مجھے بہت سی امیدیں ہیں، (تُو) مجھے ناامید تو مت چھوڑ
تیری تیغِ ناز پر مشتاقوں کا خوں سہل ہے
تو جور کو ترک مت کر، ستم کا شیوہ مت چھوڑ
آ، آ جا اور مجھے خاکِ مذلت سے اٹھا
نقشِ قدم کی طرح مجھے راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے مت چھوڑ
سخن سے بہتر دنیا میں انسان کی نشانی نہیں ہے
اپنے ہاتھ سے دم بھر کے لیے بھی کاغذ اور قلم کو مت چھوڑ
میرؔ گریہ سے دیکھ ابر کا مقام بلند ہو گیا
تو بھی چشمِ نم کے دامن کے گوشہ کو مت چھوڑ

۲۸۲

(اے) جفا کار کچھ رحم، آخر کب تک اس قدر ستم
ایک سینہ اور اتنے زخم، ایک جان اور اس قدر آزار
اس متاعِ دلبری کے ساتھ ظالم تجھے مناسب نہیں ہے
گاہ و بے گاہ کوچہ و بازار میں اس قدر پھرنا
اے تیرے سر کے گرد گھوموں، دل سے جب پیر باہر رکھ
آنکھوں میں بھی ایک بار آ، راہ اتنی دشوار نہیں ہے
دیکھنے سے مجھے فریب دیتا ہے اور باتوں سے مجھے تسلی دیتا ہے
میں سادہ اور نادان اتنا، وہ شوخ اور پرکار اس قدر
میرؔ ایسی زندگی کب تک، تھوڑی غیرت پیدا کر
تجھے اس درجہ خواہش، وہ تجھ سے اس قدر بیزار

۲۸۳

داغِ دل شد سیاه آخرِ کار
سوختم بے تو آہ آخرِ کار
فکرِ زادے بکن کہ تا نہ شوی
ہم چو من خرجِ راہ آخرِ کار
شد تلف مفت جانِ نومیدم
بر امیدِ نگاہ آخرِ کار
سنگِ آں آستانہ گم گردید
از ہجومِ جباہ آخرِ کار
بردہ از راہ تنگ پوشِ مرا
جامۂ راہ راہ آخرِ کار
تیرہ شد روزگار در چشمم
بے تو اے رشکِ ماہ آخرِ کار
برد آوازۂ خراباتم
رونقِ خانقاہ آخرِ کار
میرؔ در بزمِ ما شراب کشاں
شیخ شد دستگاہ آخرِ کار

۲۸۴

بے تو دل دردناک شد آخر
وز تپش سینہ چاک شد آخر
در غمِ آں جوانِ خوش پُرکار
کشتیِ بندہ پاک شد آخر
عشق یارب چہ داشت با فرہاد
آں بلاکش ہلاک شد آخر

۲۸۳

دل کا داغ آخرِ کار سیاہ ہو گیا
تیرے بغیر آہ میں جل کر رہ گیا
زادِ راہ کی فکر کر کہ تو آخرِ کار
میری طرح راہ میں نہ مارا جائے
میری نا امید جان مفت میں برباد ہوئی
ایک نگاہ کی امید میں آخرِ کار
اس آستاں کا پتھر گم ہو گیا
جبینوں کے ہجوم سے آخرِ کار
میرے تنگ پوش کو راہ سے بھٹکا دیا
راہ راہ[1] پوشاک نے آخرِ کار
میری نظر میں دنیا اندھیر ہو گئی
تیرے چہرے کے بغیر اے رشکِ ماہ آخرِ کار
میری خرابات کی شہرت نے
خانقاہ کی رونق اڑا دی، آخرِ کار
میرے ہم شراب نوشوں کی بزم میں
شیخ آخر کار مذاق کا نشانہ بن گیا

۲۸۴

تیرے بغیر دل آخر درد سے بھر آیا
اور تپش سے سینہ چاک ہو گیا
اس نہایت عیار جوان کے غم میں
آخر بندے کا کام تمام ہو گیا
عشق کو یارب فرہاد سے کیا کد تھی
وہ مصیبت اٹھانے والا آخر ہلاک ہو گیا

---

[1] دھاری دار۔

جستجو بیش از ایں نمی باشد
در رہش میرؔ خاک شد آخر

۲۸۵

نہ شد شورِ مزاج امسال از تدبیر ہم آخر
گسست از وحشتِ بسیارِ من زنجیر ہم آخر
نمی بائیست ایں ساں پنجہ در خونم فرو بردن
ز آدم می شود اے بےوفا تقصیر ہم آخر
بہ ایں وحشی غزالاں بےمحابا عشق می بازد
بیاباں مرگ خواہد شد چو مجنوں میرؔ ہم آخر

۲۸۶

بلبلے در باغ می نالید زار
ناگہاں افتاد آں سویم گذار
رفتم و پرسیدمش احوال چیست
از دلت آخر چہ شد صبر و قرار
وجہِ نالیدن نہ شد معلوم ہیچ
نالہ عاشق می کند در ہجرِ یار
ایں زماں گل گل چمن بشگفتہ است
سیر دارد جلوۂ فصلِ بہار
شعرہاے میرؔ اگر داری بہ یاد
خوش بخواں و یک دو دم را خوش برآر
گفت بر گل نیست ہرگز اعتماد
یاد دارم صحبتِ درگیرِ یار
وا شدے می داشت با من صبح و شام
لحظہ لحظہ می کشیدم در کنار
از نظر یک دم نہ رفتے روئے او
دیدنی بودہ ست رنگِ اعتبار

جستجو اس سے زیادہ نہیں ہوتی
اس کی راہ میں میرؔ آخر خاک ہو گیا

۲۸۵

اس سال طبیعت کا جنوں تدبیر سے بھی آخر نہیں گیا
میری بہت زیادہ وحشت سے زنجیر بھی آخر ٹوٹ گئی
میرے خون میں اس طرح ہاتھ نہیں ڈبونا چاہیے
اے بے وفا، انسان سے آخر تقصیر بھی ہو جاتی ہے
ان وحشی غزالوں سے بے کھٹکے عشق بازی کرتا ہے
مجنوں کی طرح میرؔ بھی آخر کار بیاباں میں مر جائے گا

۲۸۶

باغ میں ایک بلبل بری طرح نالہ کر رہا تھا
اچانک میرا گزر اس کی طرف ہوا
گیا اور اس سے پوچھا کیا حال ہے
تیرے دل سے صبر و قرار کہاں گیا
رونے کی وجہ کچھ معلوم نہیں ہوئی
عاشق یار کے ہجر میں نالہ کرتا ہے
ان دنوں چمن میں رنگ برنگ پھول کھلے ہیں
فصلِ بہار کا جلوہ سیر کے قابل ہے
اگر میرؔ کے شعر کو یاد کر لے
(تو) اچھی طرح پڑھ اور دو چار لمحات اچھے گزار
کہا گل پر ہرگز اعتماد نہیں ہے
یار کی موافق صحبت کو یاد کرتا ہوں
مجھ سے صبح اور شام تپاک سے ملتا تھا
لحظہ لحظہ آغوش میں کھینچتا تھا
اس کا چہرہ ایک پل کے لیے نظر سے اوجھل نہیں ہوتا تھا
اعتماد کا رنگ دیکھنے کے لائق رہا ہے

سر بہ زیرِ بال بردم یک شبے
صبح با پائیز گردیدم دچار
بادِ دل کش گشتہ ریحِ عاصفے
زد بہ جرأت مہرگاں دستے بہ کار
شاخ عریاں بودہ ہر نوبادہ اے
در تنہ خواری درختِ سایہ دار
غنچہ از جائے کہ چشمک می زدے
سر بروں آورد از آں جا نوکِ خار
از روش ہا بادگرد انگیختہ
شد چمن صحرائے پُر گرد و غبار
والہے کاو دیدہ باشد ایں چنیں
ہست در بے طاقتی بے اختیار
من نہ دارم رنگ از گلزارِ حسن
داغ ہا بر سینہ دارم بے شمار
ایں بگفت و نالہ از دل برکشید
داد با آں نالہ جانِ مستعار
او ز ہم بگذشت و من رفتم ز خویش
از ہلاکِ او گرفتم اعتبار

۲۸۷

مشو غافل، اوقات را در نظر دار
کہ وقت است چوں سیف قاطع، خبردار
نہ رفتے ز جا گر ہمہ خوں شدہ ستے
دلے داشتم در غم او جگردار
بہ ہر صبح تا کے دعاہا نمائیم
از ایں ہا بباید شدن دست بردار

ایک رات میں نے سر پروں میں چھپایا تھا
(کہ) صبح کو خزاں کا سامنا ہوا
دل کش ہوا ریحِ عاصفہ[۱] بن گئی
خزاں نے بڑھ کر گلشن کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا
ہر نئے پودے کی شاخ عریاں تھی
سایہ دار درخت غم میں گھل رہے تھے
غنچہ جس جگہ سے اشارہ کرتا تھا
اس جگہ سے نوکِ خار نے سر باہر نکالا تھا
روشوں سے گرد باد اٹھتا تھا
چمن گرد و غبار سے اٹا ہوا صحرا بن گیا تھا
ایسا عاشق جس نے کہ یہ سب دیکھا ہو
اپنی بے غم سے رونے میں بے اختیار ہے
میں حسن کے گلزار سے بہرہ ور نہیں ہوں
میرے سینے پر بے شمار داغ ہیں
یہ کہا اور دل سے نالہ کھینچا
اس نالے کے ساتھ جان مستعار دے دی
وہ خود مر گیا اور میں اپنے آپ سے گزر گیا
اس کے ہلاک ہونے سے میں نے عبرت پکڑی

۲۸۷

غافل مت رہ وقت کو نظر میں رکھ
کہ وقت تلوار کی طرح کاٹنے والا ہے، خبردار رہ
اپنی جگہ سے نہیں ہلا اگرچہ تمام خون ہو گیا
میں اس کے غم میں حوصلہ مند دل رکھتا تھا
ہر صبح کو کب تک دعائیں کرتے رہیں
ان سب سے دست بردار ہو جانا چاہیے

---

۱ سخت آندھی۔

جگر داغ و دل خوں، دماغم پریشاں
تلف مفت گشتند ایں ہر سہ سردار
چساں میرؔ بلبل ز گل کام گیرد
کہ کام است مشکل ز معشوقِ زردار

۲۸۸

سال ہا بگریست بے تو دیدۂ من زار زار
در گریبانم رگِ ابر است اکنوں تار تار
کار ضائع کرد و در عالم مرا رسوا نمود
سوئے او از شوقِ مفرط رفتنِ من بار بار
بےدماغ از دعویِ خوبیِٔ سرو و گل مشو
می زنند از بےتہی ایں یک دو ناکس چار چار
عاشق ام خواہم بجائے قول ایماں ہم ز شوق
از زبانِ من دمِ آخر بیاید : ''یار یار''
میرؔ را تنہا نہ کشتہ‌ست اشتیاقِ آں مژہ
عالمے با خود بہ زیرِ خاک برد ایں خارخار

۲۸۹

ناتوانی با بتانِ سادہ اے دل کار دار
سبحہ‌خوانی را دعا می گوے چوں زنار دار
دل بہ ایں کافر بتاں ہر گاہ و بےگہ کار دار
سبحہ را باید ز دست افگند چوں زنار دار
ثمرۂ ناسازیٔ طبعِ خشن تنہائی است
رو نمی آرد کسے سوئے درختِ خاردار
جمع کن دل از حیاتِ دردمندانِ وفا
نے دوائے درمیان و نے کسے بیماردار
از شکم‌دارانِ دنیا نیست حاصل جز گزند
مار می زایند اکثر ایں زنانِ باردار

جگر داغ، دل خون اور میرا دماغ پریشان
یہ تینوں سردار مفت میں مارے گئے
کس طرح میرؔ بلبل گل سے اپنی مراد حاصل کرے
کہ زردار معشوق سے مراد حاصل کرنا دشوار ہے

۲۸۸

سالہا تیرے بغیر میری آنکھیں زار زار روئیں
میرے گریباں میں بادل کی دھاری اب بھی تار تار ہے
کام بگاڑ دیا اور دنیا میں مجھے رسوا کر دکھایا
اس کی طرف شوق کی زیادتی سے میرے بار بار جانے نے
سرو گل کی خوبی کے دعویٰ پر غصہ مت کر
کم ظرفی سے یہ دو ایک ناکس بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں
عاشق ہوں چاہتا ہوں کلمے کی جگہ بھی عشق میں
میری زبان سے دمِ آخر "یار یار" نکلے
میرؔ ہی صرف اس مژہ کے اشتیاق میں نہیں مارا گیا ہے
ایک دنیا اپنے ساتھ خاک میں یہ خار خار لے گئی ہے

۲۸۹

جب تک ہو سکے سادہ بتوں سے اے دل کام رکھ
جب زنار باندھ تسبیح پڑھنے کو الوداع کہہ دے
دل ان کافر بتوں سے ہر گاہ و بے گاہ کام رکھ
تسبیح کو ہاتھ سے پھینک دینا چاہیے جب زنار باندھے
نہایت کھردری طبیعت کے بگڑنے کا نتیجہ تنہائی ہے
کوئی خاردار درخت کی طرف رخ نہیں کرتا
وفا کے درمندوں کی زندگی سے دل جمع رکھ
نہ درمیان میں کوئی دوا ہے نہ کوئی تیاردار
دنیا کے شکم داروں سے گزند کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے
یہ حاملہ عورتیں اکثر سانپ کو جنم دیتی ہیں

میرؔ از ہولِ قیامت ایں ہمہ اندیشہ چیست
رو، توکل کن، امیدِ مرحمت از یار دار

۲۹۰

یک رہ ز شوق میرؔ رہِ آں سوار گیر
تا چند نامِ او بودت حرفِ بارگیر
سازِ زمانہ ہم نہ بود جائے اعتماد
ہست ایں گزندہ زیرِ فلک طرفہ مارگیر
دیرے ست شیوۂ تو وِلا بےقراری است
اکنوں بہ ضبط کوش و زمانے قرار گیر

۲۹۱

بہ امیدے کہ می نالی خموشی اے جرس بہتر
نہ دارد اہلِ دل ایں کارواں، ضبطِ نفس بہتر
بہ گامِ اوّلیں سر می رود در راہِ عشقِ او
اگر باور نمی داری، بیا اے بوالہوس بہتر

۲۹۲

اے کہ با تو نہ شود صحبتِ عاشق درگیر
لطف کن یک رہم از خاکِ مذلت برگیر
تا کسے تہمتِ آرام نہ بندد بہ دلت
سرگذشتِ تو بہ آخر چو رسد، از سرگیر

۲۹۳

مرو بہ راہِ خرابات گر نہ ای پُرکار
کہ گفتہ اند حریفاں قمار و راہِ قمار

۲۹۴

گر از تہِ دل نمی شوی یار
بارے بہ زباں نگاہ می دار

میرؔ قیامت کے خوف سے اتنی فکر کیوں ہے
جا، توکل کر، یار سے مرحمت کی امید رکھ

۲۹۰

ایک بار میرؔ عشق میں اس سوار کی راہ روک
کب تک اس کا نام تیرا تکیہ کلام بنا رہے
زمانے کی موافقت بھی اعتبار کے قابل نہیں ہے
آسماں تلے یہ ڈسنے والا طرفہ فریبی ہے
مدّت سے اے دل تیرا شیوہ بے قراری ہے
اب ضبط کی کوشش کر اور کچھ دن سکون سے رہ

۲۹۱

کس امید پر نالہ کر رہی ہے، اے جرس خاموشی بہتر (ہے)
اس کارواں میں اہلِ دل نہیں ہیں، ضبطِ نفس بہتر (ہے)
اس کے عشق کی راہ میں پہلے قدم پر سر چلا جاتا ہے
اگر (تجھے) یقین نہیں آتا بہتر ہے (کہ) اے بوالہوس آ (کر دیکھ لے)

۲۹۲

اے کہ تیرے ساتھ عاشق کی صحبت موافق نہیں آتی
مہربانی کر کے ایک بار مجھے خاکِ مذلت سے اٹھا
تا کہ کوئی تیرے دل پہ آرام کی تہمت نہ لگائے
جب تیرا ماجرا آخر کو پہنچ جائے، پھر سے شروع کر

۲۹۳

خرابات کی راہ نہ لے اگر عیّار نہیں ہے
کہ حریفوں نے کہا ہے کہ قمار ورزِ قمار[1]

۲۹۴

اگر (تو) تہِ دل سے دوست نہیں بنتا ہے
کم از کم (اپنی) زبان سے تو خیال رکھ

---

[1] جوئے کا کھیل سیکھنے کے بعد ہی جوا کھیلنا چاہیے۔

۲۹۵

نقّاشِ تو خوں کشید آخر
کارش بہ جنوں کشید آخر

۲۹۶

جاں می رود ز فرطِ تپش ہر شبم ہنوز
خوں می چکد بہ گاہِ سخن از لبم ہنوز
از خاکِ من گذشت نسیم و سموم شد
گردیدہ‌ام غبار و ہماں در تبم ہنوز
مقصودِ من تو ای ہمہ زیں آگہ اند لیک
ظاہر نمی کند بہ تو کس مطلبم ہنوز
تکرارِ حرفِ عشق ز یک عمر می کنم
پیری رسیدہ بر سر و در مکتبم ہنوز
جاں رفت و میرؔ سوختگی ہم چناں کہ بود
پُرآتش است قبرِ من از قالبم ہنوز

۲۹۷

بےخود شدۂ چشمش ہشیار نہ شد ہرگز
تا روزِ قیامت خفت، بیدار نہ شد ہر گز
از یاسِ وصالِ او جانے و الم دارم
ہر چند از او گشتم، او یار نہ شد ہرگز
وابستۂ آسائش یک لحظہ نہ گردیدم
از بندہ بہ عشقِ او ایں کار نہ شد ہرگز
در شہرِ وفا ہر یک بیماریِ دل دارد
از اہلِ ہوس کس را آزار نہ شد ہرگز
از تصفیۂ باطن میرؔ آئینہ گردیدم
اما بہ مرادِ دل دیدار نہ شد ہرگز

۲۹۵

تیرا نقش کھینچنے والے نے آخر فصد کھلوائی
اس کا کام آخر اسے جنون تک لے گیا

۲۹۶

ابھی تک ہر رات فرطِ تپش سے میری جان جاتی ہے
ابھی تک سخن کی جگہ میرے لبوں سے خون ٹپکتا ہے
میری خاک پر سے نسیم گزری اور سموم بن گئی
(میں) غبار ہو گیا ہوں اور ابھی تک اسی تپش میں ہوں
میرا مقصود تو ہے، سب اس سے آگاہ ہیں مگر
ابھی تک کسی نے تجھ پر میری خواہش کو ظاہر نہیں کیا
ایک عمر سے حرفِ عشق کی تکرار کر رہا ہوں
بڑھاپا سر پر آ گیا اور ابھی تک میں مکتب میں ہوں
جان چلی گئی اور میرؔ سوزش اتنی ہی (ہے) کہ جو تھی
میرے قالب (کی وجہ) سے میری قبر ابھی تک آگ سے بھری ہے

۲۹۷

اس کی آنکھوں سے مست ہو جانے والا ہرگز ہوش میں نہیں آیا
قیامت کے دن تک سویا، ہرگز بیدار نہیں ہوا
اس کے وصال کی ناامیدی سے جان اور الم رکھتا ہوں
کتنی ہی بار اس کی طرف سے گذرا آیا، وہ ہرگز یار نہ بنا
آرام سے ایک لحظہ بھی وابستہ نہیں ہوا
مجھ سے اس کے عشق میں یہ کام ہرگز نہیں ہوا
شہرِ وفا میں ہر ایک دل کی بیماری رکھتا ہے
اہلِ ہوس میں سے کسی کو (یہ) آزار نہیں ہوا
باطن کے پاک وصاف ہونے سے اے میرؔ (میں) آئینہ بن گیا
پھر بھی دل کی مراد کے مطابق دیدار نہیں (حاصل) ہوا

۲۹۸

در خانہ نشیں شرم کن اے خانہ برانداز
تا چند بہ بازار روی مستِ سرانداز
در دیر و حرم شد سببِ فتنہ و آشوب
چشمِ سیہ تست بلاشوخ و دراندازہ
ہر دیدن او موجبِ صد گونہ بلاے است
تا چشمِ سیاہِ تو چہ دارد نظرانداز
بے مصلحتِ وقت مزن دست بہ کارے
چوں تیغِ جفا یار برآرد، سپر انداز
خواہم ہدفِ ناوکِ او میرؔ جگر کرد
امروز نشاں یافتہ ام زاں قدرانداز

۲۹۹

گشتند از غمش ہمہ اجزاے ما گداز
چوں شمع گشتہ ایم ز سر تا بہ پا گداز
دستے مزن بہ من کہ ز سوزِ دروں شدہ ست
چوں آب خستہ میوہ تنم جا بہ جا گداز
شعرے نہ خواندہ ام کہ بکاے نہ کردہ میرؔ
بسیار درِ غم تو شدہ ست آں گدا گداز

۳۰۰

او چہ داند کہ گلِ داغ نہ چیدہ ست ہنوز
غنچہ اے ہست و ہوایش نہ رسیدہ ست ہنوز
او چہ داند کہ چہ در دوریِ او می باشد
چند گامے بہ رہِ غم نہ دویدہ ست ہنوز

۲۹۸

گھر میں بیٹھ، شرم کر اے گھروں کو برباد کر دینے والے
کہاں تک بازار میں نشے میں جھومتا ہوا جائے گا
دیر و حرم میں فتنہ و آشوب کا سبب بن گئی
تیری بلا شوخ اور در اندازِ[1] چشمِ سیاہ
ہر بار اس کا نظر اٹھانا سو طرح کی بلاؤں کا موجب ہے
کب تک تیری چشمِ سیاہ (مجھے) نظر انداز کیے رکھتی ہے
وقت کی مصلحت کے بغیر کسی کام میں ہاتھ نہ ڈال
جب یار تیغِ جفا نکالے، سپر ڈال دے
(اے) میرؔ، میں جگر کو اس کے ناوک کا ہدف بنا دوں گا
آج میں نے اس بے چوک تیر انداز کا پتہ پایا ہے

۲۹۹

اس کے غم میں ہمارے تمام اجزا گھل گئے
شمع کی طرح سرتاپا گداز ہو گئے ہیں
مجھے نہ چھو کہ سوزِ دروں سے ہو گیا ہے
میرا بدن آب خستہ[2] میوے کی طرح ہر جگہ سے نرم
میرؔ (کے سامنے کوئی) شعر نہیں پڑھا کہ (اس نے) آہ و فغاں نہیں (شروع) کی
وہ گدا تیرے غم میں بہت زیادہ گھل گیا ہے

۳۰۰

وہ کیا جانے کہ (اس نے) گلِ داغ ابھی نہیں چنا ہے
غنچہ ہے اور اس کو ابھی ہوا نہیں لگی ہے
وہ کیا جانے کہ اس کا ہجر کیا ہوتا ہے
راہِ غم میں ابھی تک چند قدم بھی نہیں دوڑا ہے

---

[1] دو فریقوں میں لڑائی کرانے والی۔
[2] پانی میں پڑے پڑے خراب ہونے والے۔

بر سرِ رہگذر از حالِ من او را چہ خبر
انتظارے چو خودے را نہ کشیدہ ست ہنوز
گوش بر قصۂ عشاق نینداختہ است
شورِ ہنگامۂ دل ہم نہ شنیدہ ست ہنوز
کے بہ ایں چشمِ جگربارِ منش چشم افتد
اشک ہم از مژۂ او نہ چکیدہ ست ہنوز
قدرِ ما سینہ فگاراں چہ کند کآں بےرحم
چوں گُل از شوق گریباں نہ دریدہ ست ہنوز
داغم اے میرؔ من از بکرنگاہے کہ ز شرم
صورتِ آئینہ یک چشم نہ دیدہ ست ہنوز

۳۰۱

آماجِ تست تربتِ اہلِ وفا ہنوز
تیرِ تو گرد می کند از خاکِ ما ہنوز
من درمیانہ نیستم و درمیانِ باغ
دارد بہ لب فسانۂ شوقم صبا ہنوز
جانم بہ لب رسید و قریب است رفتنم
خوباں بد آید با منِ مسکیں شما ہنوز
فرسودہ شد زبانِ انابت بہ کام و میرؔ
کارے نمی کند بہ دلِ او دعا ہنوز

۳۰۲

باقی ست بعدِ مرگ ہم آثارِ ما ہنوز
دارد نشانِ خوں در و دیوارِ ما ہنوز
از حالِ ماست غافل اگر جائے شکوہ نیست
با کس وفا نہ کردہ جفاکارِ ما ہنوز

سرِ رہگزر میرے حال کی اس کو کیا خبر
(اس نے) کسی اپنے جیسے کا ابھی انتظار نہیں کھینچا ہے
(اس نے) عاشقوں کے قصے پر کان نہیں دھرا ہے
دل کے ہنگامے کا شور بھی ابھی تک نہیں سنا ہے
کب میری اس جگر برسانے والی آنکھوں پر (اُس کی) نظر پڑتی ہے
آنسو بھی اس کی پلکوں سے ابھی تک نہیں ٹپکے ہیں
ہم زخمی سینہ رکھنے والوں کی وہ بے رحم کب قدر کرتا ہے
ابھی تک عشق میں گل کی طرح گریبان چاک نہیں کیا ہے
اے میرؔ میں کسی بکر نگاہ[1] کا غم کھاتا ہوں کہ شرم سے
(جس نے) ایک نگاہ آئینے کی شکل ابھی تک نہیں دیکھی

۳۰۱

اہلِ وفا کی تربت ابھی تک تیرے تیر کا نشانہ ہے
تیرا تیر ہماری خاک سے ابھی تک غبار اٹھاتا ہے
میں موجود نہیں ہوں اور باغ کے اندر
ابھی تک صبا کے لب پر میرے عشق کا افسانہ ہے
جان ہونٹوں تک پہنچ گئی ہے اور میرے جانے کا وقت قریب ہے
(اے) معشوقو! تم ابھی بھی مجھ مسکین سے بری طرح پیش آ رہے ہو
دعا مانگتے مانگتے زبان منہ میں گھس گئی اور میرؔ
اس کے دل پر ابھی تک دعا نے کوئی کام نہیں کیا

۳۰۲

مرنے کے بعد بھی ہماری نشانیاں ابھی تک باقی ہیں
ہمارے در و دیوار پر ابھی تک خون کے نشان ہیں
اگر ہمارے حال سے غافل ہے، شکوے کی گنجائش نہیں ہے
کسی سے ابھی تک ہمارے جفا کار نے وفا نہیں کی ہے

---

[1] وہ معشوق جس کو ابھی ناز و انداز دکھانا نہ آتا ہو۔

۳۰۳

او چہ داند کہ دلش عشق نہ ورزیدہ ہنوز
رنگِ آں غیرتِ گلزار نہ گردیدہ ہنوز

۳۰۴

نہ کردیم گشتِ چمن یک نفس
بہ حرماں بسر رفت اوقات و بس
بہار آمد و گل فشاں شد ولے
نیفتاد یک برگِ گل بر قفس
از ایں منزلِ رفتنی بار بند
بیا حرف در رہ بگو چوں جرس
ز شوقِ گلم سینہ پُر داغ شد
بدیں رنگ گل کرد آخر ہوس
چہ بر خوبیِ خویشتن غرّہ ای
بہ دردِ دلِ غم کشاں ہم برس
چساں میرؔ خواہی بسر کرد آہ
مزاجِ تو سازے نہ دارد بہ کس

۳۰۵

آزردہ دلے آہ چو منے را چہ کند کس
غربت زدۂ بےوطنے را چہ کند کس
بر جاست گر از صحبتِ من خلق نفور است
ہنگامہ کنے، نعرہ زنے را چہ کند کس
از بلبلِ شوریدہ گذشتم بہ تغافل
رسوا شدۂ ہر چمنے را چہ کند کس
سودای اے چو من نہ بود قابلِ صحبت
ایں قسم پریشاں سخنے را چہ کند کس

۳۰۳

وہ کیا جانے کہ اس دل نے ابھی عشق اختیار نہیں کیا ہے
اس غیرتِ گلزار کا رنگ ابھی نہیں اڑا ہے

۳۰۴

ایک نفس چمن کی سیر نہیں کی
وقت بس ناامیدی میں کاٹ دیا
بہار آئی اور پھول برسائے مگر
قفس پر ایک پنکھڑی بھی نہیں ڈالی
اس عارضی منزل سے اسباب باندھ
آ، راہ میں جرس کی طرح بات کر
گل کے شوق میں میرا سینہ داغ سے بھر گیا
جنوں آخر اس رنگ میں ظاہر ہوا
کیا تو (بس) اپنے حسن پر فریفتہ ہے
غم اٹھانے والوں کے دل کے درد تک بھی پہنچ
میر (تو) کس طرح بسر کرے گا، آہ
تیرا مزاج کسی سے موافق نہیں آتا

۳۰۵

مجھ جیسے آزردہ دل کا کوئی کیا کرے
غربت زدہ، بے وطن کا کوئی کیا کرے
بجا ہے اگر میری صحبت سے لوگ نفرت کرتے ہیں
ہنگامہ کرنے والے، نعرہ مارنے والے کا کوئی کیا کرے
(میں) شوریدہ بلبل (کے پاس) سے بے التفاتی کے ساتھ گزر گیا
کوئی ہر چمن میں رسوا ہونے والے کا کیا کرے
مجھ جیسا دیوانہ صحبت کے قابل نہیں ہوتا
اس طرح کے بہکی بہکی باتیں کرنے والے کا کوئی کیا کرے

شمعے نہ فروزند کہ حاضر نہ شود میرؔ
پروانۂ ہر انجمنے را چہ کند کس

۳۰۶

در دہر چوں تو ظلم شعارے نہ دید کس
ناآشنا تر از تو نگارے نہ دید کس
روشن نہ شد کہ عشق درونم چگونہ سوخت
افتاد آتشے و شرارے نہ دید کس
نبود دلے کہ در تہِ گردِ ملال نیست
زیں خاکداں بغیرِ غبارے نہ دید کس
خوں ہا نمودہ ای و نہ دانم چہ کردہ ای
کاندر رہت نشانِ مزارے نہ دید کس
جانے نہ داد میرؔ بہ ایں بے کسی کسے
در مردنِ تو گریۂ زارے نہ دید کس

۳۰۷

ما از آں بے مہرِ گل رخسار کیں دیدیم و بس
بر جبینِ ہم چو ماہش جملہ چیں دیدیم و بس
روز و شب با دیدۂ نم ناک کارے داشتیم
آں چہ ما دیدیم در عشقِ تو ایں دیدیم و بس

۳۰۸

دل کہ ہر لحظہ داشتم بہ برش
حالیا دیر می رسد خبرش
فکر بسیار کردم و لیکن
بستہ ہرگز نہ شد ز من کمرش
آہ در دل چہ داشت بلبلِ باغ
پُر بہ دل خورد نالۂ سحرش

شمع نہیں جلائی کہ میرؔ حاضر نہیں ہوا
ہر انجمن کے پروانے کا کوئی کیا کرے

۳۰۶

دنیا میں کسی نے تجھ جیسا ظلم شعار نہیں دیکھا
تجھ سے زیادہ ناآشنا محبوب کسی نے نہیں دیکھا
یہ روشن نہیں ہوا کہ عشق نے میرے سینے کو کیسے جلایا
آگ لگی اور کسی نے ایک چنگاری نہیں دیکھی
کوئی دل (ایسا) نہیں ہوگا کہ گردِ ملال میں اٹا ہوا نہیں ہے
کسی نے اس خاک دان سے غبار کے سوا کچھ اور نہیں پایا
تو نے بہت خون کیے اور میں نہیں جانتا کیا کر دیا ہے
کہ تیری راہ میں کسی نے کسی مزار کا نشان نہیں پایا
میرؔ کسی نے اس بے کسی کے ساتھ جان نہیں دی تھی
تیرے مرنے پر کسی نے آہ و بکا نہیں سنی

۳۰۷

ہم نے اس گل رخسار بے مہر (کی طرف) سے کینہ دیکھا اور بس
اس کی ماہ جیسی پیشانی پر تمام شکنیں دیکھیں اور بس
روز و شب دیدۂ نم ناک سے کام رکھتے تھے
تیرے عشق میں ہم نے جو دیکھا یہی دیکھا اور بس

۳۰۸

دل جس کو ہر لحظہ اس کی آغوش میں رکھتے تھے
ان دنوں اس کی خبر دیر سے پہنچتی ہے
میں نے بہت فکر کی لیکن
مجھ سے اس کی کمر (کا مضمون) بالکل نہیں بندھ سکا
آہ باغ کا بلبل دل میں کیا رکھتا تھا
اس کا نالۂ سحری دل کو بہت تڑپا گیا

از قدِ چوں سنانِ آں بے‌رحم
تیزہ بالاست خوں بہ رہگذرش
خوب شد دل از ایں میاں برخاست
بود از غم قیامتے بہ سرش
داغم از چشم شرمگینِ کسے
بر نہ دارد ز پشتِ پا نظرش
آں مقدّس کسےست میرؔ کہ خلق
بہ تبرّک برند خاکِ درش

۳۰۹

دلا برخیز و آہے از جگر کش
بریز اشکے و دامانِ اثر کش
برابر کرد با خاکِ سیاہم
خرامِ نازِ ایں سبزانِ سرکش
تو مغروری بہ عقل و دانشِ خویش
نمی دانی کہ دشوار است درکش
ز دل آہے مکش اکثر کہ ہر جا
نیندازند تیرِ روئے ترکش
بہ فصلِ گل چہ در بندِ لباس ای
گرو کن جامہ را و جام درکش
بہ گلخن غنچہ‌ئسپی تا کجا میرؔ
بغل بکشا و آں گل را بہ بر کش

۳۱۰

ہر کہ شد دیوانۂ او کس نہ گردد ہمدمش
شیر ناخن می گذارد در بیابانِ غمش

اس بے رحم کے سناں کی طرح قد کے سبب
اس کی رہ گزر میں (موجِ) خوں نیزے سے اونچی (ہو چکی) ہے
اچھا ہوا کہ دل درمیان سے چلا گیا
غم سے اس کے سر پر ایک قیامت تھی
کسی کی چشم شرمگیں سے نہایت آزردہ ہوں
اس کی نظر پشتِ پا سے نہیں اٹھتی ہے
(یہ) بزرگ میرؔ کون ہے کہ لوگ
اس کے در کی خاک تبرّک کے طور پر لے جاتے ہیں

۳۰۹

اے دل اٹھ اور جگر سے ایک آہ کھینچ
آنسو بہا اور اثر کا دامن کھینچ
مجھے خاکِ سیاہ کے برابر کر دیا
ان سانولے رنگ والے سرکشوں کے خرامِ ناز نے
تو اپنی عقل و دانش پر مغرور ہے
نہیں جانتا کہ اس کو جاننا دشوار ہے
دل سے بہت آہ مت کھینچ کہ ہر موقع پر
تیرِ روئے ترکش[1] کو نہیں چلاتے
فصلِ گل میں کیوں لباس کی قید میں ہے
جامہ رہن رکھ اور جام کھینچ
گلخن[2] میں غنچہ خسپی[3] کب تک میرؔ
بانہیں کھول اور اس گل کو آغوش میں کھینچ

۳۱۰

جو بھی اس کا دیوانہ ہوا اس کو کوئی بھی دوست نہیں بناتا
اس غم کے بیابان میں شیر (بھی) نہایت خوف زدہ ہو جاتا ہے

---

۱ سب سے عمدہ اور چنا ہوا تیر جس کے لیے ترکش پر الگ جگہ بنائی جاتی ہے۔
۲ آتش دان، مجازاً کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ۔
۳ سکڑ کے سونا۔

اس بے رحم کے سناں کی طرح قد کے سبب
اس کی رہ گزر میں (موجِ) خوں نیزے سے اونچی (ہو چکی) ہے
اچھا ہوا کہ دل درمیان سے چلا گیا
غم سے اس کے سر پر ایک قیامت تھی
کسی کی چشم شرگیں سے نہایت آزردہ ہوں
اس کی نظر پشتِ پا سے نہیں اٹھتی ہے
(یہ) بزرگ میرؔ کون ہے کہ لوگ
اس کے در کی خاک تبرّک کے طور پر لے جاتے ہیں

۳۰۹

اے دل اٹھ اور جگر سے ایک آہ کھینچ
آنسو بہا اور اثر کا دامن کھینچ
مجھے خاکِ سیاہ کے برابر کر دیا
ان سانولے رنگ والے سرکشوں کے خرامِ ناز نے
تو اپنی عقل و دانش پر مغرور ہے
نہیں جانتا کہ اس کو جاننا دشوار ہے
دل سے بہت آہ مت کھینچ کہ ہر موقع پر
تیرِ روئے ترکش[1] کو نہیں چلاتے
فصلِ گل میں کیوں لباس کی قید میں ہے
جامہ رہن رکھ اور جام کھینچ
گلخن[2] میں غنچہ خسپی[3] کب تک میرؔ
بانہیں کھول اور اس گل کو آغوش میں کھینچ

۳۱۰

جو بھی اس کا دیوانہ ہوا اس کو کوئی بھی دوست نہیں بناتا
اس غم کے بیابان میں شیر (بھی) نہایت خوف زدہ ہو جاتا ہے

---

[1] سب سے عمدہ اور چنا ہوا تیر جس کے لیے ترکش پر الگ جگہ بنائی جاتی ہے۔
[2] آتش دان، مجازاً کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ۔
[3] سکڑ کے سونا۔

ابر کے گردد حریفِ غرقۂ دریائے عشق
لجّہ لجّہ می چکد حسرت ز مژگانِ نمش
قیس را گر تعزیت دارے نہ باشد گو مباش
بیدِ مجنوں موئے سر وا کردہ اندر ماتمش
ایں ہمہ بر خود شکستن را سبب پُرسیدمے
گر ملاقاتم میسّر می شدے با محرمش
با سرِ زلفت سروکارے ست شاید میرؔ را
رحم می آید بسے اکنوں بہ حالِ درہمش

۳۱۱

نہ دارد آرزوئے دیدنِ فردوس و گلزارش
زدہ ست آں کس کہ سر پیچِ خوشے در پائے دیوارش
اگر در باغ می آید بہ خوبی می نمایمت
کہ ہاں اے گل چہ کافر چہرہ اے افتادہ رخسارش
نشستم مدّتے خاموش و تاثیرے نہ شد ظاہر
مگر از حالِ من نالیدنے سازد خبردارش
کنوں در گوشہ زاہد را نہ خواہی دید اے ہم دم
کہ چشمِ بےخودِ سبزینہ اے دل بردہ از کارش
چنیں معلوم می گردد کہ جاے میرؔ عاشق شد
محبّت می تراود متّصل از طرزِ گفتارش

۳۱۲

آں کہ جاں می رود بہ قربانش
می کشد تیر زخم پیکانش
جانبِ من کسے نمی گیرد
ورنہ دستے زنم بہ دامانش
آرزومندِ خویش را دریاب
رمقے بیش نیست از جانش

بادل بحرِ عشق میں ڈوبے ہوئے کا کب حریف بن سکتا ہے
اس کی گیلی پلکوں سے لجّہ لجّہ[1] حسرت ٹپک رہی ہے
قیس کے لیے اگر کوئی سوگوار نہ ہو، کہہ دو کہ نہ ہو
اس کے ماتم میں بیدِ مجنوں سر کے بال بکھرائے ہوئے ہے
اتنے ناز و غرور کرنے کا سبب پوچھوں
اگر اس کے محرمِ راز سے مجھے ملاقات (کا موقع) میسّر ہو
شاید میرؔ کو اس کی زلف سے سروکار ہے
اب اس کے حالِ پریشاں پر بہت رحم آتا ہے

۳۱۱

فردوس اور اس کے گلزار کو دیکھنے کی آرزو نہیں رکھتا
وہ جو اُس کی دیوار کے نیچے چین سے سو رہا ہے
اگر باغ میں آیا تو بہت خوبی سے (گل کو) تجھے دکھاؤں
کہ ہوشیار اے گل کیا کافر چہرہ تیرے رخسار پر جھکا ہے
مدّتوں خاموش بیٹھا رہا اور کوئی تاثیر ظاہر نہیں ہوئی
مگر رونے نے میرے حال سے اس کو آگاہ کر دیا
اب زاہد کو اے ہم دم خلوت میں نہیں دیکھے گا
کہ سانولے رنگ کے نوخیز حسین کی چشمِ بے خود اس کا دل چھین لے گئی ہے
اسی سے معلوم ہوا کہ کسی جگہ میرؔ عاشق ہو گیا ہے
محبّت ہمیشہ اس کی باتوں کے انداز سے ٹپکتی ہے

۳۱۲

وہ کہ جان اس پر قربان ہوئی جاتی ہے
اس کے پیکان کا زخم پھیلتا جا رہا ہے
کوئی میری جانب نہیں لاتا
کہ اس کے دامن پر ہاتھ ڈالوں
اپنے آرزومند کی خبر لے
اس کی جان ایک رمق سے زیادہ نہیں (رہ گئی) ہے

---

[1] بھنور۔

تعزیت خانہ است باغِ جہاں
روضہ خوان است مرغِ خوش خوانش
کردہ ادیاں بہ یک نگہ برہم
چشمِ پُرخشم نامسلمانش
آں سیہ کاسہ است چرخ کہ میرؔ
غیرِ خونے نہ خورد مہمانش

۳۱۳

چہ گویم آہ من از خوئے جور ایجادش
نشستہ ام بہ سرِ پا ز دستِ بیدادش
دلم بہ دستِ تو ماند بہ آں گرفتارے
کہ بال بستہ سپارد بہ طفل صیادش
شبے بہ سعیِ رقیباں از او جدا گشتم
کنوں چو خوابِ فراموش رفتم از یادش
چہ حرف می زنی از برگ برگ گشتنِ گل
ہوائے دیدنِ روئے تو دادہ بربادش
کدام دشمنِ جاں میرؔ را بہ شور آورد
کہ می چکد ہمہ شب دوستی ز فریادش

۳۱۴

دوش از لعلِ یارِ جانیٔ خویش
یافتم لطفِ زندگانیٔ خویش
صحبتِ او بہ ناکساں و مرا
انفعالے ز نکتہ دانیٔ خویش
یک دو روزے بہ ترکِ او پرداز
رحم کن میرؔ بر جوانیٔ خویش

دنیا کا باغ تعزیت خانہ ہے
اس کا خوش آواز پرندہ روضہ خوان[1] ہے
دین وایمان کو ایک نگہ سے تہہ وبالا کر دیا ہے
اس کی غصّے سے بھری کافر آنکھوں نے
آسماں وہ بخیل ہے میرؔ کہ
اس کا مہمان خون کے علاوہ کچھ نہیں پیتا

۳۱۳

آہ میں اس کی جورا یجاد طبیعت کی کیا کہوں
اس کے ظلم کے ہاتھوں مرنے کے قریب ہوں
میرا دل تیرے ہاتھ میں اس گرفتار (پرندے) کی طرح ہے
کہ (جسے) صیّاد نے پر بندھا ہوا (کسی) بچّے کے سپرد کر دیا ہے
ایک رات رقیبوں کی کوشش (کی وجہ) سے اس سے جدا ہوا
اب بھولے ہوئے خواب کی طرح اس کے حافظہ سے نکل گیا ہوں
پھول کے پتی پتی ہو جانے کا کیا بیان کروں
تجھے دیکھنے کی آرزو نے اسے ہوا میں بکھیر دیا
کس دشمنِ جان نے میرؔ کو غل کرنے پر مجبور کیا
کہ ساری رات اس کی فریاد سے ٹپکتی رہی

۳۱۴

کل اپنے یارِ جانی کے لب سے
اپنی زندگی کا لطف پایا
اس کی نالائقوں سے صحبت اور مجھے
اپنی نکتہ دانی پر شرمندگی
ایک دو روز اس سے ترک اختیار کر
میرؔ اپنی جوانی پر رحم کھا

---

[1] مجلس عزا میں کتاب پڑھ کر سنانے والا۔

۳۱۵

می گشت باد صبح گہی گردِ خانہ اش
زو آتشم بہ دل روشِ محرمانہ اش

از ہم گذشت بلبلِ شوریدہ سر مگر
یک نالہ بر نمی زند از آشیانہ اش

سیمائے پاک تر ز جبینِ ملک بیار
مسجود ہر سرے نہ شود آستانہ اش

بودیم دوش پیشِ ستم دیدۂ غمت
جز داغِ دل نہ بود چراغے بہ خانہ اش

بر سر رسیدہ بود مرا بعدِ مدّتے
امّا نہ داد فرصتِ یک دم زمانہ اش

ایں چند بال و پر کہ عبارت ز بلبل است
سوراخ می کند بہ جگر ہر ترانہ اش

با میرؔ دوش صحبتِ شعر اتفاق شد
بےخود شدیم از غزلِ عاشقانہ اش

۳۱۶

چشم دارم ز دیدۂ ترِ خویش
کہ نماید بہ ابر گوہرِ خویش

بالشم سنگ و بسترم خاک است
تکیہ تا کردہ ام بہ دلبر خویش

نیستم در خود و بہ فکرِ خودم
وطن آورہ ام بہ کشورِ خویش

تا چو آئینہ دیدہ ام وا شد
چہرہ گشتم بہ خلق بر درِ خویش

خوب شد پائمالِ نازِ تو شد
میرؔ بسیار بود بر سرِ خویش

۳۱۵

بادِ صبح گاہی اس کے گھر کے گرد گشت کرتی تھی
اس کی محرمانہ روش نے میرے دل میں آگ لگا دی
بلبل شوریدہ سر شاید مر گئی
ایک نالہ (بھی) اس کے آشیانے سے نہیں اٹھا
فرشتوں کی جبین سے پاک تر ایک پیشانی لے آ
اس کا آستانہ ہر سر کا مسجود نہیں ہوتا
ہم کل تیرے غم کے ستم دیدہ کے روبرو تھے
اس کے گھر میں داغِ دل کے سوا چراغ نہ تھا
(وہ) مدت کے بعد میرے پاس پہنچا تھا
لیکن زمانے نے اسے ایک دم کی (بھی) فرصت نہیں دی
یہ چند بال و پر کہ بلبل سے عبارت ہیں
اس کا ہر ترانہ جگر کو چھید دیتا تھا
کل میرؔ سے صحبتِ شعر کا اتفاق ہوا
(ہم) اس کی عاشقانہ غزل سے بے خود ہو گئے

۳۱۶

اپنے دیدۂ تر سے امید رکھتا ہوں
کہ ابر کو اپنا گوہر دکھائے گا
میری بالش سنگ اور بستر خاک ہے
جب سے اپنے دلبر پر تکیہ کیا ہے
خود میں نہیں ہوں اور اپنی تلاش میں ہوں
اپنے ملک میں وطن آوارہ ہوں
جب سے آئینے کی طرح میری آنکھ کھلی
میں اپنے دروازے پر خلق کی طرف چہرہ موڑ لیا ہے
خوب ہوا تیرے ناز کا پائمال ہو گیا
میرؔ بہت زیادہ خود سر تھا

۳۱۷

بود اگر جبرئیل شد رامش
خوردہ آبے ز چشمۂ دامش
از ہجومِ نگاہِ منتظراں
شکوہ ہا ہست بر لبِ بامش
دل در آغازِ عاشقی خوں شد
تا چہ خواہد شدن سرانجامش
بادہ خواریِ عشق بازی نیست
بوئے خوں آید از لبِ جامش
خودکشی ہا نمودہ ام کہ چنیں
آشنا گشتہ لب بہ دشنامش
دل کہ سرمایۂ حیاتِ من است
از تپش نیست یک دم آرامش
پیشِ من ہمنشیں کہ بےصبرم
چہ ضرور است بردنِ نامش
یادِ آں عہد می کنم کہ مرا
دم بہ دم می رسید پیغامش
اے کہ صبحِ چمن بسے دیدی
در خزاں یک نظر ببیں شامش
بہ جہنم چو میرؔ کافر شد
او چہ بود و چہ دین و اسلامش

۳۱۸

زخم بر زخم خورد نخچیرش
داشت آبِ برندہ شمشیرش

۳۱۷

اگر جبرئیل تھا اُس سے رام ہو گیا
(اور) اس کے چشمہ دام سے پانی پیا
منتظروں کی نگاہوں کے ہجوم سے
اس کے لبِ بام کو پر بہت سے شکوے ہیں
دل آغازِ عاشقی میں خوں ہو گیا
انجام تک اس پر کیا گزرے گی
عشق کی بادہ خواری کھیل نہیں ہے
لبِ جام سے بوئے خوں آتی ہے
(میں نے) سخت محنت اور کوشش کی کہ یوں
اس کے لب دشنام سے آشنا ہو گئے
دل کہ میرا سرمایۂ حیات ہے
تپش سے اُسے دم بھر آرام نہیں ہے
میرے سامنے ہمنیش، کہ بے صبر ہوں
اس کا نام لینا کیا ضرور ہے
اس عہد کو یاد کرتا ہوں کہ مجھے
دم بہ دم اس کا پیغام پہنچتا تھا
اے کہ (تو نے) صبح چمن اکثر دیکھی ہے
خزاں میں ایک نظر اس کی شام (بھی) دیکھ
میرؔ سا کافر جہنم (رسید) ہوا
وہ کیا تھا اور کیا اس کا دیں اور اسلام

۳۱۸

اس کا شکار زخم پر زخم کھاتا تھا
اس کی شمشیر میں آبِ برندہ[1] تھا

---

[1] کھانے کو جلد ہضم کرنے والا پانی۔

تا کجا آه استخواں شکنیم
کہ بیائیم بر سرِ تیرش
دل کہ شد رہ گرائے کوچۂ زلف
نتواں داشتن بہ زنجیرش
بہ خرابی قرارِ دل دادم
کہ نہ دارم دماغِ تعمیرش
کار آخر نہ کرد در دلِ او
نالہ معلوم بود و تاثیرش
بلبلِ ایں چمن خموش بہ است
می چکد خونِ دل ز تقریرش
میرؔ از دیر قصدِ کعبہ نمود
کرد آوارگی خدا گیرش

۳۱۹

چوں پردہ برافتد سحر از چہرۂ آلش
گویند عزیزانِ چمن گل بہ جمالش
یارب چہ ہوس بلبلِ شوریدہ بہ خود برد
کآوارہ ہنوز اند بہ گلشن پر و بالش
در خوابِ عدم ہم دلِ آسودہ نہ داریم
مردیم و ہماں است تمنائے وصالش
از جان و جہاں در غمِ او آہ گذشتیم
اما نہ گذشتیم یکے ہم بہ خیالش
ما حال تباہاں ہمہ نومید بمردیم
ہر کس بہ امیدِ تو زید وائے بہ حالش
گر حور کند جلوہ نگاہے نہ دہد آب
حیرت زدۂ چہرۂ آئینہ مثالش

ہم کہاں تک آہ سخت کوشش کریں
کہ تیرے تیر کے سامنے آئیں
دل کہ کوچۂ زلف کا مسافر تھا
اس کو زنجیر میں نہیں رکھا جا سکتا
دل کی تعمیر کو ویرانی کے سپرد کر دیا
کہ اس کو آباد کرنے کی استعداد نہیں رکھتا تھا
اس کے دل پر آخر اثر نہیں کیا
فریاد اور اس کی تاثیر معلوم ہو گئی
اس چمن کے بلبل کا خاموش رہنا اچھا ہے
اس کے بولنے سے خونِ دل ٹپکتا ہے
میرؔ نے بت کدے سے کعبے کا قصد کیا
گمراہی کی، خدا اسے آفتِ ناگہانی میں مبتلا کرے

۳۱۹

جب سحر اس کے گلابی چہرے سے پردے کو ہٹاتی ہے
دوستانِ چمن اس کے جمال کو گل کہتے ہیں
یا رب بلبلِ شوریدہ نے اپنے اوپر کیا حسرت اٹھائی ہے
کہ گلشن میں اس کے پر و بال ابھی تک اڑتے پھر رہے ہیں
خوابِ عدم میں بھی آسودہ دل نہیں رکھتے ہیں
مر گئے اور وہی اس کے وصل کی تمنّا ہے
آہ اس کے غم میں جان اور جہاں سے گزر گئے
مگر ایک بار بھی اس کے خیال کو ترک نہیں کیا
ہم تباہ حال بالکل ناامید مر گئے
جو بھی تجھ سے امید پر زندہ ہے اس کے حال پر افسوس (ہے)
اگر حور (بھی) جلوہ دکھائے (تو وہ) نظّارے کا لطف حاصل نہ کرے
(جو) اس کے آئینہ مثال چہرے کا حیرت زدہ (ہے)

بس کن کہ بسے کرد قلم سحرطرازی
دفتر شدہ اے میرؔ ز وصفِ خط و خالش

۳۲۰

داغ ایم از ایں باغ و ہم از رنگِ ثباتش
بر بادِ فنا آہ نوشتند براتش
رشک است بر آں نیک سرانجام کہ ظالم
تا عہدِ جفائے تو وفا کرد حیاتش
کیفیتِ زہد و ورع میرؔ مپرسید
بدتر بود از بادہ کشی صوم و صلواتش

۳۲۱

برِ خود میرؔ را خوانید و خوباں دل بجوئیدش
در ایں ایام دل تنگ است چندے بد نہ گوئیدش
نہ باشد چارہ اے جز پارہ کردن دامنِ تر را
نہ گردد پاک ہرگز گر بہ آبِ خضر شوئیدش
بہ داغِ سینۂ من چشم را نتواں سیہ کردن
گلِ ایں باغ دارد بوئے جاں سوزے، مبوئیدش

۳۲۲

مستِ غفلت چند باشی باخبر اے یار باش
عمر ہم چوں نشۂ مے می رود، ہشیار باش
تا تامّل می نگاری ایں ورق برگشتہ است
وضعِ بےشیرازہ اے داری بہ فکرِ کار باش

۳۲۳

گر فشارم گوشۂ دامانِ خویش
غرق گردد نوح با طوفانِ خویش
دست در دامانِ او خواہیم زد
آستیں افشاندہ ایم از جانِ خویش

بس کر کہ قلم نے بہت سحر طرازی کر لی
اس کے خط و خال کی تعریف سے اے میرؔ ایک کتاب بن گئی

۳۲۰

(ہم) اس باغ اور اس کے ساتھ اس کے رنگِ ثبات پر رنجیدہ ہیں
آہ اس کی قسمت بادِ فنا پر تحریر کی گئی ہے
اس اچھے اختتام والے عاشق پر رشک ہے کہ ظالم
تیرے عہدِ جفا تک اس کی حیات نے وفا کی
میرؔ کے زہد و ورع کی کیفیت مت پوچھیے
اس کا صوم و صلوٰۃ بادہ کشی سے بدتر تھا

۳۲۱

معشوق میرؔ کو اپنے قریب بلائیں اور اس کی دل جوئی کریں
آج کل رنجیدہ ہے، کچھ اسے برا بھلا نہ کہیں
دامنِ تر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے سوا چارہ نہیں ہوگا
اگر اس کو آبِ حیات سے (بھی) دھوئیں پاک نہیں ہوگا
میرے سینے کے داغ سے حسد نہیں کرنا چاہیے
اس باغ کا پھول جاں سوز مہک رکھتا ہے اسے مت سونگھیے

۳۲۲

کب تک غفلت میں مست رہے گا اے یار باخبر ہو جا
عمر بھی شراب کے نشہ کی طرح ختم ہو رہی ہے ہشیار رہ
جتنی دیر میں تو شک و شبہہ کو (دل میں) جگہ دے گا، یہ ورق پلٹ جائے گا
تیری وضع بے شیرازہ[1] ہے، کام کی فکر کر

۳۲۳

اگر اپنے دامن کا کونا نچوڑ دوں
نوح اپنے طوفان کے ساتھ غرق ہو جائے
ہم اس کا دامن کھینچنا چاہتے ہیں
اپنی جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں

---

[1] پریشان اور بکھرے ہوئے طور طریقے جو کسی اصل اور قاعدے پر نہ ہوں۔

۳۲۴

خصلتِ من شعارِ من اخلاص
راه و رسم دیارِ من اخلاص
از محبّت سرشته اند گلم
شیوه مہر است و کارِ من اخلاص
دشمنِ جانِ من است اے میرؔ
آں کہ دارد بہ یارِ من اخلاص

۳۲۵

دیدمش پُر بےوفا و خودغرض
خودنما و خودستا و خودغرض
خودسر و خودراے و از بس خودپسند
خوب رو و بدبلا و خودغرض

۳۲۶

نیست شایانِ تو با ہر نوعِ مردم اختلاط
دل ربایاں را نہ باید شد سریشم اختلاط

۳۲۷

در دیارِ حسن خوبے نیست چسپاں اختلاط
بر نمی خیزد از ایں جا جز پریشاں اختلاط

۳۲۸

دلا بے رخِ یارِ جانی چہ حظ
بمیر، از چنیں زندگانی چہ حظ
شوی یار اگر از تہِ دل خوش است
وگرنہ ز لطفِ زبانی چہ حظ

۳۲۹

دیدن در انتظارِ تو شب داشت سوزِ شمع
آخر دمید صبح و سیہ گشت روزِ شمع

۳۲۴

میری خصلت، میرا شعار، اخلاص
میرے دیار کی رسم و راہ، اخلاص
محبت سے میری مٹی گوندھی گئی ہے
میرا شیوہ محبت ہے، میرا کام، اخلاص
میرؔ میرا جانی دشمن ہے
جو بھی میرے یار سے اخلاص رکھتا ہے

۳۲۵

میں نے اسے بہت بے وفا اور خودغرض پایا ہے
خودنما اور خودستا[1] اور خودغرض
خودسر، خودرائے اور حد سے زیادہ خودپسند
خوب رو اور بدبلا اور خودغرض

۳۲۶

ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ ملنا تیرے شایاں نہیں ہے
دلبروں کو چپک کر رہ جانے والا ملاقاتی نہیں بننا چاہیے

۳۲۷

دیارِ حسن میں کوئی بھی محبوب دوستی نباہنے والا نہیں
یہاں سے ہر ایک سے دوستی رکھنے والوں کے سوا کوئی نہیں ملتا

۳۲۸

اے دل یارِ جانی کے دیکھے بغیر کیا مزہ (ہے)
مرجا، اس طرح زندگی سے کیا فائدہ (ہے)
اگر تو تہِ دل سے دوست بنے (تو) اچھا ہے
ورنہ زبانی مہربانی میں کیا مزہ (ہے)

۳۲۹

رات تیرے انتظار میں شمع کا سوز دیکھنے کے لائق تھا
آخر صبح طلوع ہوئی اور شمع کا دن تاریک ہو گیا

---

[1] آپ اپنی ستائش کرنے والا۔

۳۳۰

بے روئے تست آہ بہ صد سوز و سازِ شمع
بابِ ترحم است دلِ نونیازِ شمع
در بزمِ شب ز دعویِ خوبی نہ شد خموش
داغم نمود بے تو زبانِ درازِ شمع
شد صرفِ اشک و داغ سراپا او بہ بزم
گشتم کباب میرؔ ز سوز و گدازِ شمع

۳۳۱

من و ز کوئے تو عزمِ سفر، دروغ دروغ
مرا دماغ کجا ایں قدر، دروغ دروغ
تو و خیالِ وفا، کذب و افترا و غلط
من و توہّمِ مہرِ دگر، دروغ دروغ

۳۳۲

در فضائے سینۂ من نیست اکنوں جائے داغ
دارم از سوزِ محبت داغ بر بالائے داغ

۳۳۳

اے بے تو جوشِ سبزہ و باغ و بہار حیف
بلبل ترا نہ بیند و گوید ہزار حیف
بر باد داد عشق کفِ خاکِ من تمام
گر سر بہ آسماں نہ کشد ایں غبار حیف
صیدِ خوشےست میرؔ در ایں دشتِ خوفناک
از غفلتِ تو رفت اگر آں شکار، حیف

۳۳۴

بہ نہ گردد از دوا بیمارِ عشق
می رود ہمراہِ جاں آزارِ عشق

۳۳۰

آہ تجھے دیکھے بغیر شمع صد سوز و ساز کے ساتھ ہے
شمع کا نیا نیا عاشق دل ترحم کے قابل ہے
رات بزم میں دعویٰ خوبی کرنے سے چپ نہیں رہی
تیرے بغیر شمع کی زبانِ دراز نے مجھے غم زدہ کر دیا
اس کا سراپا بزم میں اشک اور داغ میں صرف ہو گیا
میرؔ میں شمع کے سوز و گداز سے (جل کر) کباب ہو گیا

۳۳۱

میں اور تیرے کوچے سے چلے جانے کا ارادہ، دروغ دروغ
مجھے اتنی تاب کہاں، دروغ دروغ
تو اور وفا کا خیال، کذب اور افترا اور غلط
اور میں دوسری محبت کا خیال، دروغ دروغ

۳۳۲

میرے سینے کی فضا میں اب داغ کی جگہ نہیں ہے
میں محبت کے سوز سے داغ پر داغ رکھتا ہوں

۳۳۳

تیرے بغیر سبزے کی کثرت اور باغ و بہار پر افسوس (ہے)
بلبل تجھے نہیں دیکھتا اور کہتا ہے، ہزار افسوس
عشق نے میری کفِ خاک کو تمام ہوا میں اڑا دیا
اگر یہ غبار آسماں تک نہ پہنچے، افسوس (ہوگا)
اس خوفناک جنگل میں میرؔ ایک اچھا شکار ہے
اگر تیری غفلت سے یہ شکار چھوٹ جائے، افسوس (ہوگا)

۳۳۴

دوا سے عشق کا بیمار اچھا نہیں ہوتا
جان کے ساتھ عشق کا آزار جاتا ہے

جانِ خود را مفت از کف می دہند
دل فروشانِ سرِ بازارِ عشق
موجبِ ایں نظمِ کل دانی کہ چیست
گر شوی آگاہ از اسرارِ عشق
جاں کبابِ گل شدہ ست از داغِ یاس
لیک سرگرم است دل در کارِ عشق
من بہ کم عمری اگر مردم چہ دور
داشتم در دل غمِ بسیارِ عشق
سبز دارد سینۂ پُر داغ من
خوش شگفت ایں تختۂ گلزارِ عشق
تکیۂ ما میرؔ خوش واقع شدہ ست
بر لبِ دریائے لنگردارِ عشق

۳۳۵

می کشد آخر ببینم تا کجاہا کارِ شوق
با در و دیوار اکنوں می کنم اظہارِ شوق
خواستم بنویسم او را یک دو حرف از حالِ زار
چوں قلم آمد بہ دستم، رقعہ شد طومارِ شوق
کار ضائع شد ز اشک افشانیِ ہر لحظہ ام
کرد رسوائے جہانم گریۂ بسیارِ شوق
سال ہا بر مرگِ قیس و کوہکن رفت و ہنوز
در جہاں باقی ست زاں لب تشنگاں گفتارِ شوق
رخنۂ دیوارِ گلشن دیدۂ نظارگی ست
ظاہر است اے میرؔ از اندازِ او آثارِ شوق

اپنی جان کو مفت ہاتھ سے دیتے ہیں
بازارِ عشق کے دل فروش
اس نظمِ کل کا موجب جان لے گا کہ کیا ہے
اگر (تو) عشق کے اسرار سے آگاہ ہو جائے
جان مایوسی کے غم سے کبابِ گل[1] ہو گئی
لیکن دل عشق کے کام میں سرگرم ہے
میں اگر کم عمری میں مر گیا، تعجب کیا ہے
دل میں عشق کا بہت زیادہ غم رکھتا تھا
میرا داغوں سے بھرا سینہ سبز رہتا ہے
عشق کے گلزار میں یہ کیاری اچھی کھلی (ہے)
میرؔ میرا تکیہ اچھی جگہ پر واقع ہے
عشق کے لنگر دار سمندر کے کنارے

۳۳۵

دیکھتا ہوں کہ آخر کہاں تک شوق کا کام کھنچتا ہے
اب در و دیوار سے شوق کا اظہار کر رہا ہوں
چاہا تھا کہ اسے ایک دو حرف اپنے حالِ زار کا لکھوں
جب قلم ہاتھ میں آیا تو رقعہ شوق کا طومار ہو گیا
میری ہر وقت کی اشک افشانی سے کام بگڑ گیا
عشق میں بہت زیادہ رونے نے دنیا میں مجھے رسوا کر دیا
قیس اور کوہکن کی موت کو برسوں گزر گئے اور اب بھی
دنیا میں ان لب تشنگان (کی وجہ) سے عشق کا تذکرہ باقی ہے
گلشن کی دیوار کا رخنہ نظّارگی کی آنکھ ہے
اے میرؔ اس کے انداز سے شوق کی علامتیں ظاہر ہیں

---

[1] گلاب کے پھول کی شکل کا کباب۔

۳۳۶

آں ابروئے خمیدہ کہ باشد کمانِ پاک
ہر دم رسد خدنگِ جفایش بہ جانِ پاک
جاے بہ از درش نہ بود بہرِ سجدہ ام
شرط است از برائے عبادت مکانِ پاک
گل در چمن دہن بہ ہزار آب شستہ است
تا آورد بہ لب سخنے زاں دہانِ پاک
از چشمِ انتظارکشاں چہرہ را مپوش
تاثیرہاست در نظرِ عاشقانِ پاک
مژگانِ خود ز خاکِ درش میرؔ دور دار
ایں خار و خس بروب از آں آستانِ پاک

۳۳۷

چوں می نہم ز عجز سحرگاہ سر بہ خاک
می ریزدم ز چشم ہزاراں گہر بہ خاک
اکثر ز خاک چشمۂ نو جوش می زند
یارب کہ بردہ است بہ خود چشمِ تر بہ خاک
یک شام گہ ز ناز قدم بر سرم گذار
تا کے رخِ نیاز نہم ہر سحر بہ خاک
در دورِ چرخِ سفلہ چہ مذکورِ راحت است
آسودہ بعدِ مرگ شود کس مگر بہ خاک
تا میرؔ چشم کار کند خاکِ آدم ست
باید فگندنت بہ تامّل نظر بہ خاک

۳۳۸

می برد آب ابرِ ایں صحرا ز چشمِ گریہ ناک
لنگر از کف می دہد دریا ز چشمِ گریہ ناک

۳۳۶

وہ خمیدہ ابرو کہ مضبوط کمان ہیں
جانِ پاک پر ہر وقت اس کی جفا کے تیر لگتے رہتے ہیں
میرے سجدے کے لیے اس کے دروازے سے بڑھ کر جگہ نہیں تھی
عبادت کے لیے پاک جگہ ضروری ہے
گل نے چمن میں ہزار آب سے دہن دھویا ہے
تا کہ اس کے پاک دہن کی بات لب پر لا سکے
انتظار کھینچنے والوں کی آنکھوں سے چہرہ مت چھپا
پاک عاشقوں کی نظر میں بہت تاثیریں ہیں
اپنی پلکوں کو میرؔ اس کے دروازے کی خاک سے دور رکھ
ان خار و خس کو اس پاک آستاں سے جھاڑ دے

۳۳۷

جب صبح کے وقت عجز سے خاک پر سر رکھتا ہوں
آنکھوں سے ہزاروں گہر خاک پر بکھیر دیتا ہوں
اکثر خاک سے نیا چشمہ جوش مارتا ہے
یا رب کون اپنے ساتھ چشمِ تر کو خاک میں لے گیا ہے
کبھی ایک شام ناز سے میرا سراپا مال کر
کب تک میں رخِ نیاز ہر سحر خاک پر رکھتا رہوں
چرخِ سفلہ کے دور میں راحت کا کیا ذکر ہے
کوئی مرنے کے بعد مگر خاک میں آسودہ ہوگا
میرؔ جہاں تک آنکھ کام کرتی ہے خاکِ آدم ہے
خاک پر احتیاط سے نظر ڈالنی چاہیے

۳۳۸

چشمِ گریہ ناک (کی وجہ) سے ابر اس صحرا میں بے وقار ہو جاتا ہے
چشمِ گریہ ناک کے سامنے دریا شرمندہ ہو جاتا ہے

ایں بحارِ ارض پیش از من کنارِ خشک داشت
رفتہ کارِ ابرِ تر بالا ز چشمِ گریہ ناک
بشکند ایں کاسۂ دریوزۂ دیدار میرؔ
در ہمہ عالم شدم رسوا ز چشمِ گریہ ناک

۳۳۹

تنہا نیئم ز شوق منِ ناتواں ہلاک
خلقےست از برائے تو اے کامِ جاں ہلاک
زنہار روزگار موافق نہ شد بہ میرؔ
شد آخر از جفائے فلک آں جواں ہلاک

۳۴۰

عہد کردم یا بگیرم در برت با کامِ دل
یا ہماں گیرم کہ در طالع نہ بود آرامِ دل
چشم و دل خصم اند، خواہم شد بہ شہرے کاندر او
کس نہ بیند روئے چشم و کس نہ گیرد نامِ دل
طوفِ دل را بر طوافِ کعبہ نتواں حمل کرد
می دہد دستم بہ صد خونِ جگر احرامِ دل
آں کہ سرگرمِ محبت با ہمہ کس ہست و نیست
پختگی ہایش نیاید در خیالِ خامِ دل
اضطرابِ مفرطِ من نیست بے تحریکِ شوق
می رسد در گوشِ جانم ہر نفس پیغامِ دل
ہر کرا باشد تہِ بسیار خوش باشد کہ ہست
بادہ از خونِ کبوتر سرخ تر در جامِ دل
گر تپیدن ہا بہ ایں رنگ است در آغازِ عشق
من نمی دانم چہ خواہد گشت میرؔ انجامِ دل

دنیا کے یہ سمندر میرے سامنے خشک ساحل (کی حیثیت) رکھتے تھے
ابرِ تر کا کام چشم گریہ ناک کی وجہ سے ترقّی پا گیا
میرؔ دیدارگی گدائی کا یہ کاسہ توڑ ڈال
ساری دنیا میں چشم گریہ ناک کی وجہ سے رسوا ہو گیا ہوں

۳۳۹

میں ناتواں ہی تنہا نہیں آرزو میں مر گیا
اے کامِ جاں ایک خلق تیرے لیے جان دے چکی ہے
زمانہ ہرگز میرؔ سے موافق نہیں ہوا
آخر فلک کی جفا سے وہ جوان ہلاک ہو گیا

۳۴۰

عہد کیا تھا کہ یا تجھے دل کی مراد پوری کرنے کے لیے آغوش میں کھینچوں گا
یا یہی سمجھ لوں گا کہ قسمت میں دل کا چین نہیں تھا
آنکھ اور دل دشمن ہیں، اُس شہر میں ہونا چاہیے کہ جہاں
کوئی آنکھ کی طرف نہیں دیکھتا اور کوئی دل کا نام نہیں لیتا
دل کے طواف کو طوافِ کعبہ پر محمول نہیں کر سکتے
احرامِ دل مجھے صد خونِ جگر کے بعد میسّر ہوتا ہے
وہ جو محبت میں سرگرم ہے، سب کے ساتھ ہے بھی اور نہیں بھی
دل میں اس کی ہوشیاری کا خیالِ خام بھی نہیں آتا
میرا حد سے گزرنے والا اضطراب آرزو کے اکسانے کے بغیر نہیں ہے
میری روح کے کان میں ہر نفس دل کا پیغام پہنچتا ہے
جو بھی تہِ بسیار ہو گا، خوش ہو گا کہ ہے
دل کے جام میں خونِ کبوترا[1] سے زیادہ سرخ شراب
اگر آغازِ عشق میں تڑپنے کا یہی رنگ ہے
میں نہیں جانتا میرؔ کہ دل کا انجام کیا ہو گا

---

[1] ایک شراب کا نام۔

۳۴۱

روئے سخن بہ وصفِ رخت نیست سوئے گل
آں تازگی کجاست، ببینید روئے گل
امروز عندلیب زباں را بہ کام دار
نازک تر است خوئے نگارم ز خوئے گل
بیزار می رسی ز گلستاں مگر کہ میرؔ
بسیار بر دماغِ تو خوردہ ست بوئے گل

۳۴۲

ہر لحظہ آں قیامتِ جان و بلائے دل
صدہا کرشمہ عرض دہد از برائے دل
خوں گشت و داغ گشت و تمامی گداز گشت
لیکن ترددے ست ترا در وفائے دل
ہر چند در عذابِ الیم ام ز دل ولے
گر آیدم بہ دست بیفتم بہ پائے دل
یک چند ترک بردنِ دل ہا ضرورت است
اکنوں نہ ماندہ در شکنِ زلف جائے دل
چیزے کہ دل کشد بہ جہاں میرؔ آں دل است
جہدے نما و شو قدرے آشنائے دل

۳۴۳

خوباں نگاہِ لطف نہ کردند سوئے دل
زیں قوم آں شکستہ نہ دید آرزوئے دل
در کوچۂ تو جانِ بسے دردمند رفت
تا حشر خواہد آمد از آں خاک بوئے دل
خواہش خوش است میرؔ و لیکن نہ ایں قدر
آخر ہلاک کرد ترا آرزوئے دل

۳۴۱

تیرے چہرے کی تعریف میں روئے سخن گل کی طرف نہیں ہے
وہ تازگی کہاں ہے، گل کا چہرہ دیکھیے
عندلیب آج زبان کو منھ میں رکھ
میرے محبوب کا مزاج گل کے مزاج سے زیادہ نازک ہے
میرؔ تو گلستاں سے بیزار آ رہا، ضرور
تجھے بوئے گل بہت ناگوار لگی ہے

۳۴۲

ہر لحظہ وہ قیامتِ جان اور بلائے دل
دل کے لیے سیکڑوں کرشمے پیش کرتا ہے
خون ہو گیا اور داغ ہو گیا اور تمام گھل گیا
لیکن تجھے دل کی وفا پر شک ہے
ہر چند دل کی وجہ سے سخت دردناک عذاب میں ہوں
لیکن مجھے مل جائے تو دل کے پاؤں پر گر پڑوں
کچھ دنوں دلوں کے اڑانے کو ترک کرنا ضروری ہے
اب زلف کی شکن میں دل کے لیے جگہ نہیں رہ گئی ہے
جو چیز کہ دل جہان سے کھینچتی ہے وہ دل ہے
کوشش کر اور دل کی قدر سے واقف ہو

۳۴۳

خوباں نے دل کی طرف مہربانی کی نگاہ نہیں کی
اس قوم سے اس شکستہ نے دل کی مراد نہیں پائی
تیرے کوچے میں بہت سے دردمندوں کی جان گئی ہے
حشر تک اس (کی) خاک سے بوئے دل آئے گی
خواہش اچھی (چیز) ہے مگر میرؔ اس قدر (بھی) نہیں
آخر تجھے آرزوئے دل نے ہلاک کر دیا

۳۴۴

آمدم تنگ ز دل جوئی و دل داریٔ دل
آه تا چند خورد کس غمِ بیماریٔ دل
یاد باشد که به کس انس نه گیری زنہار
جانِ من بندِ گرانے ست گرفتاریٔ دل
یک نگہ بیش بہایش نہ نہادم لیکن
خودپسنداں نہ نمودند خریداریٔ دل
آں چناں دل کہ منش خواستمے دست نہ داد
صرف شد عمرِ گرامی بہ طلب گاریٔ دل
ہر کجا پاے نہی بر سرِ دل می آید
رہ بہ کویش نہ تواں برد ز بسیاریٔ دل
در رہِ دورِ فراقش چہ شکیب و چہ تواں
کس از ایں ہر دو نیامد کہ کند یاریٔ دل
میرؔ در وقتِ علم بازیِ آہ سحری
جز جگر کیست کہ آید بہ سپرداریٔ دل

۳۴۵

در ایں سختی نہ رفت اصلا ز جا دل
الٰہی پارۂ سنگ است یا دل
ز دل افسانہ اے ماندہ ست باقی
تو می خواہی ز من دل را، کجا دل
طریقِ عاشقی مشکل طریقے ست
در ایں رہ کار بسیار است با دل
بہ یک بے طاقتی آرم بہ رحمش
دہد گر پاسِ عشقِ او مرا دل

۳۴۴

میں دل کی دل جوئی اور دل داری (کرنے) سے تنگ آ گیا
آہ کوئی کب تک دل کی بیماری کا غم کھائے
یاد رہے کہ ہرگز کبھی کسی سے اُنس نہ پیدا کر
میری جان دل کا گرفتار ہو جانا ایک مشکل قید ہے
میں نے اس کی قیمت ایک نگاہ سے زیادہ نہیں رکھی تھی، لیکن
خود پسند دل کی خریداری پر آمادہ نہ ہوئے
ویسا دل جو میں اس سے چاہتا تھا میسّر نہیں ہوا
عمرِ گرامی دل کی طلب میں صرف ہوگئی
جہاں بھی (تو) پاؤں رکھتا ہے دل کے اوپر آ جاتا ہے
اس کے کوچے میں دل کی کثرت سے راستہ نہیں چل سکتے
اس کے فراق کی دشوار راہ میں کیا صبر اور کیا طاقت
ان دونوں میں سے کوئی نہیں آیا کہ دل کی مدد کرے
میرؔ آہِ سحری کی علم بازی[1] کے وقت
جگر کے سوا کون ہے جو دل کی حفاظت کے لیے آئے

۳۴۵

اس سختی میں بھی دل (اپنی) جگہ سے ہرگز نہیں ہلا
الٰہی (یہ) پتھر کا ٹکرا ہے یا دل
دل کا ایک افسانہ باقی رہ گیا ہے
تو مجھ سے دل مانگتا ہے، دل کہاں ہے
عاشقی کا راستہ مشکل راستہ ہے
اس راہ میں دل سے بہت کام پڑتا ہے
ایک غش سے اس (محبوب) کو رحم کرنے پر آمادہ کر دوں
اگر دل مجھے اس کے عشق کا واسطہ دے

---

[1] محرم کے علم یا جھنڈے کو طرح طرح سے اچھالنے اور روکنے کے کمال دکھانا۔

رسیدی گر بہ دل در کعبہ ای میرؔ
کہ چنداں نیست راہ از کعبہ تا دل

۳۴۶

خواہم کہ دمے غلطم مستانہ بہ پائے گل
بر خاک بینداز م تکلیفِ ہوائے گل
ما کہنہ گرفتاراں از گل چہ خبرداریم
داریم گلِ داغے بر سینہ بجائے گل
ما مدِّ نظر داریم دل جوئی بلبل را
در باغ نمی آئیم اے میرؔ برائے گل

۳۴۷

با خلق چہرہ گشتم از آشنائی دل
شد باعثِ کدورت آخر صفائی دل
تا رفت از برِ من شورے ست در سرِ من
سودا بہم رساندم از بےوفائی دل
از درد سینہ ریشم، از غم بہ فکرِ خویشم
بسیار شاق آمد بر من جدائی دل
فرہاد و کوہ کندن افسانہ اے ست بشنو
بودہ ست در حقیقت زورآزمائی دل
زیں دام گہ کہ ہر جا صدہا فریب دارد
دشوار می نماید ما را رہائی دل
در وادیِ محبت دل را دلیلِ خود کن
راہے نمی نماید بے رہنمائی دل
چوں عشق برگزیند، روئے کسے نہ بیند
القصہ کشت ما را بےاعتنائی دل
بربند چشم و بنگر در جلوہ رنگ ہا را
از لطف نیست خالی سیرِ خدائی دل

اگر دل تک پہنچ گیا (تو اے) میرؔ (تو) کعبہ میں ہے
کہ کعبہ سے دل تک کچھ فاصلہ نہیں ہے

۳۴۶

چاہتا ہوں کہ کسی وقت گل کے پاؤں پر مستانہ لوٹوں
گل کی آرزو کی دعوت کو خاک پر بچھا دوں
ہم پرانے گرفتار گل کی کیا خبر رکھیں
گل کے بجائے سینہ پر ایک داغ کا گل ہے
ہم بلبل کی دل جوئی کو مدِ نظر رکھتے ہیں
میرؔ ہم باغ میں گل کے لیے نہیں آتے ہیں

۳۴۷

دل سے آشنائی کی وجہ سے لوگوں سے منھ موڑ لیا
دل کی صفائی آخر کدورت کا سبب بن گئی
جب سے (وہ) پہلو سے گیا ہے، میرے سر میں سودا سما گیا ہے
دل کی بے وفائی کی وجہ میں نے دیوانگی بہم پہنچائی ہے
درد سے سینہ چاک ہوں، غم سے اپنی فکر میں ہوں
مجھ پر دل کی جدائی بہت شاق گزری
فرہاد اور پہاڑ کاٹنا، سنو ایک افسانہ ہے
درحقیقت دل کی زور آزمائی تھی
اس دام گاہ سے کہ ہر جگہ (یہاں) ہزاروں پھندے ہیں
مجھے دل کی رہائی مشکل نظر آتی ہے
محبت کی وادی میں دل کو اپنا راہبر بنا
دل کی رہ نمائی کے بغیر کوئی راستہ نظر نہیں آتا
جب عشق ابھر کر آتا ہے، کسی کا منھ نہیں دیکھتا
مختصراً مجھے دل کی بے اعتنائی نے مار ڈالا
آنکھیں بند کر اور جلوے میں رنگوں کو دیکھ
دل کی دنیا کی سیر لطف سے خالی نہیں ہے

شد اشک خوں مبادا چشمِ تو بشکند میرؔ
ایں کاسہ را نگہ دار بہرِ گدائیِ دل

۳۴۸

تا چند اضطراب کند در کنار دل
آزردہ دل، ستم زدہ دل، بےقرار دل

۳۴۹

فراموشت نہ خواہم کرد تا در جسم جاں دارم
چو مرغِ دوست حرفِ دوست اکثر بر زباں دارم
سخن پردازیم دارد شنیدن، یک زماں بشنو
کہ از اندوہِ بےپایاں بہ لب صد داستاں دارم
تو اے دل در ہجومِ اشک تا رفتی و گم گشتی
فغاں ہا یک بیاباں چوں درائے کارواں دارم
بہ کویش ہر چہ بادا باد امشب می روم لیکن
امیدِ مرحمت یک دم ز خوابِ پاسباں دارم
ز دستم حالیا جز خانہ ویرانی نمی آید
کہ من اے میرؔ قصدِ رفتنے زیں خاکداں دارم

۳۵۰

چشم بے روئے تو چوں چشمۂ جوشاں دارم
دل در آغوش چو سیلابِ خروشاں دارم
بےخودی کن چو فراموشیِ غم می خواہی
من چنیں یاد ز در باختہ ہوشاں دارم
تا کجا عمر بہ کنجے گذرانم تنہا
قصدِ ہم صحبتیِ خانہ بدوشاں دارم

میرؔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اشکِ خوں تیری آنکھیں بہا لے جائے
اس کاسے کو دل کی گدائی کے لیے حفاظت سے رکھ

۳۴۸

دل کب تک پہلو میں اضطراب کرتا رہے
آزردہ دل، ستم زدہ دل، بے قرار دل

۳۴۹

جب تک جسم میں جان رکھتا ہوں تجھے فراموش نہیں کروں گا
مرغِ دوست[1] کی طرح دوست کا لفظ اکثر زبان پر لاتا ہوں
میری باتیں سننے کے لائق ہیں، کسی وقت سنو
کہ لب پر بے انتہا غم کی سوداستانیں ہیں
اے دل تو ہجومِ اشک میں جب سے گیا اور کھو گیا ہے
کارواں کی جرس کی طرح ایک بیابان فغاں رکھتا ہوں
جو ہو سو ہو، آج رات اس کے کوچے میں جاؤں گا، لیکن
پاسباں کی نیند سے ایک پل کی مہربانی کی امید رکھتا ہوں
میرے ہاتھوں سے اب خانہ ویرانی کے سوا کچھ (ظہور میں) نہیں آتا
کہ اے میرؔ میں اس خاک داں سے جانے کا قصد رکھتا ہوں

۳۵۰

تجھے دیکھے بغیر میری آنکھیں ابلتے ہوئے چشمے کی طرح ہیں
میرے پہلو میں دل بپھرے ہوئے سیلاب کی طرح ہے
بے خودی (اختیار) کر اگر غم کو فراموش کرنا چاہتا ہے
میں ہوش گنوا بیٹھنے والوں کی یہی (بات) یاد رکھتا ہوں
کب تک ایک گوشے میں تنہا عمر گزاروں
خانہ بدوشوں کی ہم صحبتی کا قصد رکھتا ہوں

---

[1] ایک پرندہ جو ''یا دوست'' ''یا دوست'' کہتا معلوم ہوتا ہے۔

دل ز جایم نہ برد پرتوِ ماہ و خورشید
دعویِ عاشقیِ بادلہ پوشاں دارم
پارہ ہائے جگر و دل بہ بغل می گردم
من بہ کویش روشِ دست فروشاں دارم
کارِ دل ہیچ ز وارستگیٔ من نہ کشود
خواہشِ بندگیٔ حلقہ بگوشاں دارم
گر شوم کشتہ زباں را نہ کشایم چوں شمع
ایں سخن میرؔ بہ خاطر ز خموشاں دارم

۳۵۱

چوں ابر نیست بےجا گر گریہ ہا نمودم
عمرے در ایں گلستاں چشم آب دادہ بودم
با ہر کہ مہر ورزم بندد کمر بہ کینم
در عشق بختِ خود را صد بار آزمودم
آں شوخ از نیازم مغرورتر شد آخر
ہرگز نہ داد سودم ہر چند جبہ سودم
مشتاقِ قصۂ من بسیار بود مجنوں
چوں سرگذشت گفتم، ہوش از سرش ربودم
ایں گل زمینِ دل کش یکسر نہ دیدنی بود
من میرؔ کاش ایں جا چشمے نمی کشودم

۳۵۲

شب و روز در جستجوئے دلم
من از خاک شویانِ کوئے دلم
مرا حیرتِ حسنش آئینہ کرد
بہ سوئے کسے نیست روئے دلم

ماہ اور خورشید کے پرتو نے میرے دل کو نہیں چرایا
بادلہ پوشوں[1] کے عشق کا دعویٰ رکھتا ہوں
دل اور جگر کے ٹکڑوں کو بغل میں لیے پھرتا ہوں
میں اس کے کوچے میں دست فروشوں[2] کا انداز رکھتا ہوں
دل کی مراد میری بے خودی سے کچھ بھی پوری نہیں ہوئی
حلقہ بگوشوں[3] کی خدمت کرنے کی خواہش رکھتا ہوں
اگر قتل ہو جاؤں (پھر بھی) شمع کی طرح زباں نہ کھولوں
میرؔ میں نے (اپنے) دل میں چپ رہنے والوں سے یہ عہد کیا ہے

۳۵۱

بے جا نہیں ہے اگر ابر کی طرح رویا ہوں
مدت سے اس گلستان میں آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے رہتا تھا
جس سے بھی محبّت کرنا شروع کرتا ہوں میرے کینہ پر کمر باندھ لیتا ہے
عشق میں اپنی تقدیر کو سو بار آزمایا ہے
وہ شوخ میری عاجزی سے آخر اور زیادہ مغرور ہو گیا
مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہر چند جبیں سائی کی
مجنوں میرے قصہ کا بہت زیادہ مشتاق تھا
جب میں نے سرگزشت سنائی اس کے سر سے ہوش اڑا دیا
یہ دلکش سرسبز و شاداب زمین بالکل سیر کے لائق نہیں تھی
میں نے میرؔ کاش اس جگہ آنکھ نہ کھولی ہوتی

۳۵۲

شب و روز دل کی جستجو میں ہوں
میں دل کے کوچے میں مٹی سے سونے چاندی کے ذرّے نکالنے والوں میں سے ہوں
مجھے اس کے حسن کی حیرت نے آئینہ بنا دیا
میرے دل کا رخ کسی اور کی طرف نہیں ہے

---

[1] چاندی اور سونے کے تاروں سے بنے ہوئے کپڑے پہننے والے۔
[2] پھیری کرنے والے۔
[3] غلاموں۔

گہ از پشتِ پا چشم برداشتہ
نگاہے نہ کردی بہ سوئے دلم
بہ فریادِ او گوش دارم مدام
چہ وارفتۂ ہائے و ہوئے دلم
بلے بہرِ او میرؔ جاں می دہد
جگر خوں شد از آرزوئے دلم

۳۵۳

بےخود بہ کوئے بادہ‌فروشاں فتادہ ام
از نشأتین بے خبرم، مستِ بادہ ام
می داشتم امیدِ وصالش از ایں سبب
جاں را بہ روزگارِ جدائی نہ دادہ ام
بر من چو کار تنگ شود بگذرم ز جاں
کارم حمیّت است کہ اشراف زادہ ام
شرمم نگاہ دار خدایا کہ وقتِ شیب
بر آستانِ مغبچہ اے رونہادہ ام
با شیخِ شہر و واعظِ مسجد مرا چہ کار
من میرؔ دست بیخِ جوانانِ سادہ ام

۳۵۴

با غم جاودانہ ساختہ ام
چہ کنم با زمانہ ساختہ ام
غم در ایں پردہ می کنم ظاہر
شاعری را بہانہ ساختہ ام
قاصدے آخر از سرشکِ گرم
جانبِ او روانہ ساختہ ام
تا بہ بت خانہ ام رہے باشد
طورِ خود کافرانہ ساختہ ام

کبھی پشتِ پا سے نظر اٹھا کر
میرے دل کی طرف (تو نے) ایک نگاہ (بھی) نہیں کی
اس کی فریاد کو ہمیشہ سنتا ہوں
دل کی ہاؤ و ہو پر کتنا فدا ہوں
ہاں، اس کے لیے میرؔ جان دیتا ہے
میرے دل کی آرزو سے جگر خون ہو گیا

۳۵۳

میں بادہ فروشوں کے کوچے میں بے خود پڑا ہوں
دونوں جہاں سے بے خبر ہوں، شراب میں مست ہوں
میں اس سے وصل کی امید رکھتا تھا اسی وجہ سے
(میں نے) جدائی کے دنوں میں جان نہیں دی
جب مجھ پر کام دشوار ہو گا جان سے گزر جاؤں گا
میرا کام حمیّت ہے کیوں کہ (میں) اشراف زادہ ہوں
اے خدا میری شرم رکھ کہ بڑھاپے میں
ایک مغ بچہ کے آستان پر سر جھکایا ہے
شیخِ شہر اور واعظِ مسجد سے مجھے کیا کام
میں میرؔ جوانانِ سادہ کو بک چکا ہوں

۳۵۴

میں نے دائمی غم کے ساتھ نباہ کر لی ہے
کیا کروں زمانے کے ساتھ نباہ کر لی ہے
اس کے پردے میں غم ظاہر کرتا ہوں
شاعری کو بہانہ بنا لیا ہے
اشکِ گرم کا ایک قاصد آخرِ کار
اس کی جانب روانہ کیا ہے
تا کہ بت خانے تک میری رسائی ہو
اپنا طور کافرانہ بنا لیا ہے

سادگی بیں کہ آتشیں نفس ام
و ز نئے خشک خانہ ساختہ ام
من نہ دانم کہ در غمش تا حال
کارِ خود را چرا نہ ساختہ ام
بر امیدِ خدنگِ نازِ کسے
جگرے را نشانہ ساختہ ام
بے تو دانستہ من بہ رسوائی
خویشتن را فسانہ ساختہ ام
جان و جاناں یک است و من اے میرؔ
صد سخن درمیانہ ساختہ ام

۳۵۵

اشک چوں الماس می ریزد ز مژگاں در برم
نہرِ الماس است گویا میرؔ ایں چشمِ ترم
مدّتے شد طائرِ جاں کرد پروازے و ہست
یادبودے در قفس تا حال از بال و پرم
کارِ من از جوشِ غم آخر بہ رسوائی کشید
تنگ چوں بسیار می آیم، گریباں می درم
اندکے دم درکش اے بلبل، دماغم می رود
تا کجا ایں شورِ بےحاصل بہ درد آمد سرم
رفت آں موسم کہ رو بر روئے گل می داشتم
حالیا از چرخ می ریزد خسک بر بسترم
بس کہ می بالد بہ خود خواہم کہ سروِ باغ را
قامتت بنایم و بر سر قیامت آورم

سادگی دیکھ کہ آتشیں نفس ہوں
اور خشک نے[1] اسے گھر بنایا ہے
میں نہیں جانتا کہ اس کے غم میں اب تک
میں نے خود کو کیوں ہلاک نہیں کر دیا
کسی کے ناز کے تیر کی امید میں
جگر کو نشانہ بنایا ہے
تیرے بغیر جان بوجھ کر رسوائی سے
اپنے آپ کو افسانہ بنا دیا ہے
جان اور جاناں ایک ہیں اور اے میرؔ میں نے
درمیان میں ہزاروں باتیں بنائی ہیں

۳۵۵

پلکوں سے الماس جیسے آنسو میری گود میں گرتے ہیں
میرؔ میری یہ چشمِ تر گویا نہرِ الماس[2] ہے
مدت ہوگئی کہ طائرِ جاں پرواز کر چکا ہے اور
قفس میں اب تک میرے بال و پر کی یادگار باقی ہے
میرا عشق غم کی شدّت سے آخر رسوائی تک پہنچ گیا
جب بہت تنگ آ جاتا ہوں گریباں پھاڑتا ہوں
اے بلبل تھوڑا خاموش رہ، میرا دماغ اڑ جاتا ہے
کب تک یہ بے حاصل شور، میرے سر میں درد ہو گیا
وہ موسم گزر گیا کہ گل کے رخسار پر رخسار رکھتا تھا
ان دنوں آسماں سے میرے بستر پر خس و خاشاک گرتے ہیں
خود پر بہت ناز کرتا ہے، چاہتا ہوں کہ باغ کے سرو کو
تیری قامت دکھلاؤں اور (اس کے) سر پر قیامت لاؤں

---

[1] بانس، نرسل۔ بانسری۔
[2] ایک دریا کا نام۔

گر چہ بابِ آتش‌ام از ارتکابِ آبِ رز
شاد و شاداں می زیم لیکن بہ امیدِ کرم

۳۵۶

یک دم اے کاش بہ مقصودِ دل آئی بہ برم
تا کجا سوئے تو از دور بہ حسرت نگرم
رہ بہ دل بردم و فارغ شدم از دیر و حرم
ختم گردید بر ایں آبلہ سیر و سفرم
جائے اشک از مژہ خوناب رواں ساختہ ام
روئے خوبِ تو اگر رفتہ دمے از نظرم
گر بہ سر منزلِ ما پا بگذاری، الطاف
ور بہ پرسش بدہی رنج لبِ خویش، کرم
ہم چو من عاشقِ طفلانِ بداوضاع نہ شد
خوب گذراند تحیّات بہ روحِ پدرم
از چہ راہ است نہ دانم کہ تو می پوشی چشم
من بہ راہِ تو ز نقشِ قدم افتادہ ترم
طائرے نیست کہ امسال بہ گلزار نہ رفت
وائے بر حالِ منِ زار کہ بے بال و پرم
فتنہ از دیر چو من عاشقِ صادق می خواست
کرد پیدا فلکِ سفلہ بہ خونِ جگرم
من چہ دانم کہ چہ ہنگامہ در ایں مصطبہ است
نشۂ شوقِ تو دارد ز جہاں بے‌خبرم
عاقبت خواہشِ وصلِ تو دلم برد بہ خاک
قدمے رنجہ نہ کردی، نہ رسیدی بہ سرم
کارِ عشقم بہ جنوں کاش کشد یک دو سہ روز
کہ کشم دامنِ آں شوخ و بہ صحرا ببرم

اگرچہ آبِ رزا[1] کے ارتکاب کی وجہ سے آتش کا مستحق ہوں
لیکن امیدِ کرم پر شاد اور شاداں زندہ رہتا ہوں

۳۵۶

پل بھر کاش دل کی مراد پوری کرنے کے لیے میری آغوش میں آ
کب تک تیری طرف دور سے حسرت کے ساتھ دیکھتا رہوں
دل کی راہ لی اور دیر وحرم سے فارغ ہوگیا
اس آبلے پر میرا سیر وسفر ختم ہوگیا
آنسوؤں کے بجائے آنکھوں سے (میں نے) خوناب جاری کیا ہے
اگر تیرا خوبصورت چہرہ دم بھر کے لیے میری نظروں سے دور ہوا
اگر ہماری منزل میں قدم رکھتا ہے: الطاف
اگر پرشش کے لیے اپنے ہونٹوں کو تکلیف دیتا ہے: کرم
میری طرح بد اوضاع لڑکوں کا عاشق (کوئی) نہیں تھا
میرے والد کی روح پر خوب ثواب بھیجتے تھے
کس وجہ سے تو چہرہ چھپاتا ہے نہیں جانتا ہوں
میں تیری راہ میں نقشِ قدم سے بھی زیادہ بچھا ہوا ہوں
کوئی پرند نہیں ہے کہ اس سال گلزار میں نہ گیا
مجھ ناتواں کے حال پر افسوس کہ بے بال و پر ہوں
فتنہ دیر سے مجھ جیسا عاشقِ صادق چاہتا تھا
فلکِ سفلہ نے خونِ جگر سے مجھے پیدا کردیا
میں کیا جانوں کہ اس شراب خانہ میں کیا ہنگامہ ہے
تیرے عشق کا نشہ مجھے دنیا سے بے خبر رکھتا ہے
میرا دل آخرِ کار تیرے وصل کی آرزو خاک میں لے گیا
(تو نے) قدموں کو زحمت نہیں دی، میری بالیں پر نہیں آیا
کاش میرے عشق کا کام جنوں سے دو ایک روز (اور) کھنچے
کہ اس شوخ کا دامن کھینچوں اور صحرا میں لے جاؤں

---

[1] انگور کا پانی، شراب۔

وہ چہ حال است کہ ناچار ز بیمِ اغیار
از تو چوں می گذرم، از سرِ جاں می گذرم
یارب اے خانہ برانداز کجا ای تو کہ من
خاک مالیدہ بہ تن شام و سحر در بہ درم
ترک کن میرؔ بکائے دلِ شب را دو سہ روز
دورِ چشم تو ز حد بیش نمودہ ست ورم

۳۵۷

مردم بہ ذوقِ تیغِ تو خوں سیر می خورم
من مے بہ طاقِ ابروئے شمشیر می خورم
مو شد سفید و طفل مزاجی ہماں کہ بود
چوں صبح پیر گشتہ ام و شیر می خورم
از من کمانِ آں ستم آئیں نمی کشد
چوں می شوم مقابلِ او تیر می خورم
از بہرِ من بہ قید جنوں ایں قدر بس است
ہر روز چند دانہ ٔ زنجیر می خورم
از فرطِ غم چو از ہمگی زرد گشتہ ام
گر دست می دہد بہم اکسیر می خورم
ہست ایں جوابِ آں غزلِ آرزوؔ کہ گفت
در ہر قدم ز آبلہ زنجیر می خورم
ہستم فقیر میرؔ و نیَم لذّت آشنا
نانِ جواں بہ ناں خورشِ پیر می خورم

۳۵۸

چو اشک سختیِ غربت کشیدہ می آیم
چکیدۂ دل ام از راہِ دیدہ می آیم
ہزار حیف اگر گل بہ من نہ پیوندد
ز آشیاں بہ امیدے پریدہ می آیم

یہ بھی کیا حال ہے کہ میں غیروں کے خوف سے ناچار
جب تیرے پاس سے گزرتا ہوں (گویا) اپنی جان سے گزر جاتا ہوں
یارب، اے گھروں کے تباہ کرنے والے تو کہاں ہے کہ میں
بدن پر خاک ملے شام وسحر در بدر ہوں
میرؔ دو تین روز آدھی رات کا رونا ترک کر
تیری آنکھوں کے گرد حد سے زیادہ ورم آ گیا ہے

۳۵۷

ہر لحظہ تیری تیغ کے شوق میں خوب خون پیتا ہوں
میں شمشیر کے خمیدہ ابرو سے شراب پیتا ہوں
بال سفید ہو گئے اور بچکانہ مزاج وہی ہے جو کہ تھا
صبح کی طرح بوڑھا ہو گیا اور دودھ پیتا ہوں
میں اس ستم آئیں کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا
جب اس کے مقابل ہوتا ہوں تیر کھاتا ہوں
جنوں کی قید میں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے
ہر روز زنجیر کی چند کڑیاں کھا جاتا ہوں
غم کی زیادتی سے بالکل پیلا پڑ گیا ہوں
اگر ہاتھ لگ جائے اکسیر کھاؤں گا
یہ آرزوؔ کی اس غزل کا جواب ہے کہ (جس نے) کہا تھا
ہر قدم پر آبلے کی وجہ سے لڑکھڑا رہا ہوں
میرؔ فقیر ہوں اور لذّت سے واقف نہیں ہوں
تازہ روٹی باسی شوربے کے ساتھ کھاتا ہوں

۳۵۸

اشک کی طرح غربت کی سختی جھیل کر آیا ہوں
دل سے ٹپکا ہوں، آنکھوں کی راہ سے آیا ہوں
ہزار حیف اگر گل مجھ سے تعلق نہ رکھے
آشیاں سے ایک امید کے ساتھ اڑ کر آیا ہوں

اگر ز سایۂ خود وحشتے کنم بر جاست
شکارِ دشتِ جنوں ام رمیدہ می آیم
تو آہ گوش بہ حرفم نمی گذاری و من
چہ ہا برائے تو اے گل شنیدہ می آیم
ز حالِ میرؔ چہ پرسی کہ من بہ حال خراب
فتادہ اش بہ سرِ راہ دیدہ می آیم

۳۵۹

پیش از ایں ما ہم سخن سازِ نکوے داشتیم
نوخطِ دل چسپ، نستعلیق گوے داشتیم
حالیا در کشورِ خوبی کفِ خاکسترایم
یادِ ایامے کہ چوں آئینہ روے داشتیم
بعدِ ما روزے نگہ بر بیدِ مجنونش فتاد
گفت ما ہم ایں چنیں ژولیدہ موے داشتیم
نیست آں شورِ مزج اکنوں کہ چوں دیوانگاں
بر سرِ کوئے کسے شب ہائے و ہوئے داشتیم
لحظہ لحظہ سوئے او افتاں و خیزاں می شدیم
تا بہ تن جاں داشتیم اندازِ گوے داشتیم
بہرِ آں سرمایۂ جاں ہر درے را می زدیم
طاقتے تا بود در پا جستجوے داشتیم
یادِ آں عاشق شرابی ہا کہ روز و شب بہ باغ
چوں گلِ تریاک ما با خود سبوے داشتیم
موسمِ دیوانگی خوش موسمے بودہ ست میرؔ
با خیالِ یار ہر دم گفتگوے داشتیم

اگر اپنے سائے سے وحشت کروں بجا ہے
دشتِ جنوں کا شکار ہوں، بھاگ کر آیا ہوں
تو آہ بات میری نہیں سنتا اور میں
اے گل تیرے لیے کیا کیا کچھ سنتا آیا ہوں
میرؔ کا حال کیا پوچھتے ہو کہ میں خراب حال میں
اسے راہ میں پڑا ہوا دیکھ کر آ رہا ہوں

۳۵۹

اس سے پہلے ہمارا بھی ایک عمدہ سخن ساز (دوست) تھا
ایک دل چسپ نو خط، نستعلیق گو[۱] (دوست) تھا
اب کشورِ خوبی میں (ہم) کفِ خاکستر ہیں
وہ دن یاد آتے ہیں کہ (جب) آئینے کی طرح چہرہ رکھتے تھے
ہمارے بعد ایک دن (اُس نے) اپنے بیدِ مجنوں پر نگاہ ڈالی
(اور) کہا ہم بھی ایسا ہی ژولیدہ مو[۲] رکھتے تھے
وہ شورِ مزاج اب نہیں ہے کہ دیوانوں کی طرح
کسی کے کوچے میں رات کو ہائے و ہو کرتے تھے
(ہم) دم بدم اس کی طرف گرتے پڑتے جاتے تھے
جب تک جسم میں جاں رکھتے تھے گیند کا (سا) انداز رکھتے تھے
اس سرمایۂ جاں کے لیے ہر دروازے کو کھٹکھٹاتے تھے
جب تک پاؤں میں طاقت تھی جستجو کرتے تھے
ان عاشق شرابیوں کی یاد کہ باغ میں روز و شب
گل تریاک[۳] کی طرح ہم سبو اپنے ساتھ رکھتے تھے
موسمِ دیوانگی اچھا موسم رہا تھا میرؔ
یار کے خیال سے ہر دم گفتگو کیا کرتے تھے

---

۱ فصیح و بلیغ گفتگو کرنے والا۔
۲ جھبرے بالوں والا۔
۳ افیوں کا پھول۔

۳۶۰

پُر بہ تنگ ام جانبِ صحرا دگر رو می کنم
کارِ خود را در جنوں ایں بار یک‌سو می کنم
آخر از جورِ تو خواہد گشت روزِ من سیاہ
اندک اندک با فغانِ نیمہ‌شب خو می کنم
بوئے او بسیار می ماند بہ بوئے یار میرؔ
زیں سبب در باغ گل را دیر تر بو می کنم

۳۶۱

بے تو شاخِ بریدہ را مانم
تازہ آفت رسیدہ را مانم
رفتم از جا و نیستم جاے
رنگے از رخ پریدہ را مانم
نیست بیش از خیال ہستیِ من
صورتِ ناکشیدۂ را مانم
شد رہِ آشیاں فراموشم
طائرِ نوپریدہ را مانم
من ادب دانِ بزم دہر نیَم
طفلِ صحبت نہ دیدہ را مانم
چشمِ خوں بار کرد گل رنگم
صیدے در خوں تپیدہ را مانم
میرؔ در غورگی مویز شدم
میوۂ خام چیدہ را مانم

۳۶۲

بےسبب نیست کہ پا بر سرِ دنیا زدہ ایم
تنگ بودیم در ایں خانہ بہ صحرا زدہ ایم

۳٦۰

بہت تنگ (ہوکر) صحرا کی طرف دوبارہ رخ کرتا ہوں
اپنا کام جنوں میں اس مرتبہ یک سو کرتا ہوں
آخر تیرے ظلم سے میرا دن تاریک ہو جائے گا
تھوڑی تھوڑی فغانِ نیم شب کی خو ڈال رہا ہوں
اس کی خوشبو بہت زیادہ یار کی خوشبو کی طرح ہے میرؔ
اس سبب سے (میں) باغ میں گل کو زیادہ دیر تک سونگھتا ہوں

۳٦۱

تیرے بغیر کٹی ہوئی شاخ کی طرح ہوں
تازہ آفت رسیدہ کی طرح ہوں
جگہ سے چلا گیا اور میری جگہ نہیں ہے
چہرے سے اڑے ہوئے رنگ کی طرح ہوں
میری ہستی (ایک) خیال سے زیادہ نہیں
بغیر کھینچی ہوئی تصویر کی طرح ہوں
مجھ سے آشیاں کی راہ فراموش ہو گئی ہے
نئے اڑے ہوئے پرندے کی طرح ہوں
میں دنیا کی بزم کے آداب جاننے والا نہیں ہوں
اس بچے کی طرح ہوں (جسے) لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا ہے
خوں بہانے والی آنکھوں نے مجھے گل رنگ کر دیا
خوں میں تڑپتے ہوئے شکار کی طرح ہوں
میرؔ کمال تک پہنچنے سے پہلے مجھے زوال آ گیا
کچے توڑے ہوئے پھل کی طرح ہوں

۳٦۲

بے سبب نہیں ہے کہ ہم نے دنیا پر لات ماری ہے
(ہم) اس گھر میں تنگ تھے صحرا کی طرف نکل گئے ہیں

بے رخت خوں شدہ از دیدہ فروریختہ است
گر بہ تکلیفِ کسے ساغر صہبا زدہ ایم
معتبر نیست اگر حرفِ پریشاں گفتیم
عذرِ ما را بپذیرید کہ سودازدہ ایم
باعثِ رفتنِ سرہائے کساں خواہد شد
در رہِ عشق تو ایں تیشہ کہ بر ما زدہ ایم
کم نہ شد سوزِ درون گرچہ ز بےتابی میرؔ
بارہا مضطرب الحال بہ دریا زدہ ایم

۳۶۳

پئے قوت پیشِ فلک من نہ نالم
چہ لازم کہ بر شیشہ ناں را بمالم
ز حالم سخن با مصیبت کشے کن
چہ دانند آسودگاں در چہ حالم
ز دنیا و عقبیٰ چہ کار است ما را
بہ عشقش گذشتیم از ہر دو عالم
جدا از تو مفت است گر من بمیرم
کہ جاں بر لب آمد ز شوقِ وصالم
فلک کاہشِ بندہ واجب شمارد
از آں رو کہ چوں بدر صاحب کمالم
نہ دانم ز بالیدن و سبز گشتن
کہ پژمردہ از خاک سرزد نہالم
بنالم پئے آں کمر میرؔ ہر دم
جز ایں نگذرد ہیچ اندر خیالم

۳۶۴

چہ می پرسی چرا غربت شعارِ خویشتن کردم
ز حد بگذشت رسوائی کہ من ترکِ وطن کردم

تیرے رخ کے بغیر خون ہو کر آنکھوں سے زمین پر بہہ گیا
اگر ہم نے کسی کی درخواست پر ساغر صہبا چڑھایا
ہم نے اگر پریشاں گفتگو کی (تو وہ) معتبر نہیں ہے
ہمارا عذر قبول فرمایے کہ (ہم) سودا زدہ ہیں
کن کن لوگوں کے سر اڑ جانے کا باعث بن جائے گا
تیری راہِ عشق میں یہ تیشہ جو ہم نے خود پر مارا ہے
سوزِ دروں کم نہیں ہوا اگرچہ میرؔ بے تابی سے
بارہا پریشان (ہو کر) سمندر (بھی) پی چکا ہوں

۳۶۳

کھانے کے لیے فلک کے سامنے میں نہیں روتا
کیا لازم ہے کہ بے فائدہ کام کروں
میرے حال کی بات کسی مصیبت کش سے کر
آرام سے رہنے والے کیا جانیں (کہ میں) کس حال میں ہوں
دنیا اور عقبیٰ سے ہمارا کیا کام ہے
اس کے عشق میں ہر دو عالم کو ترک کر چکے ہیں
تجھ سے جدا (ہو کر) مفت ہے اگر میں مر جاؤں
کہ تیرے وصال کے شوق میں جان لب پر آ گئی ہے
آسماں میری کاہش کو واجب شمار کرتا ہے
اس وجہ سے کہ (میں) بدر کی طرح صاحبِ کمال ہوں
میں نشوونما پانا اور سبز ہونا نہیں جانتا
کہ میرا پودا مٹّی سے (ہی) مرجھایا ہوا نکلا تھا
اس کمر کے لیے میرؔ ہر دم روتا ہوں
اس کے سوا کچھ بھی میرے دھیان میں نہیں آتا

۳۶۴

کیا پوچھتے ہوں کیوں میں نے غریب الوطنی کو اپنا شعار کر لیا
رسوائی حد سے (اتنی) گزر گئی (تھی) کہ میں نے ترکِ وطن کر لیا

نیامد در مشام از ہیچ شاخم نکہتِ انسے
بہ امیدِ وفا بسیار گشتِ ایں چمن کردم
بہ یادم داد از نو بےکسی یارانِ دیریں را
شدم تنہا و یادِ عہدِ قیس و کوہکن کردم
نمی بردم ترا کاش از رہِ دیر و حرم ظالم
جفائے بےحدے بر حالِ شیخ و برہمن کردم
دگرگوں گشت رنگِ بزم از حرفِ غم افزایت
غلط کردم ترا اے میرؔ تکلیفِ سخن کردم

۳۶۵

خواہم کہ شوم ابرِ تر و زار بگریم
بر رو بکشم دامن و بسیار بگریم
یارب چہ تمنّاست گرہ در دلِ زارم
ہر گاہ کشایم لبِ اظہار، بگریم
از چاکِ جگر طرح کنم خندہ کہ تا چند
بے روئے گلے در پسِ دیوار بگریم
شرط است اگر کار کند جذبِ محبت
تنگش بہ بغل درکشم و زار بگریم
صد رنگ سخن میرؔ بہ لب دارم و ناچار
وقتے کہ کشد کار بہ گفتار، بگریم

۳۶۶

بہ جانم از فراقش مبتلائے صد بلا گشتم
کہ افسونِ جدائی خواند کز جاناں جدا گشتم
شناسائے نہ ماند از آشیانم در چمن ہرگز
کہ بعد از مدّتے از قیدِ صیاداں رہا گشتم

کسی بھی شاخ سے محبت کی بو مشام میں نہیں آئی
وفا کی امید پر اس چمن میں بہت گشت کی
بے کسی نے پھر سے پرانے دوستوں کی یاد دلا دی
تنہا ہو گیا اور قیس و کوہکن کا عہد یاد کیا
کاش اے ظالم میں تجھے دیر و حرم کی راہ سے نہیں لاتا
شیخ و برہمن کے حال پر (میں نے) بہت ظلم کیا
تیری غم افزا باتوں سے رنگِ بزم دگرگوں ہو گیا
غلط کیا کہ اے میرؔ تجھے (میں نے) دعوتِ سخن دی

۳۶۵

چاہا تھا کہ ابرِ تر بن جاؤں زار زار روؤں
دامن کو منھ پر تان لوں اور بہت روؤں
یارب میرے دلِ زار میں کس تمنّا کی پھانس ہے
جب بھی لبِ اظہار کھولتا ہوں، روتا ہوں
چاکِ جگر سے خندہ ایجاد کرتا ہوں کہ کب تک
اس گل کو دیکھے بغیر دیوار کے پیچھے روؤں
شرط ہے کہ اگر جذبِ محبت کام کرے
اس کو بغل میں سختی سے لپٹاؤں اور بہت روؤں
میرؔ (میرے) لب پر سو طرح کی گفتگو ہے، مگر مجبور (ہوں)
جس وقت باتوں سے مقصد حاصل ہو سکتا ہو، رو پڑتا ہوں

۳۶۶

(میں نے) اپنی جان کو اس کے فراق میں سو بلاؤں میں مبتلا کر دیا ہے
کس نے جدائی کا جادو کیا کہ میں جاناں سے جدا ہو گیا
چمن میں میرے آشیاں کا کوئی شناسا باقی نہیں رہا
کہ مدّت کے بعد صیادوں کی قید سے رہا ہوا ہوں

به اخلاصِ دل از من سر نه زد یک سجده هم گاہے
چه شد چوں مقریٔ تسبیح عمرے مقتدا گشتم
من از لطفِ بہار آگہہ نیَم کز بے دماغی ہا
نه با بلبل سخن کردم، نه در گلزار وا گشتم
کدامیں شیوہ اش باعث نه شد نومیدیِ دل را
نه دانم میرؔ با او بر چه امید آشنا گشتم

۳۶۷

کے خونِ دل به راہِ نگارے نه ریختم
یا از سرشک رنگِ بہارے نه ریختم
شاید که بلبلے تپد و جاں دہد ز رشک
از احتیاط گل به مزارے نه ریختم
داغ ام از ایں که عمر به مے خانه رفت و میرؔ
آبے به دستِ بادہ گسارے نه ریختم

۳۶۸

بحر خون است چشمِ پُرخونم
گِلِ بحری ست اشکِ گلگونم
داغِ جوشِ سرشکِ گلگونم
چوں شقائق تمام در خونم
خانۂ شوقِ دل خراب شود
دیدم آزارہا و ممنونم
فقرِ من نیست از جنوں خالی
تکیه دارِ مزارِ مجنونم

مجھ سے کبھی دل کے اخلاص کے ساتھ ایک سجدہ بھی ادا نہیں ہوا
کیا ہوا جو میں تسبیح کے مقری[1] کی طرح ایک عمر مقتدا[2] (بنا) رہا
میں لطف بہار سے آگاہ نہیں ہوں کہ بے دماغیوں (کی وجہ) سے
نہ بلبل سے گفتگو کی اور نہ گلزار میں کھل کر گشت کی
کب اس کا شیوہ دل کی مایوسی کا باعث نہیں بنا
نہیں جانتا میرؔ کہ میں اس سے کس امید پر آشنا ہوا

۳۶۷

کب میں نے معشوق کی راہ میں خوں نہیں بہایا
یا میں نے آنسوؤں سے رنگِ بہار نہیں بکھرائے
شاید کہ بلبل تڑپے اور رشک سے جان دے دے
(میں نے) احتیاط کی وجہ سے مزار پر پھول نہیں برسائے
اس بات کا رنج ہے کہ تمام عمر مے خانے میں گیا اور میرؔ
کسی بادہ گسار کی خدمت نہیں کی

۳۶۸

میری چشمِ پر خوں بحرِ خوں ہے
میرا سرخ آنسو گلِ بحری[3] ہے
میرے گلگوں اشک کے جوش کا داغ
لالہ کی طرح تمام میرے خون تر میں ہے
دل کا خانۂ شوق ویران ہو جائے
ہزاروں دکھ اٹھائے اور (پھر بھی) شکر گذار ہوں
میرا فقر جنوں سے خالی نہیں ہے
میں مجنوں کے مزار کا تکیہ دار ہوں

---

[1] تسبیح کا بڑا دانہ، امام تسبیح۔
[2] پیشوا۔
[3] ایک قسم کی سرخ مٹی۔

گرچہ سحر است حرفِ من لیکن
در تو کارے نہ کرد افسونم
مردم و دل ہماں تپش دارد
با قیامت بہ خاک مدفونم
کرد آخر مرا برابر خاک
پائمالِ خرامِ گردونم
بستہ ام لب بہ ایں زبان دراز
چہ بگویم کہ در غمت چونم
جوئے خوں شد رواں ز دیدۂ من
بگذر اے بےمروّت از خونم
ماتمِ قیس چند خواہم داشت
مدّتے شد کہ من بہ ہامونم
خندۂ زیرِ لب بہ رنگے کرد
کہ ستم شد بہ جانِ محزونم
حیف کیفیتم نہ شد ظاہر
کس نہ داند کہ من چہ معجونم

۳۶۹

می رسیم از شہرِ دل، سوداگریم
ہر کہ جنسِ درد دارد، می خریم
روز و شب خوں می خوریم از بہرِ دل
دشمنے را در بغل می پروریم
آتشے بودیم چندے پیش از ایں
ایں زماں خود تودۂ خاکستریم
شد حنائی پنجۂ مژگاں ز خوں
داغِ آتش دستیٔ چشمِ تریم

اگرچہ میری بات (میں) جادو ہے لیکن
تجھ پر میرے افسوں نے کام نہیں کیا
مرگیا اور دل میں وہی تپش ہے
خاک میں (ایک) قیامت کے ساتھ مدفون ہوں
آخر مجھے خاک کے برابر کردیا
گردوں کے خرام کا پائمال ہوں
اس دراز زبان کے باوجود ہونٹ سی لیے ہیں
کیا کہوں کہ تیرے غم سے کس حال میں ہوں
میری آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہوگئی
اے بے مروّت میرے خون سے درگزر کر
مجھے کچھ قیس کا ماتم کرنا چاہیے
مدّت ہوگئی مجھے بیاباں کی طرف گئے ہوئے
خندۂ زیرلب اس رنگ سے کیا
کہ میری جانِ محزوں پر ستم ہوگیا
حیف میری کیفیت ظاہر نہیں ہوئی
کسی نے نہ جانا کہ میری سرشت میں کیا ہے

۳۶۹

ہم شہر دل سے آئے ہیں، سوداگر ہیں
جس کے پاس بھی جنسِ درد ہے، (ہم) خریدتے ہیں
روز و شب دل کی خاطر خوں پیتے ہیں
دشمن کو بغل میں پال رہے ہیں
اب سے کچھ پہلے ہم آگ تھے
آج کل (ہم) راکھ کا ڈھیر ہیں
پنجۂ مژگاں خون سے حنائی ہوگیا
چشمِ تر کی آتش دستی[1] سے داغ ہیں

---

[1] مہارت، کاری گری۔

وقتِ آخر ہم بہ او گفتہ نہ شد
آں چہ در دل بود با خود می بریم
شوقِ آں گل باعثِ آوارگی ست
چوں نسیمِ صبح گہ بر ہر دریم
میرؔ با ما آشنائی مشکل است
در نزاکت چوں مزاجِ دلبریم

۳۷۰

سخن دیوانہ و عاشق کتابم
ادافہم تمام اجزا خطابم
شکستِ منظرِ دل دیدنی بود
نہ بردی رہ بہ احوالِ خرابم
خدا ناکردہ گر خیزم بہ دعوئ
چہ خواہی گفت در محشر جوابم
چناں گم گشتہ ام کز من اثر نیست
ہزار افسوس اگر او را نہ یابم
دلالت می کند چشمش بر آشوب
ز اندازِ نگہ در اضطرابم
تپاکِ او بہ دشمن جان و دل سوخت
من از گرمئ بےجایش کبابم
بہ حالم محتسب بگذار اکنوں
کہ بگرفتی بسا مستِ شرابم
چہ گویم آہ غفلت راہِ دل زد
جہانے بار بست و من بہ خوابم
دمِ آخر بسے پُرسیدم از میرؔ
نہ کرد اظہارِ عشقش از حجابم

وقتِ آخر بھی اس سے بیان نہیں کیا
جو کچھ دل میں تھا اپنے ساتھ لیے جاتے ہیں
اس گل کا شوق آوارگی کا باعث ہے
(ہم) نسیمِ صبح کی طرح صبح کو ہر در پر ہوتے ہیں
میرؔ ہم سے آشنائی مشکل ہے
ہم نزاکت میں دلبر کے مزاج کی طرح ہیں

۳۷۰

سخن کا دیوانہ اور کتاب کا عاشق ہوں
میں گفتگو کی تمام لطافت کو جاننے والا ہوں
دل کے ٹوٹنے کا منظر قابلِ دید تھا
(تو) میرے خراب حال (کو دیکھنے) کے لیے نہیں آیا
خدا نہ کرے اگر میں دعویٰ کے لیے کھڑا ہوا
محشر میں مجھے جواب میں کیا کہے گا
اس طرح گم ہوں کہ میرا نشان نہیں ہے
ہزار افسوس اگر (پھر بھی) اسے نہ پا سکوں
اس کی آنکھیں آشوب پر دلالت کرتی ہیں
اس کی نگاہ کے انداز سے اضطراب میں ہوں
دشمن سے اس کا تپاک جان اور دل کو جلا گیا
میں اس کے بے جا جوشِ محبت سے (جل کر) کباب ہوں
(مجھے) میرے حال پر (اے) محتسب اس وقت چھوڑ دے
کہ (تو) بہت بار مجھ مستِ شراب کو گرفتار کر چکا ہے
آہ کیا کہیں غفلت نے دل کو لوٹ لیا
دنیا نے اسباب باندھ لیا ہے اور میں نیند میں ہوں
دمِ آخر میرؔ سے (میں نے) بہت پوچھا
میری شرم سے اس کے عشق کا اظہار نہیں کیا

۳۷۱

مکن الفت کزایں آزار مردم
نہ دیدم چارہ اے ناچار مردم
سپاریدم بہ زیرِ خاک در راہ
کہ من از رفتنِ آں یار مُردم
تاسف ایں زماں بر نعش من چیست
ز عمرے بودہ ام بیمار مُردم
بہ زندانِ جہانِ پیچ در پیچ
بہ تنگ آمد دلم بسیار، مُردم
نہ دیدم آفتابِ روئے او را
ز غم در سایۂ دیوار مُردم
ز تن جاں رفت و می کردم تماشا
چو چشم بسملے بیدار مُردم
نہ دانم دل کدامیں آرزو داشت
کہ وقتِ جاں دہی دشوار مُردم
چہ گویم آہ از آں آئینہ رو میرؔ
عبث در حسرتِ دیدار مُردم

۳۷۲

دل ز جان بندۂ شاہےست کہ من می دانم
مائلِ طرفِ کلاہےست کہ من می دانم
ایں کہ در آتشِ غم دل ہمہ شب می سوزد
داغ از دوریٔ ماہےست کہ من می دانم
طورِ رندانۂ او را تو نمی دانی آہ
میرؔ آں خانہ سیاہےست کہ من می دانم

۳۷۱

الفت مت کر کہ اس آزار سے (میں) مر گیا
کوئی چارہ نہیں دیکھا ناچار مر گیا
مجھے شاہراہِ عام پر سپردِ خاک کیا گیا
کہ میں اس یار کی چال پر مرمٹا تھا
اس وقت میرے جنازے پر کیوں افسوس ہے
مدّت سے بیمار تھا، مر گیا
جہانِ پیچ در پیچ کے زنداں میں
میرا بہت دل تنگ آ گیا تھا، مر گیا
اس کے چہرے کے آفتاب کو نہیں دیکھا
غم سے سایۂ دیوار میں مر گیا
تن سے جان چلی گئی اور میں دیکھتا رہا
کسی بسمل کی طرح کھلی آنکھوں کے ساتھ مر گیا
نہیں جانتا کہ دل کیا آرزو رکھتا تھا
کہ (میں) جان دینے کے وقت دشواری سے مرا
میرؔ آہ اس آئینہ رو کی کیا کہوں
حسرتِ دیدار میں عبث مر گیا

۳۷۲

دل جان سے ایک شاہ کا بندہ ہے کہ میں جانتا ہوں
ایک طرفِ کلاہ کا مائل ہے کہ میں جانتا ہوں
یہ جو آتشِ غم سے دل تمام رات جلتا ہے
ایک ماہ سے دوری کا داغ ہے کہ میں جانتا ہوں
آہ تو اس کا رندانہ طور نہیں جانتا
میرؔ وہ بدبخت ہے کہ میں جانتا ہوں

۳۷۳

مہیّائے سفر ہم چوں غریباں در جہاں ماندم
در ایں محنت سرا یک چند من ہم میہماں ماندم
کسم فریادرس جز بےکسی نبود در ایں وادی
کہ چوں صوتِ جرس بسیار دور از کارواں ماندم
نمودم صرفِ ضعفِ دل دماغِ ہرزہ گردی را
بہ ہر جا پا نہادم، چوں غبارِ ناتواں ماندم
چو صیدے زخمِ کاری خوردہ رفتم از سرِ کویش
کہ بر ہر یک قدم از قطرۂ خونے نشاں ماندم
چناں بر شمعِ مجلس میرؔ زد پروانہ از جرأت
کہ من تا صبح دم حیرانِ آں آتش بہ جاں ماندم

۳۷۴

غم در دل، بر لب آہ دارم
من حالِ بسے تباہ دارم
گلزار نیم کہ در بیندم
دشت ام کہ ہزار راہ دارم
شد موے سفید و کار نکشود
چوں نافہ دلِ سیاہ دارم
بر خاکِ رہِ کسے ست رویم
یعنی من رو بہ راہ دارم
مقصودِ من آں قدِ بلند است
دیرے ست کہ حبِ جاہ دارم
یارب چہ کنم چگونہ دل را
زآں چشمِ سیہ نگاہ دارم

۳۷۳

میں دنیا میں مسافروں کی طرح چلنے کو تیار رہا
اس تکلیف کے گھر میں کچھ دن میں بھی مہماں رہا
بے کسی کے سوا اس وادی میں کوئی میری فریاد سننے والا نہیں ہے
کہ آوازِ جرس کی طرح کارواں سے بہت دور رہ گیا ہوں
(میں نے) دل کی رہی سہی توانائی آوارہ گردی کی فکر میں صرف کر دی
(سو) جہاں بھی پاؤں رکھا غبارِ ناتواں کی طرح رہ گیا
(میں) کاری زخم کھائے ہوئے شکار کی طرح اس کے کوچے سے گیا
کہ ہر ایک قدم پر خون کے قطرے سے نشان چھوڑتا گیا
پروانہ شمعِ مجلس پر جرأت سے اس طرح لپکا
کہ میں صبح تک (اس) آتش بہ جاں پر حیراں رہا

۳۷۴

دل میں غم، لب پر آہ رکھتا ہوں
میں بہت تباہ حال رکھتا ہوں
(میں) گلزار نہیں کہ دروازہ بند کر دوں
(میں تو) دشت ہوں کہ (میرے) ہزار راستے ہیں
بال سفید ہو گئے اور کام نہیں بنا
میرے پاس نافے کی طرح سیاہ دل ہے
میرا چہرہ کسی کی راہ کی خاک پر ہے
یعنی کہ میں رو بہ راہ ہوں
میرا مقصود وہ بلند قد ہے
مدت سے حبِ جاہ رکھتا ہوں
یارب کیا کروں، کس طرح دل کو
اُن سیاہ آنکھوں سے بچاؤں

نے معتقدِ فقیر گردم
کارے نہ بہ پادشاہ دارم[1]
ترکِ سرِ خویش می کنم میرؔ
من مژدۂ بارگاہ دارم

۳۷۵

خیالِ دیر و حرم را ز سر بہ در کردم
بہ سجدہ اے درِ مے خانہ سر بہ سر کردم
مرا ز دیر و حرم مطلبے نہ بود اے شوخ
ز فرطِ شوق تلاشِ تو در بہ در کردم
تمام عمر زدم سر بہ سنگ دور از تو
ببیں کہ عمرِ گرامی چساں بسر کردم
من از بہار چو آبِ رواں چہ می دانم
کہ سر فگندہ بہ زیر از چمن گذر کردم
رہِ وفا و محبت، رہےست دور و دراز
در ایں دو مرحلہ بسیار من سفر کردم
بجاے اشک ہمہ خوں گریستم یعنی
شبِ فراق بہ صد خونِ دل سحر کردم
چنارساں ہمہ در من فتاد و پاک بسوخت
ز دست سودنِ خود آتشے کہ بر کردم
ترا چہ جرم کہ ضبطِ خودم نہ شد مقدور
رسید نامِ تو در گوش و چشم تر کردم
ز طرزِ دیدنِ او میرؔ فتنہ می بارد
مباش ایں ہمہ غافل، منت خبر کردم

---

[1] اگلا شعر مخدوش ہے۔

نہ میں فقیر کا معتقد ہوا ہوں
نہ (مجھے) بادشاہ سے کوئی کام ہے
میرؔ میں اپنے سر کا ترک کرتا ہوں
(مجھے اُس) بارگاہ سے مژدہ آیا ہے

۳۷۵

(میں نے) دیر و حرم کے خیال کو سر سے نکال باہر کیا
میں نے سجدے سے درِ مے خانہ برابر کر دیا
مجھے اے شوخ دیر و حرم سے مطلب نہیں تھا
فرطِ شوق میں تجھے در بہ در تلاش کیا ہے
تجھ سے دور (رہ کر) تمام عمر سر کو پتھر پہ مارا
دیکھ کہ میں نے عمرِ عزیز کس طرح بسر کی
میں آبِ رواں کی طرح بہار کو کیا جانتا ہوں
کہ سر جھکا کر چمن کے نیچے سے گزرا ہوں
وفا اور محبت کی راہ، دور دراز کی راہ ہے
ان دو مرحلوں میں میں نے بہت سفر کیا ہے
اشک کے بجائے تمام خون رویا ہوں یعنی
شبِ فراق کو صد خونِ دل سے سحر کیا ہے
چنار کی چنگاریوں طرح ساری (کی ساری) مجھ پر پڑی اور بالکل جلا دیا
اپنے ہاتھ ملنے سے جو آگ میں نے جلائی تھی
تیرا کیا قصور کہ (میرے پاس) اپنے آپ پر قابو رکھنے کی طاقت نہیں تھی
تیرا نام کانوں میں پڑا اور (میں نے) چشم تر کر دی
اس کے دیکھنے کی طرز سے میرؔ فتنہ برستا ہے
اتنا غافل مت رہ، میں نے تجھے خبردار کر دیا

۳۷۶

زلف با دستار می پیچد، ادا را بندہ ام
شرم از آئینہ می دارد، حیا را بندہ ام
پیچشِ زلفش نہ امروزے ست با جانم ولے
ہر گہ و بےگاہ تحریکِ صبا را بندہ ام
زر خریدِ دلبرانِ بےمروّت نیستم
می کشم حکمِ دلِ خود، من وفا را بندہ ام
می کند احیا ز لطف و می کشد از ناز و خشم
کشتۂ آں التفات ام، ایں جفا را بندہ ام
گریہ ہا در گوشۂ محراب دارم روز و شب
با بتانم نیست روئے دل، خدا را بندہ ام
خرقۂ کوتاہ دامن کے بہ دل می چسپدم
من کہ چسپاں جامہ و چاکِ قبا را بندہ ام
در امیدِ یک نگاہے لطف جانِ میرؔ رفت
دلبراں پوشیدنِ چشمِ شما را بندہ ام

۳۷۷

بندۂ بو ترابؓ گردیدم
ذرّۂ آفتاب گردیدم
ایں چمن نیست جائے آسائش
ہر طرف ہم چو آب گردیدم
نسبتم شد بہ زلفِ او چو درست
جملہ تن پیچ و تاب گردیدم
او مئے ناب خوردہ با دشمن
من ز غیرت کباب گردیدم
عاقبت بر گناہِ پاسِ وفا
قابلِ صد عتاب گردیدم

۳۷۶

زلف کو دستار میں لپیٹتا ہے، (اس کی) ادا کا غلام ہوں
آئینے سے شرماتا ہے، (اس کی) حیا کا غلام ہوں
اس کی زلف کا پیچ وخم جان پر صرف آج ہی نہیں ہے، لیکن
ہرگاہ و بےگاہ صبا کا (اس کی زلفوں کو) چھیڑنے (کی حرکت) کا غلام ہوں
بے مروّت دلبروں کا زر خرید نہیں ہوں
اپنے دل کا حکم بجالاتا ہوں، وفا کا غلام ہوں
لطف سے زندہ کرتا ہے اور ناز و خشم سے ماردیتا ہے
اس التفات کا کشتہ ہوں، اس جفا کا غلام ہوں
گوشۂ محراب میں روز و شب روتا رہتا ہوں
میرا روئے دل بتوں کی طرف نہیں ہے، خدا کا بندہ ہوں
کوتاہ دامن خرقے کو کب دل سے لگاتا ہوں
میں (جو) کہ تنگ پوشاک اور چاکِ قبا کا غلام ہوں
ایک عنایت کی نگاہ کی امید میں میرؔ کی جان چلی گئی
دلبرو تمھاری بے اعتنائی کا غلام ہوں

۳۷۷

بندۂ بوترابؑ بن گیا
آفتاب کا ذرّہ بن گیا
یہ چمن راحت کی جگہ نہیں ہے
(میں نے) ہر طرف پانی کی طرح گشت کی
میرا تعلق اس کی زلف سے جب قائم ہو گیا
(میں) جملہ تن پیچ و تاب ہو گیا
اس نے مئے ناب دشمن کے ساتھ پی
میں غیرت سے (جل کر) کباب ہو گیا
آخر کار پاسِ وفا کے گناہ پر
صد عتاب کا مستحق ہو گیا

بزمِ امکاں نہ داشت کیفیّت
من چو جامِ شراب گردیدم
بودہ ام میرؔ شہرِ آبادے
رفتہ رفتہ خراب گردیدم

۳۷۸

غبار گشتم و سودائے جستجو دارم
بہ باد رفتم و در سر ہوائے او دارم
چہ دردِ دل کنم از من سخن نمی آید
زماں زماں ز غمش گریہ در گلو دارم
کنوں کہ وصل میسّر شدہ ست و می گریم
در ایں غم ام کہ نہ دانم چہ آرزو دارم
چو عکسِ شخصِ سخن گوئے روئے آئینہ
ز خویش رفتم و با خویش گفتگو دارم
چہ شد کہ مبتذل ام، اعتبارِ من باقی ست
مثالِ آئینہ در چشم ہر کہ رو دارم
بیا کہ شوق بہ دیوانگی کشید آخر
ز دیر بر سرِ کوئے تو ہائے و ہو دارم
بغیر حوصلہ یک جرعہ میرؔ نتواں خورد
از آں شرابِ محبت کہ در سبو دارم

۳۷۹

ز جوشِ شوق چو مستِ شراب می گردم
مریدِ احمدِ جام ام، خراب می گردم
چہ غم ز مردنِ خویشم کہ روزِ حشرے ہست
اگرچہ می روم امّا شتاب می گردم

بزمِ امکاں کیفیت نہیں رکھتی تھی
میں ایک جامِ شراب کی طرح بھرا
میرؔ میں ایک آباد شہر ہوا کرتا تھا
(مگر) رفتہ رفتہ اجڑ گیا

۳۷۸

غبار ہو گیا ہوں اور جستجو کا جنون رکھتا ہوں
ہوا میں بکھر گیا ہوں سر میں اس کا سودا رکھتا ہوں
کیا دردِ دل بیان کروں مجھ سے بات نہیں کی جاتی
کبھی کبھی اس کے غم میں خاموشی سے روتا ہوں
اب جب کہ وصل میسّر ہو گیا ہے اور (میں) روتا ہوں
اس غم میں ہوں کہ نہیں جانتا کہ کیا آرزو رکھتا ہوں
آئینے کے سامنے باتیں کرنے والے شخص کے عکس کی طرح
خود سے گزر گیا ہوں اور خود سے باتیں کرتا ہوں
کیا ہوا کہ میں مبتذل ہوں، میرا اعتبار باقی ہے
اس کی آنکھوں میں، آئینے کی طرح جس کے مقابل ہوتا ہوں
آ کہ شوق آخر دیوانگی تک کھنچ گیا ہے
دیر سے تیرے کوچے میں ہاؤ و ہو کر رہا ہوں
حوصلے کے بغیر میرؔ ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے
اس شرابِ محبّت کا، جو (میرے) سبو میں ہے

۳۷۹

شوق کے جوش سے مستِ شراب کی طرح ہو رہا ہوں
احمدِ جام[1] کا مرید ہوں، خراب ہو رہا ہوں
اپنے مرنے کا کیا غم کہ روزِ حشر (سلامت) ہے
اگرچہ (میں) جا رہا ہوں لیکن جلد لوٹ آؤں گا

---

[1] ایک صوفی بزرگ۔

بہ سیرِ باغ ام و وارفتۂ فنائے خود ام
سپے ز خویش گذشتن چو آب می گردم
نہ بہرِ خاطرِ غیر ایں خطاب امروزے ست
ہمیشہ موردِ خشم و عتاب می گردم
ز ضعف ہر نفسم چشم بستہ می گردد
ترا خیال کہ مائل بہ خواب می گردم
گہے بر آتشِ دل گریہ ام نہ زد آبے
مدام داغ ام و ہر دم کباب می گردم
تنک شراب چناں ام کہ شرح نتواں دار
بہ یک پیالۂ مے بےحجاب می گردم
گریز نیست مرا از تلاشِ او ہرگز
چو سایہ در پۓ آں آفتاب می گردم
ثباتِ من نہ بود یک نفس فزوں تر میرؔ
در ایں محیط چہ شد، چوں حباب می گردم

۳۸۰

مرو ز دیدہ کہ من خاطرِ غمیں دارم
نگاہِ حسرت ام و گریہ در کمیں دارم
بیا کہ سوزِ دروں آتشے بہ دل زدہ است
بہ رنگِ شمعِ سحر جاں در آستیں دارم
ادائے کینۂ او را چو من کہ می فہمد
کہ زخم می خورم و بر لب آفریں دارم
امید ہست کہ ایں ناتواں قبول افتد
کہ من فقیر تنک مایہ ام، ہمیں دارم
بہ ایں امید کہ یک صبح رو بہ من آری
سرِ نیاز بہ ہر شام بر زمیں دارم

باغ کی سیر کر رہا ہوں اور اپنی فنا پر فدا ہوں
اپنے آپ سے گزر جانے کے لیے پانی کی طرح پھر رہا ہوں
یہ خطاب آج غیر کی طرف داری میں نہیں
(میں تو) ہمیشہ خشم و عتاب کا مورد ٹھہرتا ہوں
ضعف سے ہر دم میری آنکھ بند ہوئی جاتی ہے
(اور) تجھے خیال ہے کہ میں مائل بہ خواب ہو رہا ہوں
کبھی دل کی آگ پر میرے آنسوؤں نے پانی نہیں چھڑکا
ہمیشہ داغ (رہا) ہوں اور ہر دم (جل کر) کباب ہوتا ہوں
جیسا میں تنک شراب[1] ہوں اس کی شرح نہیں کر سکتے
ایک پیالے سے بے تکلف ہو جاتا ہوں
مجھے اس کی تلاش سے ہرگز گریز نہیں ہے
سائے کی طرح اس آفتاب کے لیے گردش کرتا ہوں
میرا ثبات ایک نفس بھی زیادہ نہیں ہو سکتا میرؔ
اس بحر میں کیا ہوا جو حباب کی طرح پھرتا ہوں

۳۸۰

آنکھوں سے نہ جاؤ کہ میں خاطرِ غمیں رکھتا ہوں
(میں) نگاہِ حسرت ہوں اور گریہ کمیں میں رکھتا ہوں
آ کہ سوزِ دروں نے دل کو آگ لگا دی ہے
شمعِ سحر کی طرح جان آستین میں رکھتا ہوں
اس کے کینے کی ادا میری طرح کون سمجھ سکتا ہے
کہ زخم کھاتا ہوں اور لب پر آفریں رکھتا ہوں
امید ہے کہ یہ ناتواں قبول ہوگا
کہ میں تنک مایہ فقیر ہوں، یہی رکھتا ہوں
اس امید پر کہ ایک صبح (تُو) میری جانب رخ کرے
سرِ نیاز ہر شام زمین پر رکھتا ہوں

---

[1] تنک شراب۔ تھوڑی سی شراب پی کر نشے میں آجانے والا۔

شوم غبار کہ تقریب نیست بہتر از ایں
کہ قصدِ کوئے تو از دیر دل نشیں دارم
ز رنگِ شمعِ او میرؔ داغ شد دلِ من
دلیلِ روشنِ ایں آہِ آتشیں دارم

۳۸۱

چشم از گریہ برنمے دارم
کہ ہمیں من دیدۂ نمے دارم
تو بسر بر بہ خاطرِ شادے
من دلے دارم و غمے دارم
می روم چشم گرم ناکردہ
چوں شرر فرصتِ کمے دارم
گر چہ باتست عالمے بے من
بے تو من نیز عالمے دارم
چوں ہُمیم خستۂ دلِ زارے
می کشم نالہ تا دمے دارم
سادگی ہاے من ببیں کہ ہنوز
چشمِ لطفے از او ہمے دارم
دل بہ آں زلف میرؔ خواہم بست
چہ کنم حالِ درہمے دارم

۳۸۲

بزمِ برہم زدۂ عالمِ امکاں دیدم
تا چہ گویم کہ عجب خوابِ پریشاں دیدم
غالب است ایں کہ ز طوفانِ قیامت نہ شود
آں چہ بے روئے تو از دیدۂ گریاں دیدم
یادگارے ز اسیرانِ چمن آخرِ کار
مشتِ پر در پسِ دیوارِ گلستاں دیدم

غبار ہو جاؤں کہ اس سے بہتر صورت نہیں ہے
کہ دیر سے تیرے کوچے کا قصد دل میں رکھتا ہوں
اس کے شمعی رنگ سے میرؔ میرا دل داغ ہو گیا
اس (بات) کی روشن دلیل (کے لیے) آہِ آتشیں رکھتا ہوں

۳۸۱

آنکھوں کو میں رونے سے روک نہیں پاتا
کہ میرے پاس یہی نم آنکھیں ہیں
تو خاطرِ شاد کے ساتھ زندگی کر
میں دل رکھتا ہوں اور غم رکھتا ہوں
کسی (نظارے) کو رغبت سے دیکھے بغیر جا رہا ہوں
شرر کی طرح فرصت کم رکھتا ہوں
گرچہ تیرے ساتھ میرے بغیر ایک عالم ہے
تیرے بغیر میں بھی ایک عالم رکھتا ہوں
مجھ سا کوئی دلِ زار کا ستایا ہوا نہیں
نالہ کھینچتا رہوں گا جب تک سانس ہے
میری سادگی دیکھ کہ ابھی تک
اس سے مہربانی کی ساری امیدیں رکھتا ہوں
دل کو میرؔ اُس زلف سے باندھوں گا
کیا کروں حال میرا پریشان ہے

۳۸۲

میں نے عالمِ امکاں کی برہم ہوئی بزم کو دیکھا
کہاں تک کہوں کہ عجب خوابِ پریشاں دیکھا
یہ یقین ہے کہ طوفانِ قیامت سے (بھی وہ) نہیں ہو گا
جو کہ تیرے ہجر میں دیدۂ گریاں سے دیکھا
چمن کے اسیروں سے یادگار، آخر کار
میں نے مشتِ پر دیوارِ گلستاں کے پیچھے دیکھے

دل کہ در سینۂ من قطرۂ خونے بودہ ست
چوں بہ چشم آمد از او شیوۂ طوفاں دیدم
در گلستانِ جہاں رنگ نہ دارم کہ چو گل
من ہمیں زخمِ دل و چاکِ گریباں دیدم
چوں تسلّی شوم از دلدہیِ غم خواراں
من کہ شب لختِ جگر بر سرِ مژگاں دیدم
ہر کسے گل بہ گریباں ز گلستانِ تو رفت
میرؔ را لختِ دلِ خویش بہ داماں دیدم

۳۸۳

از عدم حیرانِ کارِ دل بہ دنیا آمدیم
شکلِ تصویر ایم از خودرفتہ پیدا آمدیم
جملہ تن مصروفِ دل جوئی چو تارِ سبحہ شد
ما بہ چشمِ مردماں از راہِ دل ہا آمدیم
رفتۂ خویش ایم ورنہ منزلِ ما دور بود
شوقِ ما دامن کشِ ما شد کہ ایں جا آمدیم
عالمے لبریزِ ما و چشمِ ما بر راہِ ماست
انتظارے می کشیم از خویش و ہر جا آمدیم
غرقۂ وہم ایم دریا خویش را فہمیدہ ایم
ورنہ چوں موج از پئے رفتن مہیّا آمدیم
جلوہ ہا داریم و از ہر جلوہ بےخود گشتہ ایم
خود تماشا ایم و خود بہرِ تماشا آمدیم
ہر نفس گم گشتۂ ما را چہ می پرسی کہ میرؔ
جستجوئے خویش می داریم ما تا آمدیم

۳۸۴

بہ روئے تو پنہاں نظر داشتم
بلائے عجب زیرِ سر داشتم

دل کہ میرے سینے میں ایک قطرۂ خوں تھا
جب آنکھ تک آیا اس میں طوفاں کا انداز پایا
(میں) دنیا کے گلستان سے بہرہ ور نہ ہوا کہ گل کی طرح
میں نے یہی زخمِ دل اور چاکِ گریباں دیکھا
غم خواروں کی دلدہی سے کس طرح تسلّی پاؤں
کہ میں نے رات کو لختِ جگر کو مژگاں کے اوپر دیکھا ہے
تیرے گلستان سے ہر ایک گریباں میں پھول لے کر گیا
میرؔ کو اپنے دل کے ٹکڑے دامن میں (لیے جاتے) دیکھا

۳۸۳

ہم کارِ دل سے حیران عدم سے دنیا میں آئے
شکلِ تصویر ہیں، از خود رفتہ ظاہر ہوئے ہیں
سارا بدن دل جوئی میں تسبیح کے دھاگے کی طرح صرف ہو گیا
ہم لوگوں کی آنکھ میں دلوں کی راہ سے آئے
خود سے گزر گئے ہیں ورنہ ہماری منزل دور تھی
ہمارے شوق نے ہمارا دامن کھینچا جو (ہم) یہاں آئے
عالم ہم سے لبریز (ہے) اور ہماری آنکھ ہمارے راستے پر لگی ہے
ہم اپنا (ہی) انتظار کھینچتے ہیں اور ہر جگہ پہنچے ہوئے ہیں
(ہم) وہم میں غرق ہیں، خود کو سمندر سمجھا ہے
ورنہ موج کی طرح جانے کے لیے تیار آئے تھے
ہم بہت سے جلوے رکھتے ہیں اور ہر جلوے سے بے خود ہو گئے ہیں
خود تماشا ہیں اور خود بہرِ تماشا آئے تھے
ہمارے ہر گم گشتہ نفس کو کیا پوچھتے ہو کہ میرؔ
ہم اپنی جستجو رکھتے ہیں اس لیے آئے تھے

۳۸۴

(میں) تیرے چہرے پر چھپ کر نظر کرتا تھا
عجب بلا (میں) سر میں رکھتا تھا

تو با کامِ دل زندگانی بکن
من از جانِ خود دست برداشتم
سرشکے بہ صد درد و غم می چکد
نماند آں کہ من ہم جگر داشتم
نہ بود ایں چنیں بےخودی پیش از ایں
ز احوالِ خود ہم خبر داشتم
خراشندۂ جبہ چوں من نہ بود
در ایں کار دستِ دگر داشتم
نہ گردش بہ دل ہیچ تاثیر آہ
نگاہے بہ آہِ سحر داشتم
بہ ہر شاخِ گل کردہ ام نالہ اے
گہے میرؔ من بال و پر داشتم

۳۸۵

چہ شد گر فقروار و خاکِ راہم
شکستے ہست در طرفِ کلاہم
بہائے خونِ من یک دیدنِ اوست
تمنا کشتۂ ذوقِ نگاہم
من و ابرے کہ بر می خیزد از دشت
دو ہم درد ایم، می گریم باہم
نمی دانم کہ اے دل بر چہ امید
برابر کردہ ای با خاکِ راہم
ہمیں بر جرم دیدن کشتہ گشتم
دگر ثابت نمی گردد گناہم
ستم آخر بہ ہر کس می نمائی
سنانے، خنجرے، تیغے، بہ ما ہم

تو دل کی مراد کے ساتھ زندگانی کر

میں اپنی جان سے دست بردار ہو چکا ہوں

سیکڑوں درد و غم کے ساتھ آنسو ٹپک رہے ہیں

(وہ وقت) نہیں رہا کہ جب مجھے بھی (برداشت کرنے کا) مقدور تھا

اس سے پہلے (کبھی) اس طرح بے خودی نہیں تھی

(میں) اپنے حال کی بھی خبر رکھتا تھا

پیشانی کو نوچنے والا کوئی مجھ سا نہیں تھا

اس کام میں انتہائی مہارت رکھتا تھا

آہ (اِس نے) اس کے دل پر کوئی اثر نہیں کیا

(میں) آہِ سحر سے اُمید رکھتا تھا

ہر شاخِ گل پر سے نالہ کر چکا ہوں

کبھی میرؔ میں (بھی) بال و پر رکھتا تھا

۳۸۵

کیا ہوا اگر فقر وار اور خاکِ راہ ہوں

میری کلاہ کا گوشہ مڑا ہوا ہے

میرا خوں بہا اس کا ایک (نظر) دیکھنا ہے

ذوقِ نگاہ کی تمنّا کا مارا ہوا ہوں

میں اور (وہ) ابر کہ دشت سے اٹھتا ہے

ہم دو ہمدرد ہیں، ایک ساتھ (مل کر) روتے ہیں

نہیں جانتا کہ اے دل کس امید پر

(تو نے) مجھے خاکِ راہ کے برابر کر دیا

(بس) اسی دیکھنے کے جرم پر قتل ہو گیا ہوں

میرا اور (کوئی) گناہ ثابت نہیں ہو سکا

(تو) آخر ہر ایک پر ستم کرتا ہے

(کوئی) سناں، خنجر، تیغ ہم پر بھی

بہ یک سنبل سرے دارم در ایں باغ
کہ من زنجیریِ زلفِ سیاہم
بہ درد آمد دل آخر ہمدماں را
ز آوازِ حزینِ آہ آہم
اگر ایں بار مانم زندہ اے میرؔ
کسے را بعد از ایں ہرگز نہ خواہم

۳۸۶

چند آرزوئے وصلِ تو در سینہ خوں کنم
تا کے معاش بے تو بہ حالِ زبوں کنم
در خاک دانِ دہر نہ شد کس انیسِ من
تا یک نفس غبار ز خاطر بروں کنم
گل می زند مرا ز تہِ برگ چشمکے
یعنی ز جائے خیزم و فکرِ جنوں کنم
یارب چہ روز خواہدم آمد بہ پیش آہ
فریاد ہر شب از شبِ دیگر فزوں کنم
دارم بہ خود قرار کہ ہر صبح گاہ میرؔ
از خونِ دیدہ چہرۂ خود لالہ گوں کنم

۳۸۷

دارد اگر چہ طورِ زمانہ مشوّشم
ہر صورتے کہ روے دہد، راضی ام، خوشم
آیم چرا ز نغمہ نہ در وجد کز ازل
از خاک برگرفتۂ آوازِ دل کشم
من تشنہ کامِ وادیِ شوق ام عجب مدار
سیلاب اگر نہ کرد کفایت بہ لب چشم

اس باغ میں ایک سنبل سے تعلق رکھتا ہوں
کہ میں زلفِ سیاہ کا زنجیری ہوں
ہمدموں کا دل آخر پریشان ہو گیا
میری آہ آہ کی غم زدہ آواز سے
اگر اس بار زندہ رہ گیا اے میرؔ
کسی کو اس کے بعد ہرگز نہیں چاہوں گا

۳۸۶

کب تک تیرے وصل کی آرزو کو سینے میں خوں کروں
کب تک تیرے بغیر تباہ حال میں زندہ رہوں
دنیا کے خاکداں میں کوئی میرا دوست نہیں تھا
کہ ایک نفس دل کا غبار نکال سکوں
گل پتوں کی آڑ سے مجھے آنکھ سے اشارہ کر رہا ہے
یعنی کہ یہاں سے اٹھوں اور جنوں کی فکر کروں
یارب آہ میرے سامنے کیا دن آئے گا
(میں) ہر رات پچھلی رات سے زیادہ فریاد کرتا ہوں
خود سے وعدہ کیا ہے کہ ہر صبح کے وقت میرؔ
آنکھوں کے خون سے اپنا چہرہ لالہ گوں کروں گا

۳۸۷

اگرچہ زمانے کا انداز مجھے پریشان رکھتا ہے
جو صورت بھی پیش آئے، راضی ہوں، خوش ہوں
(میں) نغمے سے وجد میں کیوں نہ آؤں کہ ازل سے
دل کش آواز نے خاک سے مجھے پروان چڑھایا ہے
میں وادیٔ شوق کا تشنہ کام ہوں عجب مت سمجھ
سیلاب اگر میری لب چش[1] کے لیے کافی نہیں ہوا

---

[1] مزہ معلوم کرنے کے لیے چکھنا۔

یک لحظه بر مرادِ خودم زیستن نہ شد
بارےست زندگی کہ بہ ناچار می کشم
از گریہ میرؔ سوزِ دروں کم نمی شود
دریا ز دیدہ می رود و من در آتشم

۳۸۸

چمن پروردہ طیرام لیک رو سوئے قفس دارم
بہ زاری می کنم عادت، گرفتاری ہوس دارم
نہ دانم منزلِ مقصودِ من یارب کجا باشد
پئے ایں کارواں ہر گام شورِ چوں جرس دارم
بسے بگذشت و برنگرفتہ کس از خاکِ صحرایم
چو نقشِ پاے چشمِ لطف از بسیار کس دارم
تو دشمن گل بہ دامن داری و من بر سرِ کویش
پئے آتش فروزی چوں فقیراں خار و خس دارم
بہ کاہش پیکرِ زردم تمامی رفت و نالاں ام
چو نے از من نمی آید خموشی تا نفس دارم
نہ دارم ہیچ باک از مستیِ بازار و برزن ہا
کہ مربوط ام بہ شیخِ شہر و یاری با عسس دارم
مپرس اے میرؔ از اندازِ چشمِ نیم باز او
قیامت نشہ زاں جامِ شرابِ نیم رس دارم

۳۸۹

سخت در کارِ خویش حیرانم
چہ بہ دل خورد من نمی دانم

ایک لحظہ (بھی) اپنی مراد پر زندہ رہنا (میسّر) نہیں ہے
زندگی ایک بار ہے کہ مجبوراً کھینچ رہا ہوں
میرؔ رونے سے سوزِ دروں کم نہیں ہوتا
آنکھوں سے دریا بہہ رہا ہے اور میں آگ میں (جل رہا) ہوں

۳۸۸

چمن میں پلا ہوا پرندہ ہوں لیکن رخ قفس کی طرف ہے
نالے کی خو ڈالتا ہوں گرفتاری کی ہوس رکھتا ہوں
(میں) نہیں جانتا یارب میری منزلِ مقصود کہاں ہوگی
اس کارواں کے لیے ہر گام پر (میں) جرس کی طرح شور کرتا ہوں
بہت سے (لوگ) گزر گئے اور کسی نے مجھے صحرا کی خاک سے نہیں اٹھایا
(میں) نقشِ پا کی طرح ہر ایک سے مہربانی کی امید رکھتا ہوں
(اے) دشمن تیرے دامن میں پھول ہیں اور اس کے کوچے میں
میرے پاس آگ جلانے کے لیے فقیروں کی طرح خار و خس ہیں
گھل کر میرا پیلا جسم تمام ختم ہو گیا ہے اور (میں) فریاد کرتا ہوں
جب تک سانس ہے بانسری کی طرح مجھ سے خاموش نہیں ہوا جاتا
بازار و برزن [1] میں مستی سے کوئی خوف نہیں کھاتا
کہ شیخِ شہر سے مربوط ہوں اور عسس [2] سے دوستی رکھتا ہوں
میرؔ اس کی چشمِ نیم باز کے انداز کا مت پوچھ
اس نیم رس [3] جامِ شراب سے قیامت نشہ رکھتا ہوں

۳۸۹

اپنے معاملے میں سخت حیراں ہوں
دل پر کیا (زخم) کھایا ہے نہیں جانتا ہوں

---

۱ گلی کوچے۔
۲ کوتوال، شہر کا محافظ۔
۳ ادھ پکی۔

من که گلچینِ ایں گلستانم
پُر ز لختِ دل است دامانم
بہ سرِ زلف می زند حرفے
او چہ داند کہ من پریشانم
من ز پہلوئے او چہ ہا دیدم
دل مگر بود دشمنِ جانم
ہر زماں بے تو آفتِ تازہ
سر بروں آرد از گریبانم
ترکِ ساغر گرفتم و بے مے
در بہاراں بسے پشیمانم
رسم دینِ کہن چہ می پرسی
من چہ دانم کہ نومسلمانم
شوقِ فہمیدنِ دل است مرا
غیرِ ایں نسخہ من نمی خوانم
غالباً میرؔ شب بہ خاک افتاد
جگر از راہِ چشمِ گریانم

۳۹۰

من کہ از خود خبرے یافتہ ام
از فقیراں نظرے یافتہ ام
گر ہمہ درد شوی، دریابی
آں چہ از چشمِ ترے یافتہ ام
با کس الفت نہ کنی کز بلبل
در چمن مشتِ پرے یافتہ ام
دل چساں زآں گلِ تر بردارم
کش بہ خونِ جگرے یافتہ ام

میں کہ اس گلستان کا گلچین ہوں
میرا دامن دل کے ٹکڑوں سے بھرا ہے
اشاروں کنایوں میں باتیں کر رہا ہے
وہ کیا جانے کہ میں پریشان ہوں
میں نے اس اس کی طرف سے کیا کیا دیکھا
دل مگر جان کا دشمن تھا
تیرے بغیر ہر وقت تازہ آفت
میرے گریبان سے سر نکالتی ہے
میں نے ساغر کو ترک کیا (ہے) اور شراب کے بغیر
بہار میں بہت پشیمان ہوں
دینِ کہن کی رسم کیا پوچھتے ہو
میں کیا جانوں کہ نومسلم ہوں
مجھے دل کو سمجھنے کا شوق ہے
اس کتاب کے سوا میں کچھ نہیں پڑھتا
غالباً میرؔ رات کو خاک پر گر گیا
جگر میری گریاں چشم کی راہ سے

۳۹۰

میں جس نے اپنی خبر پائی ہے
(میں نے) فقیروں سے نظر پائی ہے
اگر تمام درد ہو جائے، (تو) پا جائے گا
جو کہ میں نے چشم تر سے پایا ہے
کسی سے الفت مت کر کہ بلبل کی نشانی
چمن میں (میں نے) مشتِ پر پائے ہیں
دل کس طرح اس گلِ تر سے اٹھا لوں
کہ اسے خونِ جگر کے عوض پایا ہے

خاطرم میرؔ ز مردن جمع است
چوں غمش چارہ گرے یافتہ ام

۳۹۱

ز شستِ صافت اے ابروکماں از بس خطر دارم
تو می بینی بہ سوئے تیر و من فکرِ جگر دارم
سراسر گردِ ایں صحرا دلِ وحشت اثر دارم
بسانِ چشمہ در ہر گوشۂ او چشمِ تر دارم
نہ دانم راحتِ دل چیست، خوابِ خوش چہ می باشد
کہ من از عشقِ خوش چشماں بلائے زیرِ سر دارم
دمے اے جامہ زیباں گرمی اے بامن تواں کردن
کہ جاں در آستیں از شوق چوں شمعِ سحر دارم
نہ پنداری جہانِ رفتنی منزل گہِ من شد
پس از آسائشِ یک چند قصدِ پیش تر دارم
شنیدم ہر کرا ذی ہوش، دیدم سخت بےہوشش
ز حالِ مردمِ آگاہِ عہدِ خود خبر دارم
بیا انصاف اگر داری بہ دستم بوسہ دہ دشمن
کہ من در فنِ شعر و شاعری دستِ دگر دارم
نہ دانم با غمم اے میرؔ گردوں خوش چرا دارد
نہ دارم غیر از ایں عیبے کہ من اندک ہنر دارم

۳۹۲

با دلبرانِ ہندی تا میرؔ کار دارم
دل چاک چاک در بر ہم چوں انار دارم
یک رہ مگر از آں سو گردے کند غبارے
چوں نقشِ پائے چشمے بر رہ گذار دارم
افراطِ اشتیاقم در وصل ہم ہماں است
او در برِ من است و من انتظار دارم

میرؔ میری خاطر مرنے سے جمع ہے
(میں نے) غم جیسا چارہ گر پایا ہے

۳۹۱

اے ابرو کماں تیرے صحیح نشانے سے بہت زیادہ خطرے میں ہوں
تو تیر کی طرف دیکھتا ہے اور میں جگر کی فکر کرتا ہوں
سراسر اس صحرا کے گرد دلِ وحشت اثر رکھتا ہوں
چشمے کی طرح اس کے ہر گوشے میں چشم تر رکھتا ہوں
نہیں جانتا دل کی راحت کیا ہے، میٹھی نیند کیا ہوتی ہے
کہ میں اچھی آنکھوں والوں سے عشق کر کے سر میں ایک بلا رکھتا ہوں
تھوڑی دیر اے جامہ زیب مجھ سے جوشِ محبت کا اظہار کر سکتے ہو
کہ شوق سے شمعِ سحر کی طرح جان آستین میں رکھتا ہوں
یہ نہ گمان کر کہ (یہ) عارضی دنیا میری منزل ہوگئی ہے
تھوڑے آرام کے بعد کچھ اور آگے کا قصد رکھتا ہوں
جس کو سنا کہ ذی ہوش (ہے) اسے سخت بے ہوش دیکھا
اپنے زمانے کے آگاہ لوگوں کے حال کی خبر رکھتا ہوں
آ گر انصاف رکھتا ہے میرے ہاتھ پر (اے) دشمن بوسہ دے
کہ میں شعر و شاعری کے فن میں نہایت مہارت رکھتا ہوں
نہیں جانتا کہ میرے غم پر اے میرؔ آسماں کیوں خوش ہوتا ہے
مجھ میں اس کے علاوہ کوئی عیب نہیں کہ میں کچھ ہنر رکھتا ہوں

۳۹۲

جب تک میرؔ ہندوستان کے دلبروں سے معاملہ رہے گا
پہلو میں انار کی طرح چاک چاک دل رکھتا رہوں گا
ایک بار مگر اس طرف سے غبار بلند ہو
نقشِ قدم کی طرح رہگزار پر آنکھیں (بچھائے) رکھتا ہوں
میرے شوق کی فراوانی وصل میں بھی وہی ہے
وہ میرے پہلو میں ہے اور میں انتظار کر رہا ہوں

در عشق طرفہ صحبت افتاد اتفاقم
نے یار رحم دارد، نے من قرار دارم
دل بر سفر نہادم زآں کو جبیں خراشاں
پائے بہ راہ دارم، دستے بہ کار دارم
از نشۂ جوانی دردِ سر است با من
زآں مے کہ مست بودم، اکنوں خمار دارم

۳۹۳

دعویٰ شدہ ست قطع بہ سوئے تو آمدیم
راضی بہ مرگ بودہ بہ روئے تو آمدیم
ما را دماغِ دیدن گل ہا نہ بودہ است
در گلشنِ زمانہ ز بوئے تو آمدیم
تسکیں نہ یافتیم پس از مرگ زیرِ خاک
آخر غبارگشتہ بہ کوئے تو آمدیم

۳۹۴

چند روزے شد کہ ایں جا باش و بودے می کنم
در حقیقت نیستم اما نمودے می کنم
بندگی کیشم نیَم زنہار در بندِ جہت
رو بہ ہر جانب کہ می آرم، سجودے می کنم

۳۹۵

عہد کردم کہ اگر جاں رود آہے نہ کنم
بعد از ایں خواہشِ ہر چشم سیاہے نہ کنم
می دہد یاد ز تابندہ رخِ او ہر شب
من ہماں بہ کہ سوئے ماہ نگاہے نہ کنم

۳۹۶

چناں صبح دادِ فغاں می دہم
کہ مرغ چمن را زباں می دہم

اتفاق سے عشق میں طرفہ صحبت میں گھر گیا ہوں
نہ یار رحم کھاتا ہے اور نہ مجھے قرار آتا ہے
(میں نے) پیشانی نوچتے ہوئے دل کو اس کوچے سے سفر پر آمادہ کیا ہے
(میرا) پیر راستے میں ہے، ہاتھ کام میں (مصروف) ہے
جوانی کے نشے سے میرے سر میں درد ہے
وہ شراب جس سے (کہ) مست تھا، اب (اس کا) خمیازہ کھینچ رہا ہوں

۳۹۳

جھگڑا ختم ہو گیا تیری طرف آ گئے
اپنی موت پر راضی ہو کر تیرے سامنے آ گئے
ہمیں گلوں کو دیکھنے کا دماغ نہیں رہ گیا ہے
زمانے کے گلشن میں تیری خوشبو کے لیے آئے تھے
ہم نے مرنے کے بعد زیرِ خاک تسکین نہیں پائی
آخر غبار ہو کر تیرے کوچے میں آ گئے

۳۹۴

کچھ دن ہوئے ہیں کہ اس جگہ بود و باش کر رہا ہوں
حقیقت میں نہیں ہوں لیکن ظاہر میں نظر آ رہا ہوں
میں بندگی کی خو رکھنے والا ہوں کبھی بھی سمت کی پابندی میں نہیں ہوں
جس طرف بھی چہرہ لے آتا ہوں، سجدہ کرتا ہوں

۳۹۵

میں نے عہد کیا کہ اگر جان (بھی) چلی جائے آہ نہیں کروں گا
اس کے بعد ہر چشمِ سیاہ کی خواہش نہیں کروں گا
ہر شب (وہ) اس کے تابندہ چہرے کی یاد دلا دیتا ہے
میرے لیے یہی بہتر ہے چاند کی طرف نگاہ نہ کروں

۳۹۶

صبح کو اس طرح دادِ فغاں دیتا ہوں
کہ مرغِ چمن کو (نالہ) سکھاتا ہوں

چنانم ز جا رفتۂ او کہ میرؔ
بہ ہر جائے آں شوخ جاں می دہم

۳۹۷

صبر بر صدگونہ جورِ آں جفاجو می کنم
نیم جانے دارم، اکنوں ظلم بر او می کنم
بر امیدِ آں کہ شاید آید آں پیماں گسل
خانہ را از اشک و مژگاں آب و جارو می کنم

۳۹۸

یادِ آں عہدے کہ من ہم مہربانے داشتم
کینہ ورزے، خشمگینے، بدزبانے داشتم
ہم نشیں از حالِ میرؔ من چہ پرسی ہر نفس
دردمندے، بے کسے، بے خانمانے داشتم

۳۹۹

برائے گریۂ خونیں جگر تراشیدم
چو زخمِ تازہ یکے چشمِ تر تراشیدم
ز تازہ کاریِ من در خزاں عجب مکنید
ز چوبِ خشک گلِ تر اگر تراشیدم

۴۰۰

لکد بہ ابر زن از جامِ صبح گاہِ خودام
دماغِ من چو شود تخت، بادشاہِ خودام

۴۰۱

از دلِ داغ گشتہ بے مزہ ام
زیں کبابِ گذشتہ بے مزہ ام

۴۰۲

تا کے ز درت بادلِ صد چاک درآئیم
مپسند کہ آزردہ از ایں شہر برآئیم

میں میرؔ اس کا یوں ایسا ہوش سے گزرا ہوا عاشق ہوں
کہ اس شوخ کے ہر عضو پر جان دیتا ہوں

۳۹۷

اس جفا جو کے سو گنا ظلم پر صبر کرتا ہوں
نیم جان رکھتا ہوں، اب اس پر ظلم کرتا ہوں
اس امید پر کہ شاید وہ پیمان توڑنے والا آئے
گھر کی آنسو اور پلکوں سے جھاڑ پونچھ کر رہا ہوں

۳۹۸

اس وقت کی یاد کہ میرا بھی ایک مہربان (دوست) تھا
ایک کینہ ور، غصہ ور بدزبان (دوست) تھا
ہم نشیں ہر وقت میرے میرؔ کا حال کیا پوچھتے ہو
(وہ) ایک دردمند، بے کس، بے خانماں (دوست) تھا

۳۹۹

(میں نے) گریۂ خونیں کے لیے جگر تراشا ہے
تازہ زخم کی طرح ایک نم آلود آنکھ تراشی ہے
خزاں میں میرے نئے ہنر پر تعجب نہ کریں
اگر (میں نے) چوبِ خشک سے گلِ تر تراشا ہے

۴۰۰

میں اپنا صبح کے وقت کا جام چڑھا کر ابر کو لات مارتا ہوں
جب میں نشے میں مست ہوتا ہوں، خود آپ بادشاہ ہوتا ہوں

۴۰۱

داغ ہوئے دل سے بے مزہ ہوں
اس جلے ہوئے کباب سے بے مزہ ہوں

۴۰۲

کب تک تیرے دروازے سے دلِ صد چاک لیے آؤں
یہ مت چاہ کہ (میں) اس شہر سے رنجیدہ چلا جاؤں

۴۰۳

من آں بوریاپوشِ آتش بہ جانم
کہ یک لحظہ بے شعلہ خویاں نہ مانم

۴۰۴

روزیِ خود را بہ رنجِ از دردِ دنداں می خورم
ناں بہ خوں تر می شود تا پارۂ ناں می خورم

۴۰۵

بہ دل داری تواں کردن علاجم
کہ من دیوانۂ عاشق مزاجم

۴۰۶

من کہ در روئے تو می بینم و کاہش دارم
چشمِ لطف از تو بہ اندازۂ خواہش دارم

۴۰۷

در فکرِ خویش آخر اے دلبر اوفتادم
تا تکیہ بر تو کردم برِ بستر اوفتادم

۴۰۸

در مے کدہ پیراہن بسیار گرو کردم
ایں مرتبہ چوں رفتم، دستار گرو کردم

۴۰۹

در ایں درس گہ نیست جز بحثِ وہم
تو اے مغزِ خرخوردہ اندک بفہم

۴۱۰

پائے سروِ چمن وطن کردم
فکر بر اصلِ خویشتن کردم
شور و ہنگامہ اے عجب روداد
از لبِ یار تا سخن کردم

۴۰۳

میں وہ بوریا پوش آتش بہ جاں ہوں
کہ ایک لحظہ بھی شعلہ خووں کے بغیر نہیں رکھتا

۴۰۴

اپنا رزق دانتوں کے درد کی وجہ سے تکلیف سے کھاتا ہوں
جتنی دیر میں ایک ٹکڑا روٹی کھاتا ہوں روٹی خوں میں بھیگ جاتی ہے

۴۰۵

غم خواری سے میرا علاج کر سکتے ہیں
کہ میں عاشق مزاج دیوانہ ہوں

۴۰۶

میں کہ تیرے چہرے کو دیکھتا ہوں اور گھلتا رہتا ہوں
خواہش کے مطابق تجھ سے لطف کی امید رکھتا ہوں

۴۰۷

اے دلبر میں آخر اپنی فکر میں پڑ گیا ہوں
جب سے تجھ پر تکیہ کیا ہے، بستر پر پڑ گیا ہوں

۴۰۸

میں نے مے کدے میں بہت پیراہن رہن رکھے تھے
اس بار جب گیا دستار رہن رکھ دی

۴۰۹

اس درس گاہ میں وہم کی بحث کے سوا کچھ نہیں ہے
تُو (بھی) اے کوڑھ مغز کچھ سمجھ

۴۱۰

چمن کے سرو کے تلے اپنا وطن بنا لیا ہے
(اور) اپنی حقیقت پر غور کیا ہے
ایک شور اور ہنگامہ (کی) عجب کیفیت (کے ذریعہ)
میں لبِ یار کو سخن تک لایا

دل بہ او بستم آں چناں کہ چنیں
عاشق آزار و دل شکن کردم
رفتہ رفتہ ز گریۂ خونیں
ہمہ آں کوچہ را چمن کردم
ہر زماں دیدنش نمی بایست
ظلم بر خویش میرؔ من کردم

۴۱۱

از فغاں بلبل مکن ہر لحظہ آزارِ دلم
بر نمی تابد دماغِ من کہ بیمارِ دلم

۴۱۲

آخر از یمنِ زہد و تقوایم
بادہ پالا شدہ مصلاّیم

۴۱۳

شورِ عشقِ دلبرے از دیر در سر داشتیم
"یا جنوں" گفتیم و ایں بارِ گراں برداشتیم

۴۱۴

بیا و میرؔ غم از دل بہ باغ بیروں کن
در ایں شگفتہ زمیں یک دو شعر موزوں کن
دلا بہ شہر چہ سودائیانہ می گردی
برو بہ دشت و طوافِ مزارِ مجنوں کن
دماغِ رنجشِ بےجاے ہر زمانم نیست
بہ زخمِ تیغ سرم سرفراز و ممنوں کن
بہ ملکِ عشق دلِ شاد را نمی پرسند
تلاشِ خاطرِ غمگیں و جانِ محزوں کن

اس سے اس طرح دل لگایا کہ (اسے) اتنا
عاشق آزار اور دل شکن بنا دیا
رفتہ رفتہ گریۂ خونیں سے
(میں نے) اس کوچے کو تمام چمن بنا دیا
ہر وقت اسے دیکھنا نہیں چاہیے ہے
میرؔ میں نے اپنے پر ظلم کیا ہے

۴۱۱

اے بلبل فغاں سے ہر لحظہ میرے دل کو آزار مت پہنچا
میرا دماغ برداشت نہیں کر سکتا کہ (میں) دل کا بیمار ہوں

۴۱۲

آخر میرے زہد و تقویٰ کی سعادت سے
میرا مصلےٰ بادہ پالا[1] ہو گیا

۴۱۳

(ہم) مدّت سے سر میں ایک دلبر کے عشق کا جنوں رکھتے تھے
'یا جنوں' کہتے اور اس بارِ گراں کو اٹھاتے تھے

۴۱۴

آ اور اے میرؔ باغ میں دل سے غم باہر نکال
اس شگفتہ زمیں ایک دو شعر موزوں کر
اے دل کیوں شہر میں سودائیوں کی طرح گھوم رہا ہے
دشت میں جا اور مجنوں کے مزار کا طواف کر
مجھے ہر وقت رنجشِ بے جا کا دماغ نہیں ہے
میرے سر کو زخمِ تیغ سے سرفراز فرما اور ممنوں کر
ملکِ عشق میں شاد دل کو نہیں پوچھتے
خاطرِ غمگیں اور جانِ محزوں تلاش کر

---

[1] شراب چھاننے کا سامان۔

به هر لباس که باشی، بلندہمت باش
اگرت به خاک بپوشند، قصدِ گردوں کن
اگر به حسنِ قبول است میلِ خاطرِ تو
دماغ سوز و جگر چاک ساز و دل خوں کن
به کنجِ شہر چه هر لحظه می خروشی میرؔ
بسانِ سیل بزن جوش و قصدِ هاموں کن

۴۱۵

شد عشق برقِ طاقت و تاب و توانِ من
زد شعلہ اے که درزده آتش به جانِ من
خامش از آں شدم که تفِ سوزشِ دروں
مانندِ شمع سوخت سخن بر زبانِ من
اخلاصِ هم دگر به جهاں رسمِ کہنه بود
عیبے شده ست عشق همیں در زمانِ من
بسیار استخواں شکنی کرده ام چه دور
گردد اگر نشانۂ تیر استخوانِ من
مرغانِ باغ از دلِ شب تا دمِ سحر
مذکور می کنند بهم داستانِ من
چوں شمع گرم ره چو شوم خامشی گزیں
گم می شوم چناں که نه یابی نشانِ من
با موجِ بحرِ نور طرف شد هلالِ عید
هر چند یک کناره رسیدش ز خوانِ من
من آں مقدّس ام که از ایں ره چو بگذرند
بوسند قدسیاں به نیاز آستانِ من
آں نیستم که تابِ جفائے تو داشتم
اکنوں مباش ایں همه در امتحانِ من

جس لباس میں (بھی) رہ، بلند ہمت رہ
اگر تجھے خاک (کا لباس بھی) پہنا دیں، آسماں کا ارادہ کر
اگر تیری طبیعت کو حسنِ قبول کی خواہش ہے
دماغ جلا، جگر چاک کر اور دل خوں کر
شہر کے کونے میں ہر لحظہ کیا نالہ کرتا ہے میرؔ
سیلاب کی طرح جوش مار اور بیاباں کا قصد کر

۴۱۵

عشق میری طاقت اور تاب وتواں کے لیے برق (ثابت) ہوا
ایک شعلہ بھڑکایا کہ میری جان میں آگ لگا دی
اس وجہ سے خاموش ہو گیا کہ سوزِ دروں کی حرارت نے
شمع کے مانند سخن کو میرے زبان پر جلا دیا تھا
ایک دوسرے سے اخلاص دنیا میں پرانی رسم تھی
میرے ہی زمانے میں عشق ایک عیب بن گیا ہے
بہت استخواں شکنی[1] کر چکا ہوں، کیا دور (ہے)
اگر میرا استخوان تیر کا نشانہ بن جائے
باغ کے پرندے آدھی رات سے لے کر صبح کے وقت تک
مل کر میری داستان بیان کرتے ہیں
شمع کی مانند خاموشی اختیار کر کے جب روانہ ہو جاؤں گا
میں اس طرح گم ہو جاؤں گا کہ میرا نشان (بھی) نہیں پائے گا
بحرِ نور کی موج کے ساتھ ہلالِ عید مقابل تھا
حالانکہ بہت تھوڑا سا حصہ میرے خواں سے اس تک پہنچا تھا
میں اتنا مقدّس ہوں کہ اس راہ سے گزرتے ہوئے
فرشتے عجز کے ساتھ میرے آستاں کو چومتے ہیں
میں وہ نہیں رہ گیا جو تیری جفا کی تاب رکھتا تھا
اب میرے امتحان (کی فکر) میں اس قدر مت رہ

---

[1] نہایت محنت۔

با این قد خمیدہ بلائے زمانہ ام
امروز در جہاں نہ کشد کس کمانِ من
ہر چند تن بہ خواریِ خود دادہ ام ولے
سوگند می خورند عزیزاں بہ جانِ من
پروائے کج پلاسیِ گردوں نمی کنم
ارفع بود بہ فقر از ایں سفلہ شانِ من
آں قدرناشناس پئے خاطرِ رقیب
آخر کشید پردہ ز رازِ نہانِ من
در عشق میرؔ خوردہ فروشی گزیدہ ام
لختِ دل است جملہ متاعِ دکانِ من

۴۱۶

یک رہ بہ سر نیامد از لطف دلبرِ من
دور ام ز خاکِ پایش، اے خاک بر سرِ من
باید کہ پاسِ دل را چندے نگاہ داری
نادیدہ روزگار است آغوش پرورِ من
تا رفتہ ای ز چشمم، اے خوب تر ز یوسف
پیراہن است آبی چوں نیل در برِ من
از بوستانِ جنّت دارد دلم فراغے
قدِ تو طوبیٰ من، لعلِ تو کوثرِ من
دیدم ز دستبردش بےدین و دل بسے را
جز بد نہ باخت با کس خوبِ ستم گرِ من
آئینہ وار این جا تا چشم باز کردم
خلقے ہجوم دارد ہر صبح بر درِ من
آخر ز گریہ ناکی رسوائے خلق گشتم
شد میرؔ کار ضائع از دیدۂ ترِ من

اس قدِ خمیدہ کے ساتھ بلائے زمانہ ہوں
آج (بھی) دنیا میں کوئی میرا ہم پلّہ نہیں ہے
ہر چند اپنی رسوائی کی (پوری) کوشش کر چکا ہوں، لیکن
دوست (اب بھی) میری جان کی قسم کھاتے ہیں
(میں) آسماں کی بدمعاملگی کی پروانہیں کرتا
فقر کی وجہ میری شان اس رذیل سے اونچی ہوگئی ہے
اس قدر ناشناس نے رقیب کی طرفداری میں
آخر میرے چھپے ہوئے راز سے پردہ اٹھا دیا
عشق میں میرؔ میں نے خوردہ فروشی اختیار کی ہے
میری دکان کی جملہ متاع لختِ دل ہے

۴۱۶

ایک بار بھی میرا دلبر مہربانی سے پیش نہیں آیا
اس کے پیروں کی خاک سے دور ہوں، میرے سر پہ خاک ہو
میرے دل کی حفاظت کی کچھ فکر کرنی چاہیے
میرے آغوش پرور نے زمانے کو نہیں دیکھا ہے
اے یوسف سے خوب تر جب سے تو میری آنکھوں سے دور ہوا ہے
میرے جسم پر نیل کی طرح آبی پیراہن[1] ہے
جنّت کے باغ سے میرا دل فراغت رکھتا ہے
تیرا قد میرا طوبٰی (ہے) تیرے لب میرا کوثر (ہیں)
اس کی لُوٹ سے بہتوں کو بے دین اور دل (ہوتے ہوئے) دیکھا ہے
میرے خوبصورت ستمگر نے کسی کے ساتھ بھی بدی کے سوا کچھ نہیں کیا
اس جگہ آئینے کی طرح جب سے میں نے آنکھیں کھولی ہیں
لوگ (ہر) صبح میرے دروازے پر مجمع لگا دیتے ہیں
آخر روتے رہنے سے خلق میں رسوا ہوگیا
میرؔ میرے دیدۂ تر نے کام بگاڑ دیا

---

1 ماتمی لباس۔

۴۱۷

تنگ شد حوصلہ آخر چہ قدر خوں خوردن
بہرِ ایں ہستیِ موہوم و بہ حسرت مردن
خودکشی کن کہ تہِ تیغِ کسے بنشینی
ننگِ عشق است دلا جاں بہ سلامت بردن
شکرِ ایں حسن مگر در پئے ایذا شدن است
اے جواں، یمن نہ دارد دلِ کس آزردن
بےنیازیِ فقیراں ز رعونت مشمار
مصلحت نیست ترا بر سرِ ناز آوردن
یک رہش میرؔ ببر گیر و بیفشار بہ کام
چند خود را ز رہِ ذوق بہم افشردن

۴۱۸

شد گلستاں از خیالِ دلبراں زندانِ من
یوسفستاں گشت آخر کلبۂ احزانِ من
دل کہ از من می بری بارے پئے تسکیں بگو
ہیچ می دانی رہ و رسمِ وفا را جانِ من
بس کہ کارِ گریہ‌ام اے میرؔ بالا رفتہ است
خرقہ دارد ابر ہم از دیدۂ گریانِ من

۴۱۹

آتش بہ دل زند نفسِ آتشینِ من
سوراخ در جگر کند آہِ حزینِ من
من سخت شیشہ جان ام و آں غیرتِ پری
سرگرمِ کینہ سنگ بہ کف در کمینِ من
شب ہا بہ وقتِ گریہ چو بر چشمِ تر کشم
چوں برق روئے ابر بود آستینِ من

۴۱۷

حوصلہ تنگ ہو گیا آخر کتنا خوں پینا
اس موہوم ہستی اور حسرت کے ساتھ مرنے کے لیے
خودکشی کر کہ کسی کی تیغ کے تلے بیٹھا ہے
اے دل جان سلامت لے جانا عشق کی رسوائی ہے
اس حسن کا شکریہ مگر (یہ) آزار پہنچانے کی فکر میں ہے
اے جواں، کسی کے دل کو رنجیدہ کرنے میں کوئی سعادت نہیں ہے
فقیروں کی بے نیازی کو رعونت میں شمار مت کر
تجھے بر سرِ ناز لے آنے میں مصلحت نہیں ہے
ایک بار اسے میرؔ آغوش میں کھینچ اور مراد (پوری کرنے) کے لیے بھینچ
کب تک خود کو عشق کی راہ میں نچڑوانا

۴۱۸

دلبروں کے خیال سے میرا زنداں گلستاں بن گیا
میرا کلبۂ احزاں آخر یوسفستان بن گیا
تو مجھ سے دل لے جا رہا ہے، آخر تسکین کے لیے یہ تو بتا
جانِ من وفا کی راہ و رسم کا کچھ پتہ بھی ہے
بسکہ میرے رونے کا کام اے میرؔ بہت ترقی حاصل کر چکا ہے
ابر بھی میرے دیدۂ گریاں کا مرید ہو گیا ہے

۴۱۹

میری آتشیں سانس دل میں آگ لگا دیتی ہے
میری آہِ حزیں جگر میں چھید کر دیتی ہے
میں بہت شیشہ جاں[1] ہوں اور وہ غیرتِ پری
ہاتھ میں سنگ لیے میری تاک میں سرگرمِ کینہ ہے
راتوں کو جب روتے ہوئے چشم تر پر رکھتا ہوں
میری آستیں بادل میں بجلی کی طرح ہوتی ہے

---

[1] نازک طبیعت۔

در حضرتِ تو بردہ ام از بس کہ سجدہ ہا
سائیدہ شد بسانِ مہِ نو جبینِ من
ابرو ترش نمودہ بہ مرگم نشست و رفت
یعنی کہ بر نہ داشتہ دل را زِ کینِ من
خوارم نہ من کہ از نگہِ کافر کسے
از راہ رفتہ اند عزیزانِ دینِ من
خوب است ضبطِ نالہ کنم یک دور روز میرؔ
آزردہ خاطر است ز من ہم نشینِ من

۴۲۰

یا بیا تلخ او گوارا کن
یا برو ترکِ ایں تمنّا کن
ہم چو من گر سرِ جنوں داری
اول اے شیخ عقل پیدا کن
آں کمر ہیچ بود و بگرفتم
دستِ غیبِ مرا تماشا کن
واجب است آب گیریِ شمشیر
رحم بر جانِ غم کشِ ما کن
پۓ طوفِ حرم چہ می گردی
سعی کن میرؔ و در دلے جا کن

۴۲۱

نہ پنداری کہ آسان است با کینش طرف گشتن
جگر می خواہد اے دل ناوکِ او را ہدف گشتن
چو سیلابے کہ می افتد بہ ریگستاں گذارِ او
بہ ہرگامم در ایں رہ پیش می آید تلف گشتن
گدایم میرؔ لیکن دستِ خواہش زیرِ سر دارم
نمی آید ز من در کوچہ ہا کشتی بہ کف گشتن

تیرے حضور اپنی پیشانی لایا ہوں جو کہ ماہِ نو کی طرح
سجدوں سے بہت زیادہ گھس چکی ہے
میرے مرنے پر تیوری چڑھائے آیا، بیٹھا اور چلا گیا
یعنی کہ دل سے میرے کینے کو نہیں مٹایا
میں (ہی) کسی کی کافر نگاہ سے رسوا نہیں ہوا
میرے ہم مذہب دوست بھی راستے سے بھٹک گئے ہیں
میرؔ بہتر ہے کہ دو ایک دن نالے کو روکے رہوں
میرا ہم نشیں مجھ سے آزردہ خاطر ہے

۴۲۰

یا آ (اور) اس کی تلخی کو گوارا کر
یا جا، یہ تمنا چھوڑ دے
اگر میری طرح جنوں کی خواہش رکھتا ہے
پہلے اے شیخ عقل پیدا کر
وہ کمر (موجود) نہیں تھی اور (میں نے) پکڑ لی
میرے دستِ غیب کو دیکھو
تلوار پر دھار رکھنا ضروری ہے؟
میری غم کش جان پر رحم کر
طوف حرم کے لیے کیا گھوم رہا ہے
میرؔ سعی کر اور کسی دل میں جگہ (پیدا) کر

۴۲۱

یہ گمان مت کر کہ اس کے کینے کا سامنا کرنا آسان ہے
اے دل اس کے تیر کا نشانہ بننے کے لیے جگر چاہیے
اس سیلاب کی طرح جس کا گزر ریگستاں سے ہو
مجھے ہر گام پر اس راہ میں تلف ہونا پیش آتا ہے
میرؔ میں گدا ہوں لیکن دستِ خواہش سر کے تلے رکھتا ہوں
مجھے گلیوں میں کاسۂ گدائی لیے پھرنا نہیں آتا

۴۲۲

نہ دارم بیش از ایں تابِ جفا من
ترحم کن کہ آخر تا کجا من
رہِ دشمن الٰہی بستہ باشد
ہنوز آں بدزباں خوب است با من
سخن کوتاہ شد تا جاں سپردم
تمامی گفتگو بودہ ست با من
کشی ہر دم صفیرم از پئے سر
تو بلبل نیستی یک روز یا من
منہ دل بر خراب آبادِ عالم
خطرگاہ است ایں صحرا نہ مامن
بسانِ گردباد از وحشت اے میرؔ
بباید بودنت بر چیدہ دامن

۴۲۳

خواہم چو ابر بے تو بہ صحرا گریستن
دامن بہ رو کشیدن و دریا گریستن
بر چشمِ ما کسے نہ کشید آستیں ز لطف
ما ایم و کلبۂ غم و تنہا گریستن
فرصت غنیمت است اگر یک نفس بود
اے صبح خندہ از تو و از ما گریستن
یک جا گر اتفاق شود گریہ خوشتر است
داری تو ہم سحاب سرے با گریستن
دوش از چہ بود دیدۂ خوں بستۂ تو میرؔ
چوں زخم تازہ پختہ سراپا گریستن

۴۲۲

میں اس سے زیادہ جفا کی تاب نہیں رکھتا
رحم کھا کر آخر میں کہاں تک (بچوں گا)
الٰہی دشمن کی راہ بند ہو جائے
ابھی تک وہ بدزبان میرے ساتھ خوب (نبھا رہا) ہے
بات مختصر ہو گئی جب جان نثار کر دی
ساری گفتگو میرے ہی ساتھ رہی ہے
ہر وقت (تُو) میرا نالہ سر کرنے کے لیے کھینچتی ہے
(اے) بلبل ایک دن یا تو نہیں یا میں (نہیں)
دنیا کے خراب آباد سے دل نہ لگا
یہ صحرا خطرے کی جگہ ہے، امن کی جگہ نہیں (ہے)
گردباد کی طرح اے میرؔ وحشت سے
تجھے دامن سمیٹے ہوئے رہنا چاہیے

۴۲۳

میں تیرے ہجر میں ابر کی طرح صحرا میں رونا چاہتا ہوں
دامن منھ پر تاننا اور دریا (دریا) رونا
ہماری آنکھ پر کسی نے مہربانی سے آستین نہیں رکھی
ہم ہیں اور غم کا حجرہ اور تنہا رونا
فرصت غنیمت ہے اگر ایک نفس ہو
اے صبح تجھ سے خندہ اور ہم سے رونا
اگر اتفاق ہو ایک ساتھ رونا اچھا ہے
تو بھی اے بادل رونے کا خیال رکھتا ہے
کل تیری خوں بستہ آنکھیں میرؔ کس بات پر
تازہ پکے ہوئے زخم کی طرح بہت زیادہ روئیں تھیں

۴۲۴

هر لحظہ نہاں سوئے تو باشد نظرِ من
از عشق بلاے ست عجب زیرِ سر من
از فرطِ تپش دوش چہ گویم کہ چہ دیدم
صد مرتبہ برگشت ز مژگاں جگرِ من
در فکرِ سراغم نفسِ خویش مسوزید
عمرے ست کہ گم گشت عزیزاں خبرِ من
من جاں بکنم خوب و جگر خوب خراشم
بر سنگ زدن تیشہ نہ باشد ہنرِ من
چوں نقشِ قدم ہست کہ امروز نمودم
فرداست کہ اے میرؔ نہ یابی اثرِ من

۴۲۵

رفتن ضرورت است دلا اضطراب کن
فرصت کم است دورِ فلک را شتاب کن
دارم بتے بلا بہ سرِ عالم آورے
جورِ زمانہ در ستم خود حساب کن
دارد فلک فسردہ دلت تا کجا چو موم
آہے بکش ز سوز و دلِ سنگ آب کن
آرام و عشق میرؔ کجا جمع می شوند
داری اگر خیالِ کسے ترکِ خواب کن

۴۲۶

محبت پیشہ ام دارم جگر خوں
دلِ من می تپد بسیار در خوں
شد آں عہدے کہ مژگاں نم نمی شد
کنونم می چکد از چشم تر خوں

۴۲۴

ہر لحظہ تیری طرف میری نظر چھپ کر لگی رہتی ہے
عشق سے میرے سر میں عجب بلا ہے
فرطِ تپش سے کل کیا کہوں کیا دیکھا
سو بار مژگان تک آ کر میرا جگر لوٹ گیا
میری تلاش میں اپنا نفس مت جلائیے
مدت ہوئی دوستو کہ میری خبر گم ہو چکی ہے
میں جان کو خوب اذیت دیتا ہوں اور جگر کو خوب نوچتا ہوں
پتھر پر تیشہ مارنا میرا ہنر نہیں ہے
نقشِ قدم کی طرح ہے اگر آج میں نظر آ رہا ہوں
کل ہے کہ اے میرؔ (تو) میرا نشان نہیں پائے گا

۴۲۵

جانا ضروری ہے اے دل بے تابی دکھا
دورِ فلک کو فرصت کم ہے جلدی کر
ایک عالم کے سر پر بلا لانے والا محبوب رکھتا ہوں
زمانے کے ظلم کو (بھی) اپنے ستم میں شمار کرنے والا
فلک تجھے کب تک موم کی طرح افسردہ دل[۱] رکھے
سوز سے ایک آہ کھینچ اور پتھر کا دل پانی کر دے
آرام اور عشق میرؔ کہاں جمع ہوتے ہیں
اگر کسی سے عشق کرتا ہے سونا چھوڑ دے

۴۲۶

محبت پیشہ ہوں خون کیا ہوا جگر رکھتا ہوں
میرا دل خون میں بہت تڑپتا ہے
وہ وقت گزر گیا کہ میری پلکیں نم نہیں تھیں
اب میری چشمِ تر سے خون ٹپکتا ہے

---

۱ ٹھٹھرتا ہوا۔

از آں روزے کہ بستی بر کمر تیغ
بہ کویت ماندہ ظالم تا کمر خوں
بہ تن از گریہ ام رنگے نہ ماندہ ست
کمر را بستہ ای ناحق تو بر خوں
بہ گل بنشستہ دشمن تا بہ گردن
مرا بگذشتہ در بزمش ز سر خوں
بیا، مانندِ زخمِ تازہ تا چند
رود از دیدۂ من ہر سحر خوں
دمے صد بار چشمت خوں بیارد
بیاید از کجا میرؔ ایں قدر خوں

۴۲۷

گہ سنگ زدن بر سر، گہ پارہ جگر کردن
چندے بہ سرِ کویش ہر نوع بسر کردن
می گریم و می نالم لیکن ہمہ تن یاسم
کز اشک سرایت شد و ز نالہ اثر کردن
دیدم ہمہ می آید زآں چشم و نمی آید
بر حالِ وفاداراں از لطف نظر کردن
از مضطرب الحالی صد بار بہ لب آید
افتادہ مگر جانم در فکرِ سفر کردن
اے میرؔ مشو غافل از وقتِ عزیزِ خود
ایں بےخبری تا کے، شرط است خبر کردن

۴۲۸

از خلفِ وعدہ خوباں تا کے حیا نہ کردن
ہر روز وعدہ کردن یک رہ وفا نہ کردن
زیں صید پیشہ ترکاں ایں طور یادگارے ست
مرگِ اسیر دیدن لیکن رہا نہ کردن

جس روز سے کہ تو نے کمر میں تیغ باندھی
ظالم تیرے کوچے میں کمر تک خون کھڑا ہوا ہے
میرے بدن میں روتے رہنے سے خون باقی نہیں رہا ہے
تو نے ناحق خون پر کمر باندھی ہے
دشمن گردن تک پھولوں میں بیٹھا ہے
مجھ پر اس کی بزم میں سر سے خون گزر گیا
آ کہ کب تک زخمِ تازہ کی طرح
میری آنکھ سے ہر صبح خون بہتا رہے
ایک دم میں سو بار تیری چشم خون روتی ہے
میرؔ اتنا خون کہاں سے آتا ہے

۴۲۷

کبھی سر پر پتھر مارنا، کبھی جگر کے ٹکڑے کرنا
کچھ دن اس کے کوچے میں ہر طرح بسر کرنا
روتا ہوں اور نالہ کرتا ہوں لیکن بالکل ناامید ہوں
اشک سے کہ سرایت کرے اور نالہ سے کہ اثر کرے
(میں نے) دیکھا کہ اس چشم کو سب کچھ آتا ہے اور نہیں آتا (تو)
وفاداروں کے حال پر مہربانی کے ساتھ نظر کرنا
پریشانی سے سو مرتبہ ہونٹوں پر آتی ہے
ضرور میری جان سفر کرنے کی فکر میں پڑی ہے
میرؔ اپنے وقتِ عزیز سے غافل مت رہ
یہ بے خبری کب تک، آگاہ کرنا شرط ہے

۴۲۸

(اے) خوباں وعدہ خلافی پر کہاں تک شرم نہ کرنا
ہر روز وعدہ کرنا ایک بار (بھی) وفا نہ کرنا
ان شکاری ترکوں کا یہ طور یادگار ہے
اسیر کا مرنا دیکھنا لیکن رہا نہ کرنا

عادت پذیرِ لطفت اے شوخ دیگراں اند
ظلمے ست بےنہایت بر من جفا نہ کردن
از غم کشانِ او ماند ایں رسم در زمانہ
کز فرط درد مردن ہرگز دوا نہ کردن
پیری رسید و آمد نزدیک وقتِ رفتن
تا چند میرؔ صاحب ترکِ ہوا نہ کردن

۴۲۹

نیامد یک تپش از بسملِ من
کہ شد حیران حسنِ قاتلِ من
دمے استادم ایں جا و گذشتم
کہ بود آں سوئے عالم منزلِ من
دلم می گوید آں بحر بلا ام
کہ پیدا نیست ہر گز ساحلِ من
درونم سوختی اے بت ز سختی
کبابِ سنگ شد آخر دلِ من
بیا بعد از نمازِ جمعہ بشنو
خواصِ من ز پیرِ کاملِ من
تو مستغنی و دل را اضطراب است
خدا آساں نماید مشکلِ من
بہ آں مقصود رہ بردن دلیل است
کہ حق بودہ ست سعیِ باطلِ من
بہ ایں تلخی بپئے خونم فتادہ ست
چہ شیرین است اے ہمدم گلِ من
در ایں فن گرچہ کم گو بودہ ام میرؔ
و لیکن عالمے شد قائلِ من

اے شوخ تیری مہربانی کے عادی دوسرے ہیں
مجھ پر جفا نہ کرنا بے انتہا ظلم ہے
اس کے غم کشوں (کی وجہ) سے زمانے میں یہ رسم باقی ہے
کہ درد کے حد سے گزرنے سے مر جانا، ہرگز دوا نہ کرنا
بڑھاپا آ پہنچا اور جانے کا وقت نزدیک آ گیا
کب تک میرؔ صاحب خواہش کو ترک نہ کرنا

۴۲۹

مجھ بسمل میں کوئی بھی تڑپ نہیں پیدا ہوئی
میرے قاتل کا حسن حیران ہو گیا
چند گھڑی (میں) یہاں کھڑا تھا اور (پھر) چلا گیا
کہ اُس دنیا کی طرف میری منزل تھی
میرا دل کہتا ہے کہ میں وہ بحرِ بلا ہوں
کہ میرا ساحل بالکل نظر نہیں آتا ہے
اے بت تو نے سنگ دلی سے میرا سینہ جلا دیا
میرا دل آخر کبابِ سنگ[1] ہو گیا
نمازِ جمعہ کے بعد آ اور سن
میرے پیرِ کامل سے میرے خواص
تو بے پروا اور دل کو اضطراب ہے
خدا میری مشکل کو آسان بنائے
اس مقصود کے ساتھ راہ طے کرنا دلیل ہے
کہ میری سعیٔ باطل حق تھی
اس تلخی کے ساتھ میرے خون کے پیچھے پڑا ہے
اے ہمدم میری خاک کتنی شیریں ہے
اس فن میں اگرچہ کم گو رہا ہوں میرؔ
لیکن ایک عالم میرا قائل ہو گیا

---

[1] گرم پتھروں پر بھونا ہوا گوشت۔

۴۳۰

سر رفت و گشت باعثِ راحت برائے من
مردن بہ راہِ عشقِ تو آمد بہ پائے من
مجنوں گذشت و بندہ نشستم بہ جائے او
تا بعدِ مردنم کہ نشیند بہ جائے من
در عیش گاہ رحلِ اقامت نیفگند
عادت پذیر بودنِ ماتم سرائے من
کے گفتہ ام کہ ترکِ مروّت مکن ولے
یک چند شرم دار ز روئے وفائے من
با غیر بادہ خورد و مرا تلخ ہم نہ گفت
بسیار آب می برد ایں ماجرائے من
خواہم کہ میرؔ یار شود عاشقِ کسے
تا ہمدمِ غمش نہ شود کس سوائے من

۴۳۱

از ہر کسے نیاید صرفِ نیاز گشتن
ایں جا چو موم باید یکسر گداز گشتن
ایں جمعِ رفتنی را دریاب و مغتنم داں
چوں عمر کس نہ دارد امیدِ بازگشتن
تقریبِ راحتِ دل بہتر از ایں نہ دیدم
ہر چند قبح دارد بے امتیاز گشتن
بنشیں دمے و بنگر احوال جاں گدازاں
مغرورِ حسن و خوبی تا کے بہ ناز گشتن
افگن بساطِ عشرت چوں سبزہ میرؔ تا کے
در سایۂ درختاں بے برگ و ساز گشتن

۴۳۰

سر اُڑ گیا اور میرے لیے راحت کا باعث ہو گیا
تیری راہ میں مرنا میرے کام آیا
مجنوں گزر گیا اور میں اس کی جگہ بیٹھا
میرے مرنے کے بعد میری جگہ کون بیٹھے گا
عیش گاہ میں ڈیرہ نہیں ڈالتا
میری ماتم سرا میں رہنے کی عادت رکھنے والا
میں نے کب کہا کہ مروّت کو نہ چھوڑ، مگر
میری وفا کے سامنے کچھ (تو) شرم کر
غیر کے ساتھ شراب پی اور مجھے برا (بھی) نہیں کہا
میرے ساتھ (یہ) واقعہ بہت تعجب انگیز ہے
میرؔ چاہتا ہوں کہ یار کسی کا عاشق ہو جائے
تا کہ اس کے غم کا میرے سوا کوئی ہمدم نہ ہو

۴۳۱

ہر ایک کو صرفِ نیاز ہونا نہیں آتا
اس جگہ موم کی طرح تمام پگھل جانا پڑتا ہے
ان گزرنے والوں کے مجمع کا کھوج لگا اور غنیمت جان
کیوں کہ عمر کی طرح (ان میں سے) کسی کے پلٹ آنے کی امید نہیں
میں نے دل کی راحت کی صورت اس سے بہتر نہیں دیکھی
ہر چند کہ بے مقصد گھومنا قباحت رکھتا ہے
کچھ دیر بیٹھ اور جان دینے والوں کا حال دیکھ
(اے) حسن اور خوبی کا غرور کرنے والے کب تک ناز سے گشت کرتا رہے گا
سبزے کی طرح میرؔ بساطِ عشرت بچھا، کب تک
درختوں کے سائے میں بے برگ و ساز[1] پھرنا

---

[1] بے سروسامان۔

۴۳۲

سرم بجاست اگر رفت در سرِ خوبان
علاقہ داشت دلِ من بہ خنجرِ خوباں
ہمیشہ سرخ بہ خونِ شکار می باشد
خدنگِ سیرِ جفا زخم پرورِ خوباں
از ایں حدیقہ کہ سرسبز تا قیامت باد
خوشم فتاد قیامت گلِ ترِ خوباں
بہ زلف و کاکل و خط می کشد دلم ہر دم
چہ خوش سواد فتادہ ست کشورِ خوباں
بیا و میرؔ سرانجامِ عشق بیں کآخر
گلوئے خویش بریدیم بر درِ خوباں

۴۳۳

رفتم ز خویش آخر از فرطِ دل تپیدن
دشوار می نماید اکنوں بہ خود رسیدن
اے کاش دل ز چشمم یک بارگی بیفتد
تا چند قطرہ قطرہ خوں از مژہ چکیدن
من خود فقط نہ بردم با خویش نا امیدی
پوشید چشم خلقے در آرزوئے دیدن
ہر چند از ایں بیاباں بوئے فتیلہ آمد
در خاطرم نیامد اندیشۂ رمیدن
ایں گونہ دلبرے را دامن کہ می گذارد
اے گل فروش باید دستِ ترا بریدن
از جوشِ اشکِ خونیں سطرے نوشتہ ام من
رنگیں حکایت است ایں، یک دم تواں شنیدن
کس نیست بابِ صحبت، دل با کہ انس گیرد
خوب است میرؔ چندے در را بہ رو کشیدن

۴۳۲

اگر میرا سر خوباں کے خیال میں کٹ گیا، ٹھیک ہوا
میرا دل خوباں کے خنجر سے ربط رکھتا تھا
ہمیشہ شکار کے خون سے سرخ رہتا ہے
حسینوں کا ظلم سے بھرپور زخم کا پالنے والا تیر
اس باغ میں کہ (جو) قیامت تک سرسبز رہے
مجھ پر خوباں کے گلِ تر نے اچھی قیامت برپا کی ہے
زلف اور کاکل اور خط سے ہر دم میرا دل کھنچتا ہے
خوباں کا ملک کیا خوش سواد ہے
آ اور (اے) میرؔ عشق کا انجام دیکھ کہ آخرِکار
(ہم) اپنا گلا خوباں کے در پر کاٹ رہے ہیں

۴۳۳

میں دل کے تڑپنے کی زیادتی سے آخر خود سے گزر گیا
اب خود تک پہنچنا دشوار نظر آ رہا ہے
اے کاش دل آنکھوں سے یک بارگی گر جاتا
کب تک قطرہ قطرہ پلکوں سے ٹپکتے رہنا
میں نے خود اکیلے ناامیدی اپنے ساتھ لے کر نہیں گیا
خلق نے (بھی) دیکھنے کی آرزو میں آنکھیں بند کر لیں
ہر چند اس بیاباں سے خطرے کی بو آئی
(مگر) میرے دل میں بھاگنے کا خیال نہیں آیا
اس طرح کے دلبر کا دامن کون چھوڑتا ہے
اے گلفروش تیرا ہاتھ قطع کر دینا چاہیے
میں نے اشکِ خونیں کے جوش سے ایک سطر لکھی ہے
یہ رنگیں حکایت ہے، کسی وقت سننا چاہیے
کوئی صحبت کے قابل نہیں ہے دل کس سے انس رکھے
میرؔ کچھ دن رُخ پر دروازے کو بند رکھنا اچھا ہے

۴۳۴

دوغزلہ

بر باد شد بہ راہِ تو مشتِ غبارِ من
یک رہ نیامدی ز وفا بر مزارِ من
رسوائے عشق آخرِ کارم قرار داد
بر ہر سخن گریستنِ زار زارِ من
با سرکشی چو نقشِ قدم نیست نسبتم
افتادگی ست شیوۂ اہلِ دیارِ من
گاہے ہزار اشک چو ابرم ز دیدہ ریخت
دشوار شد ز وادیٔ مجنوں گذارِ من
کشتی مگر روانہ شود در شطِ شراب
خم خانہ خود نہ گشت حریفِ خمارِ من
طفل است و روزگارِ محبّت نہ دیدہ است
مہر و وفا مدار توقع ز یارِ من
آوازہ ام گرفت چو عنقا تمام شہر
شد گوشہ گیریَم سببِ اشتہارِ من
یارے کہ پائمالِ غمِ ہجرِ او شدم
از دست رفت کار، نیامد بہ کارِ من
گلگونیِ سرشک و دلِ داغ داغ میرؔ
رنگِ بہار ریخت بہ جیب و کنارِ من
خواہم کہ فکرِ یک دو سہ بیتِ دگر کنم
تا ماند ایں غزل بہ جہاں یادگارِ من

مطلعِ دوم

عزّت تمام رفت و نماند اعتبارِ من
در کوئے تو ز آمدنِ بار بارِ من

۴۳۴

دو غزلہ

میری مشتِ غبار تیری راہ میں برباد ہو گئی
تو ایک بار بھی وفا (کے خیال) سے میرے مزار پر نہ آیا
آخر کار (مجھے) رسوائے عشق قرار دے دیا
میرے ہر بات پر زار زار رونے نے
سرکشی سے نقشِ قدم کی طرح مجھے (بھی) نسبت نہیں ہے
میرے دیار کے لوگوں کا شیوہ انکسار ہے
ہر گام پر ابر کی طرح میرے ہزار آنسو آنکھوں سے بہے
وادیٔ مجنوں سے میرا گزرنا دشوار (ہو گیا) تھا
کشتی شاید شراب کے دریا میں روانہ ہو گئی
خم خانہ خود میرے خمار کا حریف نہیں ہوا
(وہ) طفل ہے اور (اس نے) روزگارِ محبت کو نہیں دیکھا ہے
مہر و وفا کی توقع میرے یار سے مت رکھ
میری شہرت نے عنقا کی طرح تمام شہر کو گرفت میں لے لیا
گوشہ گیری میری شہرت کا سبب بن گئی
ایک دوست کہ جس کے ہجر کے غم سے پامال تھا
کام ہاتھ سے نکل گیا (اور) میری مراد پوری کرنے نہیں آیا
آنسوؤں کی گلگونی اور داغ داغ دل میرؔ
میری جیب و کنار پر بہار کا رنگ بکھرا گئے
چاہتا ہوں کہ ایک دو اور شعروں کی فکر کروں
تا کہ یہ غزل دنیا میں میری یادگار رہ جائے

مطلعِ دوم

تمام عزّت چلی گئی اور میرا اعتبار نہیں رہا
تیرے کوچے میں میرے بار بار آنے سے

با آں کہ شش جہت ز تو لبریز گشتہ بود
مردم در انتظار و نہ گشتی دُچارِ من
قامت ز داغِ ہر بُنِ مو گشت گلبنم
حیف از غرورِ حسن نہ گشتی بہارِ من
در صحبتِ نخست بہ تاراجِ غمزہ داد
ایمان و دین و ہوش و حواس و قرارِ من
از داغ تا بہ داغ بود فرق اے نسیم
بنما بہ لالہ ایں جگرِ داغ دارِ من
یارب کجا ز بےخودئ عشق رفتہ ام
چشمم سفید شد بہ رہ انتظارِ من
صد حیف در محبّتِ آں ترکِ شوخ چشم
شد با ہزار رنج بسر روزگارِ من
پنہاں ز ناکسی اگرش از نظر شوم
گوید کہ مفت رفت دریغا شکارِ من
ایں حرف گفتنی ست بہ دیوار و در کہ میرؔ
رفتہ ست کارِ چشمِ تر از ختیارِ من

۴۳۵

ہر شب نشینم از غم او تا کمر بہ خوں
دست و دہانِ خویش کشم ہر سحر بہ خوں
مسکیں کبوترے کہ بر او بود نامہ ام
آغشتہ یافتند از او بال و پر بہ خوں
چنداں تعب کشید دمِ بسملم کہ یار
ہر گز کمر نہ بست کسے را دگر بہ خوں

۴۳۶

دل مگر مردی ز جورِ آسماں، دادے بکن
دست زن در دامنِ صحرا و فریادے بکن

اس کے باوجود کہ شش جہت تجھ سے لبریز تھی
میں تیرے انتظار میں مر گیا اور تجھ سے دُچار نہیں ہوا
ہر بُن مو کے داغ سے میری قامت گُلبُن[1] بن گئی تھی
حیف کہ تو نے غرورِ حسن سے میری بہار کی سیر نہیں کی
پہلی ہی ملاقات میں غمزے سے لُوٹ لیے
میرے ایماں اور دیں اور ہوش اور حواس اور قرار
اے نسیم ایک داغ سے دوسرے داغ میں فرق ہوتا ہے
لالہ کو یہ میرا داغ دار جگر دکھا
یارب عشق کی بے خودی میں کہاں چلا گیا ہوں
میری آنکھیں میرے انتظار کی راہ میں بے نور ہوگئیں ہیں
صد حیف اس شوخ چشم ترک کی محبت میں
میرے دن ہزاروں رنج کے ساتھ بسر ہوئے
اگر بے کسی کی وجہ اس کی نظر میں نہ آؤں
کہتا ہے افسوس میرا شکار مفت چلا گیا
یہ بات دیوار و در سے کہتا ہے کہ میرؔ
چشمِ تر کا کام میرے اختیار سے نکل گیا ہے

۴۳۵

ہر شب اس کے غم میں تا کمر خون میں بیٹھا ہوں
ہر صبح اپنے دست و دہن خون میں کھینچتا ہوں
بے چارہ کبوتر کہ جس کے پاس میرا خط تھا
اس کے بال و پر خون میں غلطیدہ پائے گئے
مجھے ذبح کرتے وقت اتنی تکان اٹھائی کے یار نے
پھر کسی دوسرے کے خون پر کمر نہیں باندھی

۴۳۶

اے دل شاید تو آسماں کے ظلم سے مر چکا ہے، فریاد کر
دامنِ صحرا کو تھام اور فریاد کر

---

[1] گلاب کے پھول کا پودا۔

خاکم از کوئے کسے بسیار دور افتادہ است
اندک اندک اے صبا ہر روز امدادے بکن
می برد از بزمِ عیشت طالع برگشتہ ام
جرعہ اے بر خاک اگر ریزی ز من یادے بکن

۴۳۷

برِ ہر کہ چند گریم ز عذابِ دردِ دنداں
نہ خورم بہ بزم چیزے، نہ شوم ز شرم خنداں
دلِ آئینہ مثالم شدہ دیدنی و لیکن
نہ شد آں کہ رو دہندش دمِ چند خودپسنداں

۴۳۸

تا سوزِ عشق روئے خود آورد سوئے من
چوں شمع اشک متصل آید بہ روئے من
گم شد مرا چو جانِ عزیز آہ یوسفے
سودے نہ داد در رہِ او جستجوئے من

۴۳۹

غیر ہر چند دہد یاد فراموشیٔ من
خواہد آمد بہ سخن یار ز خاموشیٔ من
عید تقریبِ خوشے بود و لیکن صد حیف
ماند بر عیدِ دگر از تو ہم آغوشیٔ من

۴۴۰

گر ز تیرِ عشق جاں قربانِ او خواہد شدن
استخوانم کرسیِ پیکانِ او خواہد شدن

۴۴۱

بہ رہش گذار می کن ولے اے صبا نہ چنداں
کہ رود بہ باد یکسر کفِ خاکِ دردمنداں

میری خاک کسی کے کوچے سے بہت دور پڑی ہے
تھوڑی تھوڑی اے صبا ہر روز مدد کر
تیری بزمِ عیش سے پھری ہوئی قسمت مجھے لیے جاتی ہے
اگر خاک پر شراب کا جرعہ گرائے (تو) مجھے یاد کر

۴۳۷

دانتوں کے درد کے عذاب سے ہر کسی کے پہلو میں کہاں تک روؤں
نہ بزم میں کوئی چیز کھاتا ہوں، نہ شرم سے ہنس سکتا ہوں
میرا آئینہ مثال دل دیکھنے کے لائق تھا لیکن
یہ نہ ہوا کہ خود پسند گھڑی بھر کے لیے اسے اپنا چہرہ دکھاتے

۴۳۸

تاکہ سوزِ عشق اپنا رخ میری طرف کرے
شمع کی طرح آنسو بغیر رکے میرے چہرے پر بہہ رہے ہیں
جانِ عزیز کی طرح کا میرا ایک یوسف آہ گم ہو گیا ہے
اس کی راہ میں میری جستجو سے کچھ حاصل نہیں ہوا

۴۳۹

اگرچہ غیر (اسے) مجھے فراموش کرنا یاد دلاتا رہتا ہے
یار میرے چپ رہنے سے بولنے پر آمادہ ہو جائے گا
عید اچھی تقریب تھی لیکن صد حیف
تجھ سے میری ہم آغوشی دوسری عید پر چلی گئی

۴۴۰

اگر عشق کے تیر سے جان اس پر قربان ہو جائے
میرا استخواں اس کے پیکان کی کرسی[1] ہو جائے گا

۴۴۱

اس کی رہ سے اے صبا گزر کر لیکن اتنا نہیں
کہ ہوا کے ساتھ دردمندوں کی کفِ خاک تمام اڑی جاتی ہے

---

[1] تیر کے پھل کے پاس لگی ہوئی ہڈی یا کوئی اور سخت چیز جس کی مدد سے پھل مضبوطی کے ساتھ جما رہتا ہے۔

۴۴۲

چساں قصدِ رفتن کنم از درِ او
نہم پائے ایں سو، رود اشک آں سو
بہ دل داشتم چوں کماں زِہ نماید
جگر را ہدف سازم امّا جگر کو
تو پیماں گسلِ خط برآوردی و من
تجاوز نہ کردم ز پیماں سرِ مو
بہ قدغن نمایند قطع زبانش
کند ہر کہ مذکورِ جنّت در آں کو
بلائے سیاہے ست اے میرؔ ہر یک
چہ زلف و چہ کاکل چہ چشم و چہ ابرو

۴۴۳

کے بےاشارتِ نگہِ شوخ و شنگِ تو
شمشیر می کشد مژۂ پیش جنگِ تو
اے عشق ناخوش از تو فقط کوہکن نہ رفت
پائے چو او ہزار کس آمد بہ سنگِ تو
دستِ ستم بہ خونے کہ بردی فرو دگر
رنگیں بہ رنگِ پنجۂ گل گشت چنگِ تو
ایمائے ابروئے تو بہ ہر جائے کار کرد
گاہے نہ دیدہ ام دو کمانہ خدنگِ تو
شمشاد الف بہ پیشِ قدت می کشد بہ خاک
گل می شود عرق عرق از شرمِ رنگِ تو
طفل ای کہ از حلاوتِ تلخت خبر نہ ای
شہد است در مذاقِ عزیزاں شرنگِ تو

۴۴۲

جب اس کے در سے جانے کا قصد کرتا ہوں
ادھر پاؤں رکھتا ہوں، ادھر آنسو نکلنا شروع ہو جاتے ہیں
دل میں تھا کہ جب کمان کا چلّہ نظر آئے
جگر کو ہدف بناؤں مگر جگر کہاں
اے پیمان توڑنے والے تیرے خط نکل آئے اور میں نے
پیمان سے سرِ مو تجاوز نہیں کیا
حکم جاری کیا گیا ہے کہ اس کی زبان کاٹی جائے
جو بھی اس کوچے میں جنّت کا ذکر کرتا ہے
اے میرؔ ہر ایک بلائے سیاہ ہے
کیا زلف، کیا کاکل، کیا چشم، کیا ابرو

۴۴۳

کب تیری شوخ و شنگ نگاہ کے اشارے کے بغیر
تیری پیش جنگ[۱] مژہ شمشیر کھینچتی ہے
اے عشق تجھ سے فقط کوہکن (ہی) ناراض نہیں گیا
اس جیسے ہزاروں کا پیر تیرے پتھر کے نیچے آیا ہے
دستِ ستم پھر کس کے خوں میں ڈبویا ہے
پنجۂ گل کی طرح تیرا ہاتھ رنگین ہو گیا ہے
تیرے ابروؤں کے اشارے نے ہر جگہ کام کیا
کبھی میں نے تیرے تیر کو اچٹتے ہوئے نہیں دیکھا
شمشاد تیری قامت کے سامنے خاک پر الف کھینچتا ہے
گل تیرے رنگ سے خجل ہو کر عرق عرق ہو جاتا ہے
تو لڑکا ہے تجھے اپنی تلخی کی حلاوت کی خبر نہیں ہے
دوستوں کے لیے ذائقے میں تیرا کڑوا پھل شہد (کی طرح) ہے

---

[۱] میدان جنگ میں لڑنے کے لیے سب سے پہلے نکلنے والی۔

تا کے سخن ز سبزۂ خطِ بتاں کنی
شعر است میرؔ ایں کہ خیالاتِ بنگِ تو

۴۴۴

بہ آنے دل ز صدہا می بری تو
بلا ای، فتنہ ای، جادوگری تو
بہ خوبانِ گلستانت چہ نسبت
ز گل صد پیرہن نازک تری تو
بہ ہر گام ایں بیاباں گریہ می خواست
گذشتی ہم چو صرصر سرسری تو
بہ ایں خوش صورتی آدم نہ دیدم
گرو بردی بہ خوبی از پری تو
بود لافش دروغِ بےفروغے
ز مہ صدشہر نورانی تری تو
ز چشمم رفتہ خوں سیلاب سیلاب
چہ دور از خونِ من گر بگذری تو
خیالِ کعبہ و دیرت ہماں است
دلا از مدّتے بر ہر دری تو
اگر برہم شود سودا عجب نیست
متاعِ من دل است و مشتری تو
جوابِ ایں جفا و جور و بیداد
چہ خواہی گفت روزِ داوری تو
کمانت میرؔ نتوانم کشیدن
بہ ایں قدِ دوتا زورآوری تو

کب تک محبوبوں کے سبزۂ خط کی بات کرے گا
میرؔ یہ شعر ہے یا تیرے خیالاتِ بنگ[1] (ہیں)

۴۴۴

ہر آن تو سینکڑوں کا دل چرا لیتا ہے
تو بلا ہے، فتنہ ہے، جادوگر ہے
گلستان کے خوباں سے تجھ کو کیا نسبت
تو گل سے صد پیرہن نازک تر ہے
اس بیاباں میں ہر قدم پر گریہ (کرنا) چاہیے
تو صرصر کی طرح سرسری گزر گیا
میں نے اس خوب صورتی کو آدمی میں نہیں دیکھا
حسن سے تو نے پری کو گروی رکھ لیا
چاند کا دعویٰ بے فروغ[2] جھوٹ تھا
تو اس سے صد شہر زیادہ منوّر ہے
میری آنکھ سے خوں سیلاب سیلاب نکلا
کیا دُور ہے اگر تو میرے خون کو معاف کردے
تیرا دیر و کعبہ کا خیال ویسا ہی (پریشان) ہے
اے دل مدّت سے تو ہر در پر ہے
اگر سودا بگڑ جائے تو تعجب نہیں ہے
میری متاعِ دل ہے اور خریدار تو ہے
اس جفا اور جور اور بیداد کے جواب میں
قیامت کے دن تو کیا کہے گا
میرؔ میں تیرا مقابلہ نہیں کرسکتا
اس دوہرے قد کے ساتھ تو زور آور ہے

---

[1] اوٹ پٹانگ خیالات، جیسے بھنگ کے نشے میں پیدا ہوتے ہیں۔
[2] بے روشنی۔

۴۴۵

هرگز ز من نیامده ترکِ ہوائے او
آخر شدم بہ خاک برابر برائے او
غافل مشو ز قافلۂ عمرِ رفتنی
کم می رسد بہ گوش صدائے درائے او
دردے ست دردِ عشق کہ جز مرگ در جہاں
ہرگز نہ یافتند مناسب دوائے او
چوں مو ضعیف گشتنم افشائے راز کرد
بر سر شکست کاسہ مرا از جفائے او
ہر مظہرے کہ می نگرم عینِ ظاہر است
ہرگز نیامدم بہ نظر ماسوائے او
رہ می رود چناں کہ بہ ہر گام می شود
بیدار خونِ خفتہ ز آوازِ پائے او
کے پیشِ منعمانِ جہاں می شود دراز
بالینِ زیرِ سر شدہ دستِ گدائے او
داغ ام ز اختلاطِ پریشانِ جلوہ اش
نبود دلے کہ نیست در او گرم جائے او
دیدم کہ رفتہ رفتہ بہ بستر فتاد و مرد
میرؔ آں کہ تکیہ کرد بہ عہدِ وفائے او

۴۴۶

دہد دادِ شستِ تو نخچیرِ تو
کہ برداشت رنگ از دلش تیرِ تو
من اے گریہ چشم از تو می داشتم
نہ دیدم دلے ہیچ تاثیرِ تو

۴۴۵

ہرگز مجھے اس کی آرزو کو ترک کرنا نہیں آیا
آخرکار اس کے لیے میں خاک کے برابر ہو گیا
گزرتی ہوئی عمر کے قافلے سے غافل مت رہ
کانوں تک اس کی جرس کی صدا کم (ہی) پہنچتی ہے
دردِ عشق وہ درد ہے کہ موت کے سوا دنیا میں
ہرگز اس کی مناسب دوا نہیں پاتے
میرے بال کی طرح کمزور ہو جانے نے افشائے راز کر دیا
اس کی جفا نے مجھے رسوا کر دیا
ہر مظہر کہ میں دیکھتا ہوں، عین ظاہر ہے
میری نظر میں اس کے سوا ہرگز کوئی اور نہیں آیا
اس طرح راستہ چلتا ہے کہ ہر قدم پر
خونِ خفتہ[1] اس کی آوازِ پا سے بیدار ہوتا جاتا ہے
کب دنیا کے منعموں کے سامنے پھیل سکتا ہے
اس کے گدا کا سر کے نیچے بالیں بنا ہوا ہاتھ
اس کے جلوے کے ہر ایک کے سامنے آنے سے رنجیدہ ہوں
کوئی دل نہیں ہوگا کہ جس میں وہ جاگزیں نہیں ہے
میں نے دیکھا کہ رفتہ رفتہ بستر پر پڑا اور مر گیا
میرؔ جس نے کہ اس کے عہدِ وفا پر تکیہ کیا

۴۴۶

تیرا شکار تیرے نشانے کی داد دیتا ہے
کہ اس کے دل سے خون تیرے تیر نے اڑا دیا
میں اے گریہ تجھ سے امید رکھتا تھا
مگر تیری کوئی تاثیر نہیں دیکھی

---

[1] وہ مقتول جس کے قتل کا بدلہ نہ لیا گیا ہو۔

بہ صد رنگ گل جلوہ گر شد ولے
مرا در نظر بود تصویرِ تو
من از طورِ خود کشتہ گردیدہ ام
بہ خوں ریزِ من نیست تقصیرِ تو
کدامیں جراحت جراحت نہ شد
مگر زہر بود آبِ شمشیرِ تو
بہ حدّے خراب ای تو اے شہرِ دل
کہ مقدورِ من نیست تعمیرِ تو
بہ خوف ام ز شورِ مزاجِ تو میرؔ
مبادا شود پارہ زنجیرِ تو

۴۴۷

ہر گز نمی شود کہ نیایم بہ سوئے تو
یا چشمِ من ز شوق نیفتد بہ روئے تو
از کار رفتنِ دلِ من نیست بےسبب
می آیدم ز ہر گلِ ایں باغ بوئے تو
طوفم نہ داد دست و ز عمرےست در برم
از خاکِ راہ جامۂ احرامِ کوئے تو
گر در بغل بہ کام من آئی چہ می شود
دارم دلے کہ خوں شدہ در آرزوئے تو
پیدا نہ گشت ہر کہ قدم در رہت گذاشت
تنہا نہ میرؔ گم شدہ در جستجوئے تو

۴۴۸

ناصح جنوں زیادہ شد آخر ز پندِ تو
نفعے نہ کرد داروئے ناسودمندِ تو

گل سو رنگ سے جلوہ گر ہوا، لیکن
میری نظر میں تیری تصویر تھی
میں اپنے طور کی وجہ سے مارا گیا ہوں
میرے خون میں تیرا قصور نہیں ہے
کون تھا جو زخم زخم نہیں تھا
شاید تیری شمشیر کی آب زہر تھی
اے شہرِ دل تو اس حد تک اجڑ گیا ہے
کہ مجھے تیری تعمیر کا مقدور نہیں رہا
تیرے مزاج کے شور[1] سے میرؔ مجھے خوف ہے
کہ کہیں تیری زنجیر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے

۴۴۷

ہرگز کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تیری طرف نہ آؤں
یا میری آنکھ محبت کے ساتھ تیرے چہرے پر نہیں پڑے
میرے دل کا بے خود ہو جانا بے سبب نہیں ہے
مجھے اس باغ کے ہر گل سے تیری بو آ رہی ہے
طواف کا موقع نہیں ملا اور مدت سے میرے جسم پر ہے
تیرے کوچے کی خاکِ راہ کا جامۂ احرام
(اب) اگر آغوش میں میری مراد پر آیا تو کیا
وہ دل رکھتا ہوں جو تیری آرزو میں خون ہو چکا ہے
جس نے بھی تیری راہ میں قدم رکھا (پھر) نظر نہیں آیا
تنہا میرؔ ہی تیری جستجو میں گم نہیں ہوا ہے

۴۴۸

ناصح آخر تیری نصیحتوں سے جنوں بڑھ گیا
تیری ناموافق دوا سے فائدہ نہیں ہوا

---

[1] غصے۔

در کشت و خونِ اہلِ نظر اے زباں دراز
کوتاہی اے نہ کرد نگاہِ کشندِ تو
خوش قامتے چو یار بہ بر تنگ می کشی
اے جامہ رشک ہاست بہ بختِ بلندِ تو
زنہار از نزولِ ملائک رضا نئیم
بر خاکِ من بس است گذارِ سمندِ تو
دل جمع کردہ ام ز رہائی خویشتن
کافتادہ ام بسانِ گرہ در کمندِ تو
دشوار مردنم اگر آساں شمردہ ای
افسوس از طبیعتِ مشکل پسندِ تو
شاید کہ میرؔ محنتِ بےحد کشیدہ ای
خوں می تراود از سخنِ دردمندِ تو

۴۴۹

اے عمرِ برق جلوہ دلِ من فدائے تو
گرم از برم گذشتی و گرم است جائے تو
یک رہ نقاب برفگن اے مایۂ حیات
در فکرِ مردن است جہانے برائے تو
اکنوں بداں سرام کہ بمیرم بہ ذوق اگر
دستم دہد گذاشتنِ سر بہ پائے تو
زنہار من بہ باغ نمی بستم آشیاں
معلوم کردمے اگر اے گل وفائے تو
ہر کس کہ دید طورِ تو با من بہ طنز گفت
گر میرؔ آشنائے تو ایں است، وائے تو

اہلِ نظر کے کشت وخوں میں اے زباں دراز
تیری قاتل نگاہ نے کوئی کوتاہی نہیں کی
یار کی طرح خوش قامت کو آغوش میں تنگ کھینچتا ہے
اے پیراہن تیرے بلند بخت پر رشک ہے
کبھی بھی فرشتوں کے اترنے سے خوش نہیں ہوں
میری خاک پر تیرے سمند[1] کا گزرنا کافی ہے
میں اپنی رہائی سے (مایوس ہو کر) بے فکر ہو چکا ہوں
کہ گرہ کی طرح تیری کمند میں پھنسا ہوں
اگر میرے دشوار مرنے کو تو نے آسان شمار کیا ہے
تیری مشکل پسند طبیعت پر افسوس ہے
شاید کہ میرؔ تو نے بے حد تکلیف اٹھائی ہے
تیری غمگین باتوں سے خون ٹپک رہا ہے

۴۴۹

اے برق جلوہ عمر میرا دل تجھ پر فدا
(تو) میری آغوش سے تیزی سے چلی گئی اور تیری جگہ گرم ہے
ایک بار نقاب الٹ دے اے سرمایۂ حیات
دنیا تیرے لیے مرنے کی فکر میں ہے
اب اس ہوس میں ہوں کہ اگر عشق میں جان دوں
مجھے تیرے قدموں پر سر نثار کرنا نصیب ہو
میں کبھی باغ میں آشیاں نہ باندھتا
اگر اے گل مجھے تیری وفا معلوم ہوتی
جس نے بھی تیرا طور دیکھا مجھ سے طنز سے کہا
میرؔ تیرا آشنا اگر یہ ہے (تو) وائے تو

---

[1] گھوڑے۔

۴۵۰

خوش است آں گوہر و خوش آبیِ او
ولے خوں شد دل از نایابیِ او
تر آمد مہ چو از برقع برآمد
شباں گہ، چہرۂ مہتابیِ او
بہ دل می چسپدم بسیار امسال
فضائے دشت و خوش سیلابیِ او
غمِ بے انتہائے دیشبِ من
شد آخر باعثِ بے خوابیِ او
چہ گویم آہ از دریائے ہستی
کہ آتش زد بہ دل کم آبیِ او
جگر خوں کرد لعلِ بے بہا را
ز خوش رنگی لبِ عنابیِ او
مپرس از جانِ صاحب مُردۂ من
چہ ہا می بینم از بے تابیِ او
فریب است اتقائے شیخ، دریاب
تہِ سجادۂ محرابیِ او
نہ دارد میرؔ غیر از آفتابے
ہمہ داغ ام ز بے اسبابیِ او

۴۵۱

مے در عرق افتادہ است از نرگسِ شہلائے تو
گل برگ سرخ و زرد شد از خوبیِ لب ہائے تو
اے گردِ سر گردم ترا بسیار می چسپی بہ دل
صد داغ دارد سینہ ام از خوبیِ ہرجائے تو
تا قدِ ناز افراشتی، ہرگز نیامد آفتے
دارد مگر در دل بلا اندیشہ از بالائے تو

۴۵۰

وہ گہرا اچھا ہے اور اس کی چمک (بھی)
لیکن دل خون ہو گیا اس کے نہ ملنے سے
چاند شرمندہ ہو گیا جب برقع سے باہر کھلا
رات کو اس کا مہتابی چہرہ
اس سال میرے دل سے بہت لپٹ رہی ہے
دشت کی فضا اور اس کی خوش سیلابی
میری کل رات کا بے انتہا غم
آخر اس کی بے خوابی کا باعث ہو گیا
دریائے ہستی کا کیا کہیں
کہ دل میں اس کی کم آبی نے آگ لگا دی
لعلِ بے بہا کا جگر خون کر دیا
اس کے عنابی ہونٹوں نے (اپنی) خوش رنگی سے
میری (اس) جان کے بارے میں جس کا مالک مر چکا ہے، مت پوچھو
میں اس کی بے تابی (کی وجہ) سے کیا کیا دیکھتا ہوں
شیخ کے اتقا کا فریب پہچان لے
اس کے محرابی سجادہ کے نیچے
میرؔ ایک آفتاب کے سوا کچھ نہیں رکھتا
اس کی بے سرو سامانی سے تمام داغ ہوں

۴۵۱

تیری نرگس شہلا سے شراب پانی پانی ہو گئی
تیرے لبوں کی خوبصورتی کے آگے پھول کی پنکھڑی شرمندہ ہو گئی
تیرے سر کے پھیرے لیتا ہوں (تو) دل میں بہت زیادہ ٹھہرتا ہے
تیرے (سراپا میں) ہر جگہ کی خوبی سے میرا سینہ سو داغ رکھتا ہے
جب تک تو قدِ ناز کے ساتھ نہیں کھڑا ہوتا، ہرگز کوئی آفت نہیں آتی
مگر تیری قامت کا خیال دل کے لیے بلا ہو جاتا ہے

افتادہ خلقے بر درت غوغا اگر سر می کشد
یک روز خوں خواہد شدن بر خاکِ زیرِ پائے تو
یک چند ترکِ عشق کن بسیار لاغر گشتہ ای
اے میر نصفے ہم نہ ماند از جسمِ غم فرسائے تو

۴۵۲

در دمے صد بار خوں گریند بیمارانِ تو
قابلِ سیراند ظالم زرد رخسارانِ تو
با الم دست و بغل رفتند آخر زیرِ خاک
بہ نہ شد زخمِ نمک بندِ دل افگارانِ تو
من نمی گفتم کہ با ایں بےتہاں صحبت مدار
عاقبت مے خوردنت ظاہر شد از یارانِ تو
چشم را نکشودی از ناز ارنہ اے مغرورِ حسن
دیدنی بودند مردم در گرفتارانِ تو
بر مزارِ میرؔ شب رفتم، عجائب جلوہ داشت
ایں جواں شاید کہ بود از نازبردارانِ تو

۴۵۳

یارب چہ روز بود کہ دل گشت یارِ او
تا زندگی دگر نہ شدم من دُچارِ او
در عینِ جوشِ داغِ جگر رفتم از جہاں
باغے رساند عشق و نہ دیدم بہارِ او
شمشیرِ جورِ یار نہ دانم چہ ذوق داشت
ہرگز نہ شد بہ زخم تسلّی شکارِ او
شد بعدِ خاک گشتنِ مجنوں چو گردباد
آوارہ گردِ بادیہ مشتِ غبارِ او
چشمم چو نقشِ پا بہ سفیدی رسیدہ است
گردے سرے نمی کشد از رہگذارِ او

تیرے در پر پڑی ہوئی خلقت اگر شور کرنا شروع کرے
ایک روز تیرے پاؤں کے نیچے کی خاک کے لیے خوں ریزی ہو جائے گی
کچھ دن عشق کرنا چھوڑ، بہت زیادہ لاغر ہو گیا ہے
اے میرؔ تیرا غم جھیلنے والا بدن آدھا بھی نہیں رہ گیا

۴۵۲

ایک پل میں سو بار تیرے بیمار خون روتے ہیں
ظالم تیرے زرد رخسار والے دیکھنے کے قابل ہیں
الم کے ساتھ ہم آغوش ہو کر آخر خاک میں چلے گئے
تیرے دل افگاروں کے نمک بند[1] زخم اچھے نہ ہوئے
میں نے نہیں کہا تھا ان کم ظرفوں سے نہ ملا کر
آخر تیرا شراب پینا تیرے (ان) یاروں (کی وجہ) سے ظاہر ہو گیا
(تو نے) ناز سے آنکھ نہیں کھولی ورنہ اے حسن پر مغرور
تیرے گرفتاروں میں دیکھنے کے لائق لوگ تھے
رات میرؔ کے مزار پر گیا، عجیب جلوہ تھا
یہ جوان کہ شاید تیرے ناز برداروں میں سے تھا

۴۵۳

یارب کون سا دن تھا کہ دل اس یار کا بنا
(میں) ساری زندگی دوسری بار اس سے نہیں ملا
میں عین داغِ جگر کے جوش میں دنیا سے چلا گیا
عشق نے ایک باغ بہم پہنچایا اور میں نے اس کی بہار نہیں دیکھی
یار کے ظلم کی شمشیر نہیں جانتا کیا چاشنی رکھتی ہے
اس کا شکار زخم سے کبھی مطمئن نہیں ہوا
مجنوں کے خاک ہو جانے کے بعد گردباد کی طرح
اس کی مشتِ غبار صحرا میں آوارہ گرد ہو گئی
میری آنکھیں نقشِ پا کی طرح سفیدی کو پہنچ چکی ہیں
(مگر) اس کی رہگزار سے گرد بلند نہیں ہوتی

---

[1] وہ زخم جس کو خون روکنے کے لیے نمک چھڑک کر باندھ دیا جائے۔

نتواں بہ پائے آبلہ رفتن بہ دشتِ شوق
کز شیشہ ریزہ شوخ تر افتادہ خارِ او
بر خاکِ میرؔ صبح گذارم فتادہ بود
ہنگامہ شد ز شورِ ملک بر مزارِ او

۴۵۴

ہمیں شکستنِ دل نیست کارِ الفتِ او
ہزار خانہ خرابی ست در محبّتِ او
اگر قمر کندت روکشی، سیہ بخت است
ور آفتاب شود چہرہ با تو، شامتِ او
ز فرطِ شوق چہ سختی کہ کوہکن نہ کشید
ولے دریغ کہ برباد رفت محنتِ او
نگارِ من بہ چمن رفتہ با کہ بنشیند
گلِ شگفتہ نہ دارد دہانِ صحبتِ او
بہ باغ پیشتر از آفتاب می آئی
اگر بہ صبحِ چمن مائل ای، سعادتِ او
ز بس کہ بر سرِ تابوتِ میرؔ کثرت شد
نہ داد دست کسے را نمازِ میّتِ او

۴۵۵

تا چند سر بہ سنگ زند کس ز قہرِ تو
مفتے زدہ ست آں کہ بدر زد ز شہرِ تو
جاں داد میرؔ و زندگیِ جاوداں بیافت
اے وائے بر کساں کہ نہ مردند بہرِ تو

۴۵۶

صبح برخیز و پئے بادہ گدایانہ برو
شئ للہ زناں بر درِ مے خانہ برو

پیروں میں آبلوں (کی وجہ) سے دشتِ شوق میں نہیں چل سکتے
کہ شیشہ کے ٹکروں سے زیادہ تیز اس کے کانٹے بکھرے ہیں
میرؔ کی خاک پر سے صبح میرا گزرنا ہوا تھا
فرشتوں کے شور سے اس کے مزار پر ہنگامہ تھا

۴۵۴

(صرف) یہی دل کا توڑنا اس کی محبت کا کام نہیں
اس کی محبت میں ہزار خانہ خرابی ہے
اگر چاند تیرے مقابل آتا ہے، سیہ بخت ہے
اور اگر سورج تیری طرف رخ کرتا ہے، اس کی شامت (ہے)
کوہکن نے فرطِ شوق میں کیا سختی نہیں کھینچی
لیکن افسوس اس کی محنت برباد گئی
میرا محبوب چمن میں جا کر کس کے ساتھ بیٹھے
کھلا ہوا پھول اس کی صحبت کے لائق منہ نہیں رکھتا
تو باغ میں آفتاب سے پہلے آجاتا ہے
اگر تو صبحِ چمن پر مائل ہے، اس کی خوش قسمتی ہے
نہایت میرؔ کے تابوت کے اوپر کثرت تھی
بہتوں کو اس کی میت کی نماز حاصل نہیں ہوئی

۴۵۵

تیرے قہر سے کب تک کوئی سر پتھر سے ٹکرائے
جسے تیرے شہر سے نکال دیا گیا، اسے مفت میں نجات مل گئی
میرؔ نے جان دی اور زندگیٔ جاوید پائی
ان پر افسوس ہے جو تیرے لیے نہیں مرے

۴۵۶

صبح اٹھ اور شراب کے لیے گدایانہ نکل
شیٔ للہ پکارتے ہوئے درِ مے خانہ پر جا

یا منہ پاے بہ میدانِ محبّت یا میرؔ
ترکِ سر گیر و در آں معرکہ مردانہ برو

۴۵۷

رہ در جہاں فتاد چو با جانِ سوختہ
دیدیم تند باد و بیابانِ سوختہ
عشقے ز سینہ سوختگانِ وفا بگو
گر برخوری صبا بہ جوانانِ سوختہ
گرمِ تلاشِ صحبتِ آسودہ اے مباش
دستے بزن بہ گوشۂ دامانِ سوختہ
داغ ایں چنیں ز منتِ دوناں نمی شدیم
می ساختیم گر بہ لبِ نانِ سوختہ
اے بادِ صبح گہ شررم در کنار ریز
شائستہ نیست گل بہ گریبانِ سوختہ
حالے از آں عمارتِ خوش طرحِ دل مپرس
افتادہ اند یک دو سہ ایوانِ سوختہ
از شعرِ میرؔ دوش بہ جاں آتشم فتاد
بود آں عزیز طرفہ سخن دانِ سوختہ

۴۵۸

یک دست سبزۂ تر از خاکِ من دمیدہ
وقت است اگر بیاید آں آہوئے رمیدہ
بارے فراقِ خوباں گذراندہ شد بہ خوبی
کس ایں چنیں بلا را ایں گونہ بر نہ چیدہ
ہر گام چشمِ عاشق پنہاں بہ زیرِ خاک است
در کوئے خویش پا را بگذار دیدہ دیدہ
آزاد سبز بختے کاو در بنِ درختے
دامن بہ روکشیدہ چوں سایہ واکشیدہ

یا محبت کے میدان میں قدم نہ رکھ میرؔ یا
سر ترک کر اور اس معرکہ میں مردانہ وار جا

۴۵۷

(اس) جانِ سوختہ کے ساتھ جب جہاں میں (ہم) اپنی راہ گئے
ہم نے تند ہوا اور جلا ہوا بیاباں دیکھا
سینہ سوختگانِ وفا کی طرف سے مرحبا کہنا
اے صبا اگر سوختہ جوانوں سے ملاقات ہو
کسی آسودہ کی دوستی کی تلاش میں مصروف مت رہ
کسی جلے ہوئے کے دامن کے گوشہ کو کھینچ
(ہم) کم ظرفوں کا احسان (اٹھا کر) اتنے رنجیدہ نہیں ہوتے
اگر جلی ہوئی روٹی کے ٹکرے پر گذارا کر لیتے
اے صبح کی ہوا میرے دامن میں چنگاریاں ڈال
جلے ہوئے گریبان میں پھول مناسب نہیں ہوتے
اب دل کی اس خوش نما عمارت کا مت پوچھ
دو تین جلے ہوئے ایوان گر چکے ہیں
کل میرؔ کے شعر سے جان میں آگ لگ گئی
وہ عزیز طرفہ سوختہ شاعر تھا

۴۵۸

بالشت بھر سبزۂ تر میری خاک سے اُگا ہے
(مناسب) وقت ہے اگر وہ آہوئے رمیدہ آ جائے
بارے خوباں کا فراق اچھی طرح گزر گیا ہے
کسی نے اس مصیبت کو اس طرح نہیں جھیلا تھا
ہر گام پر کسی عاشق کی آنکھ خاک کے نیچے چھپی ہے
اپنے کوچے میں قدم دیکھ دیکھ کے رکھ
وہ آزاد خوش نصیب (ہے) کہ جس نے درخت کے نیچے
دامن منھ پر تانا اور سائے کی طرح لیٹ گیا

در قتل گاه از دل آواز بر نیامد
شاید ز تیغِ جورش زخمِ رسا رسیده
پروانه دوش خود را در بزم زد بر آتش
لیکن نہ گفت چیزے شمعِ زباں بریدہ
ہرگز نہ شد درایں عہد تغییر حالتِ او
بودہ ست میرؔ آخر مردِ زمانہ دیدہ

۴۵۹

شد گوش زد طور توام از رہ بہ بزمت بردۂ
رنجش ز من فہمیدہ کن، دارم دلِ آزردۂ
خواہم دلے پیدا کنم کفرآشنا، دیں دشمنے
از کعبہ سر پیچیدۂ، با دیر رو آوردۂ
اے شیخ با پیرِ مغاں یک لحظہ صحبت گرم کن
تا چند تنہا زیستن با خاطرِ افسردۂ
بس آزمائش کردہ ام، پُر ایں قضایا دیدہ ام
در یک نفس جاں می دہد بر دل جراحت خوردۂ
از میرؔ واقف نیستم لیکن چو شب می آمدم
دیدم جوانِ تازۂ در رہ بہ حسرت مردۂ

۴۶۰

مرا دلے ست بہ بر چاک چاک چوں شانہ
ز اختلاطِ پریشانِ زلفِ جانانہ
بہ ہر دو گام بود در رہِ غمش ما را
بہ دیدہ اشک و بہ لب نالۂ غریبانہ
بہ بزمِ عیشِ جہاں صبح گہ بیا و ببیں
کہ شمعِ دودے و خاکسترے ست پروانہ
دے کہ نالہ کشم عندلیب دم درکش
کہ دم کشی نہ توانی بہ ایں چک و چانہ

قتل گاہ میں دل سے آواز باہر نہیں نکلی
شاید تیری ظلم کی تیغ سے زخم کامل لگا
بزم میں پروانے نے کل خود کو آگ میں جلا دیا
پھر بھی زبان کٹی ہوئی شمع نے ایک حرف نہیں کہا
اس عہد میں اس کی حالت میں بالکل تغیر نہیں تھا
میرؔ آخر زمانہ دیدہ شخص تھا

۴۵۹

تیری بزم میں راہ پانے سے تیرے اطوار میرے سننے میں آ گئے
مجھ سے رنجش سمجھ کر کہ دکھا ہوا دل رکھتا ہوں
چاہتا ہوں ایک دل بناؤں، کفر آشنا، دین دشمن
کعبہ سے منحرف، بت کدے کی طرف سر جھکائے ہوئے
اے شیخ پیرِ مغاں کے ساتھ ایک لحظہ صحبت گرم کر
کب تک افسردہ دل کے ساتھ تنہا زندہ رہنا
بہت آزما چکا ہوں، ایسے بہت سے جھگڑے دیکھے ہیں
دل پر زخم کھایا ہوا ایک نفس میں جان دیتا ہے
میرؔ سے واقف نہیں ہوں لیکن رات کو جب آ رہا تھا
راستے میں حسرت سے مرے ہوئے ایک نوجوان کو دیکھا تھا

۴۶۰

میرے پہلو میں کنگھی کی طرح چاک چاک دل ہے
زلف جانانہ سے اختلاطِ پریشاں کی وجہ سے
ہر دو گام پر اس کے غم کی راہ میں ہماری
آنکھوں میں آنسو (ہیں) اور ہونٹوں پر غریبانہ فریاد (ہے)
جہاں کی بزمِ عیش میں صبح کے وقت جا اور دیکھ
کہ شمع دھواں اور پروانہ خاکستر ہے
جب (میں) نالہ کھینچوں، عندلیب (تو) چپ رہا کر
کہ (تو اپنی) اس استعداد کے ساتھ (میری) ہم نوائی نہیں کر سکتی

نہ تابد از سحر آں آفتابِ طالعِ من
کہ چشم دوختہ ام من بہ روزنِ خانہ
برید کشتۂ ما را و دوستاں ببینید
کہ او ہم از غمِ ما رنجہ می شود یا نہ
چہ گویم آہ کہ احوالِ ما نمی گیرد
در ایں دیار کس از آشنا و بیگانہ
بہ ایں خروش کہ داریم شہر تنگی کرد
نہادہ ایم چو سیلاب سر بہ ویرانہ
بہ سیر لالہ و گل می برد بسر عمرے
مگر کہ میرؔ بود سیّد گلستانہ

۴۶۱

اے کہ می پرسی کہ ای، ہستم سپاہی زادۂ
زخم بر دل خوردہ اے، در خاک و خوں افتادۂ
باز گشت خود نمی بینم بہ روزِ حشر ہم
رفتہ ام از خویش بر طرزِ خرامِ سادۂ
ایں نہ دانم کیست لیکن بر سرِ رہ دیدہ ام
دست از جاں شستۂ، آزردۂ، دل دادۂ
یادگارِ شیخ بسیار است در مےخانہ ہا
جبہ اے، پیراہنے، عمامہ اے، سجّادۂ
میرؔ با اہلِ جہاں ربطے نہ دارد مطلقاً
کے فرود آید سرش، مردے ست او آزادۂ

۴۶۲

نگاہش آں چناں بےخود ز بادہ
کہ تا بر من فتد صد جا فتادہ
تبسم گونۂ آں لالہ رخسار
درِ فردوس بر روہا کشادہ

صبح سے میری قسمت کا وہ آفتاب نہیں جگمگاتا
کہ میں نے گھر کے روزن سے آنکھ جمار کھی ہے
میری نعش لے آؤ اور دوست دیکھ لیں
کہ وہ بھی میرے غم میں اداس ہوتا ہے یا نہیں
آہ کیا کہیں کہ ہمارا حال نہیں پوچھتا
اس شہر میں کوئی کسی آشنا اور بیگانے سے
اس شوروغل سے جو ہم کیا کرتے تھے شہر پریشان ہو گیا تھا
سیلاب کی طرح (ہم نے) سرویرانے میں چھپا دیا ہے
(اپنی) زندگی لالہ وگل کی سیر میں بسر کر رہا ہے
شاید میرؔ گلستانہ کا سیّد ہے

۴۶۱

اے جو پوچھ رہا کہ تو کون ہے، سپاہی زادہ ہوں
دل پر زخم کھائے ہوئے، خاک وخوں میں پڑا ہوا
حشر کے دن بھی اپنا پھر کر آنا نہیں دیکھتا
ایک سادہ کے طرزِ خرام پر خود سے گزر کیا ہوا ہوں
یہ نہیں جانتا کون ہے لیکن سرِ راہ دیکھا ہے
جان سے ہاتھ دھوئے ہوئے، ایک غم زدہ عاشق کو
مے خانوں میں شیخ کی بہت نشانیاں ہیں
جبہ، پیراہن، عمامہ، سجادہ
میرؔ اہلِ جہاں سے مطلقاً ربط نہیں رکھتا
وہ آزاد مرد ہے اس کا سر کہاں جھک سکتا ہے

۴۶۲

اس کی نگاہیں شراب سے ایسی بے خود
کہ جب تک مجھ پر پڑیں سو جگہ پڑیں
اس لالہ رخسار کے تبسم نے
بہتوں کے سامنے درِ فردوس کشادہ (کردیا)

مپرس از طرزِ رفتارش کہ ہر گام
ز وضعِ خود قدم بیروں نہادہ
تہِ نیرنگِ او مشکل تواں یافت
کہ در ہر جا بہ صد رنگ ایستادہ
سمندِ ناز از نرمیِ رانش
عنانِ اختیار از دست دادہ
شکایت نامۂ دوری رہ بود
نہ فہمیدی خطِ پیچان جادہ
ترا اے گل بہ روئے او چہ نسبت
مگو حرف از دہانِ خود زیادہ
بدیں ساں میرؔ چوں خواہی بسر کرد
کہ او بسیار پرُکار و تو سادہ

۴۶۳

یک بار ایں کہ ترکِ ملاقات کردۂ
از من چہ دیدہ ای و چہ اثبات کردۂ
بر جانِ من ز وعدہ خلافیؔ متصل
نومیدی و امیدِ مساوات کردۂ
در ہر کسے کہ می نگرم مست و بےخود است
عالم بہ یک نگاہ خرابات کردۂ
می خواستم پیالہ دلِ شب چو آفتاب
اے پیرِ مےفروش کرامات کردۂ
شب ہا بہ گریہ داشتہ ای تا سحر مرا
روزے اگر سلوک و مدارات کردۂ
زاہد فتد بہ دستِ کہ تا گوہرِ مراد
من گریہ کردہ ام، تو مناجات کردۂ

اس کے طرزِ رفتار کی نہ پوچھ کہ ہر گام
اپنی وضع سے قدم باہر رکھے ہوئے (ہے)
اس کی اصلیّت دریافت کرنا مشکل ہے
کہ ہر جگہ سو رنگ میں موجود ہے
اس کی رانوں کی نرمی سے (اس کا) سمندِ ناز
عنانِ اختیار ہاتھ سے چھوڑے ہوئے (ہے)
راستے کی مشکل کا شکایت نامہ تھا
تو خطِ پیچان جادہ نہیں سمجھا
تجھے اے گل اس کے چہرے سے کیا نسبت
اپنے منھ سے بڑی بات مت کر
اس طرح میرؔ کیوں کر بسر کرے گا
کہ وہ بہت پرکار اور تو سادہ

۴۶۳

یہ کیا کہ اچانک تو نے ملاقات ترک کردی ہے
تو نے مجھ سے (ایسا) کیا دیکھا ہے اور کیا یقین کرلیا ہے
(تو نے) میری جان پر مسلسل وعدہ خلافی کر کے
ناامیدی اور امید (کے احساس) کو مساوی کردیا ہے
جس کسی کو بھی میں دیکھتا ہوں مست اور بے خود ہے
تو نے دنیا کو ایک نگاہ سے شراب خانہ بنادیا ہے
میں نے آدھی رات میں آفتاب جیسا پیالہ چاہا تھا
اے پیرِ مے فروش تُو نے (تو) کرامات کردی
راتوں کو تو نے صبح تک مجھے رلائے رکھا ہے
ایک روز اگر سلوک اور مدارات کی ہے
زاہد گوہرِ مراد کس کے ہاتھ آتا ہے
میں نے گریہ کیا، تو نے مناجات کی ہے

شعرے نہ شد شنیدہ در ایں مدّت از تو میرؔ
معلوم شد کہ ترکِ خیالات کردۂ

۴۶۴

جرمم چہ بود کایں ہمہ بدخواہ بودۂ
تا خوں بہ ایں ستم زدہ ہمراہ بودۂ
جاے نمی رسی کہ از آں جا نمی روی
غافل تمام عمر تو در راہ بودۂ
رفتی ز سبزہ زارِ جہاں آں چناں کہ میرؔ
پیدا نہ ای مگر تو پرِ کاہ بودۂ

۴۶۵

می نمایم گریۂ بےاختیارے گاہ گاہ
می دہم تسکینِ جانِ بےقرارے گاہ گاہ
خواہشِ لطفِ تو کردن بےفضولی نیست لیک
گر نہ باشد اکثرِ اوقات، بارے گاہ گاہ
آگہہ از مجنوں نیَم لیک ایں قدر دانم کہ میرؔ
می کند گردے از ایں صحرا غبارے گاہ گاہ

۴۶۶

در رہت آہ داغ ہا دیدہ
دل کبابِ گذشتہ گردیدہ
چہ قدرہا پسند می آید
از بتاں طورِ ناپسندیدہ
حیف در شہرِ خوب رویاں میرؔ
کس زبانِ مرا نہ فہمیدہ

اس مدت میں میرؔ تجھ سے ایک شعر نہیں سنا ہے
معلوم ہوا کہ تو نے فکرِ سخن ترک کر دی ہے

۴۶۴

میرا کیا جرم تھا کہ (تو) اتنا بدخواہ ہو گیا
(میرے) قتل ہونے تک مجھ ستم زدہ کے ہمراہ ہو گیا
کسی جگہ نہیں پہنچتا کہ اس جگہ سے چلا نہیں جاتا
غافل تمام عمر تو راستے میں ہے
دنیا کہ سبزہ زار سے میرؔ تو اس طرح چلا گیا کہ
تیرا نشان نہیں ہے شاید تو پر کاہ[۱] تھا

۴۶۵

میں گریۂ بے اختیار گاہ گاہ کرتا ہوں
جانِ بے قرار کو گاہ گاہ تسکین دیتا ہوں
تیرے لطف کی خواہش کرنا بے فضولی نہیں ہے لیکن
اگر اکثر اوقات نہ ہو، بارے گاہ گاہ
مجنوں سے آگاہ نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ میرؔ
اس صحرا سے گاہے گاہے ایک غبار اٹھتا ہے

۴۶۶

تیری راہ میں آہ داغ دیکھے
دل جلا ہوا کباب ہو گیا
کتنا زیادہ پسند آتا ہے
محبوبوں کا ناپسندیدہ طور
حیف خوب رویوں کے شہر میں میرؔ
کوئی میری زبان نہیں سمجھا

---

۱ حقیر چیز، تنکے کے برابر۔

۴۶۷

سر کن کہ در خزاں بہ چہ دل را نہادۂ
اے عندلیب دیر بہ دستم فتادۂ
داغ ام ز غفلتت کہ ازیں انجمن چو شمع
ہر لحظہ گرمِ راہ ای و بےغم ستادۂ
بر جا نہ بودنِ تو دلا نیست بےسبب
شاید قدم بہ راہِ محبت کشادۂ
گشتی جوان و فرق نہ کردی ز یار و غیر
خطّت نمود کرد و ہنوز آہ سادۂ
از اُفت و خیزِ دم بہ دم و قصدِ ضبط میرؔ
معلوم می شود کہ دل از دست دادۂ

۴۶۸

شیخ در عشق پاےگیر شدہ
ایں ہوس کشتہ مفت اسیر شدہ
امتیازِ گدا و شاہ نہ ماند
عالمے بہرِ او فقیر شدہ
سادگی بود موسمِ شوخی
او در ایامِ خط شریر شدہ
دید ہر کس نزاریٔ من گفت
ایں جواں را چہ شد کہ پیر شدہ
در غمِ قامتِ تو فاختہ نیز
پا علم خواں بسانِ میرؔ شدہ

۴۶۹

اے خنک آں کس کہ وقتِ گریہ را دریافتہ
کانچہ ہر کس یافتہ از دیدۂ تر یافتہ

۴۶۷

خزاں میں جو (نالہ) دل میں چھپا رکھا تھا اسے شروع کر
اے عندلیب (تو) بہت دیر میں میرے ہاتھ لگی ہے
تیری غفلت پر رنجیدہ ہوں کہ اس انجمن سے شمع کی طرح
تو ہر لحظہ سفر کر رہا ہے اور بے فکر کھڑا ہے
اے دل تیرا جگہ پر نہ ہونا بے سبب نہیں ہے
شاید تو نے محبت کی راہ میں قدم رکھا ہے
جوان ہو گیا اور یار اور غیر میں تمیز نہیں کی
تیرے خط نکل آئے اور آہ ابھی تک سادہ ہے
تیرے ہر وقت کے گرتے پڑتے رہنے اور ضبط کے ارادے سے میرؔ
معلوم ہوتا کہ (تو نے) دل ہاتھ سے دے دیا ہے

۴۶۸

شیخ عشق میں پھنس گیا ہے
یہ ہوس کا مارا مفت میں اسیر ہوا
شاہ و گدا کا امتیاز نہیں رہا
ساری دنیا اس کے لیے فقیر ہو گئی
سادگی شوخی کا موسم تھا
وہ خط نکلنے کے دنوں میں شریر ہو گیا
جس نے بھی میری لاغری دیکھی کہا
اس جوان کو کیا ہوا کہ بوڑھا ہو گیا
تیرے قامت کے غم میں فاختہ بھی
میرؔ کی طرح پا بعلم خواں[1] ہو گئی

۴۶۹

وہ خوش (نصیب) ہے جس نے وقتِ گریہ کو پایا ہے
کیوں کہ جس نے بھی جو کچھ پایا ہے دیدۂ تر سے پایا ہے

---

[1] عزائی علم کے نیچے نوحہ پڑھنے والی۔

بوالہوس انداز کوئے آں ستم گر کردہ بود
چشمِ او ترسید چوں در ہر قدم سر یافتہ

۴۷۰

اشکِ من لغزاں بہ رخسار آمدہ
ہم چوں طفلِ نو بہ رفتار آمدہ
سال ہا باید کہ آید از سحاب
آں چہ شب از گریۂ زار آمدہ

۴۷۱

دلا جملہ داغ ای و خوں گشتۂ
مگر خرچ راہِ جنوں گشتۂ
کسے می شود زرد بے لعلِ یار
تو خود میرؔ زار و زبوں گشتۂ

۴۷۲

می کند کہ التفاتے بر منِ بے چارۂ
آستینِ کہنہ دارم، جامۂ صد پارۂ
گرد بادے دیدم و مردم ز رشکِ ایں کہ میرؔ
از غمِ او خاک بر سر می کند آوارۂ

۴۷۳

مرا رنجست اے مہ بے تو جاں کاہ
تو پشتِ چشم نازک می کنی آہ

۴۷۴

در نقشِ (دو) ابروئے تو بس دیر کشیدہ
نقّاش بہ تنگ آمدہ شمشیر کشیدہ

۴۷۵

کرد از بس خونِ مشتاقاں مصوّرزادۂ
شد زمیں دیوارِ صورت کاریِ افتادۂ

بوالہوس نے اس ستم گر کے کوچے کا جائزہ لیا
اس کی آنکھ پتھرا گئی جب ہر قدم پر سر نظر آئے

۴۷۰

میرا آنسو پھسلتا ہوا گال پر آتا ہے
جیسے طفلِ نو چلنا شروع کرتا ہے
سالہا چاہییں کہ بادل سے ممکن ہو سکے
جو رات گریۂ زار نے کیا

۴۷۱

اے دل (تو) تمام داغ ہے اور خون ہو چکا ہے
ضرور جنوں کی راہ میں مارا گیا ہے
کوئی (بھی) لعلِ یار کے بغیر زرد ہو جائے گا
(تُو) تو خود میرؔ زار و زبوں ہو چکا ہے

۴۷۲

کون مجھ بے چارے پر التفات کرتا ہے
آستیں بوسیدہ رکھتا ہوں، جامۂ سو ٹکڑے
گرد باد دیکھا اور اس رشک سے مرتا ہوں کہ میرؔ
اس کے غم میں ایک آوارہ سر پر خاک ڈال رہا ہے

۴۷۳

مجھے اے ماہ تیرے بغیر جاں کاہ رنج ہے
آہ تو تغافل کر رہا ہے

۴۷۴

تیرے دو ابروؤں کے نقش میں بہت دیر لگ گئی
نقاش نے تنگ آ کر تلوار کھینچ لی

۴۷۵

ایک مصوّر زادہ نے مشتاقوں کا بے حد خون کیا
زمین صورت کاری کی گری ہوئی دیوار (کی طرح) ہوگئی

۴۷۶

دلے داریم در بر نونیازے
بلاگردانِ قدِ سروِ نازے
بہ شہرِ حسن چوں آئینہ گشتم
نہ دیدم دلبرِ عاشق نوازے
چہ می پرسی کہ در داوِ نخستین
دلم شد مالِ شوخِ سخت بازے
برائے عشقِ ایں بالا بلنداں
تمنّا می کنم عمرِ درازے
معیشت میرؔ بے دروانہ تا چند
بُکاے، شیونے، حزنے، گدازے

۴۷۷

مدام دعویِ خوبی بہ یارِ من داری
ز خلق شرم کن اے گل تو ایں دہن داری
دلا جوابِ غمت از کسے نمی آید
تو آں کس ای کہ دریں باب صد سخن داری
شدم بہ باغ و دریغ از گلے نہ پرسیدم
کہ از برائے کہ صد چاک پیرہن داری
کدام گل کہ نیفسرد و داغِ یاس نہ شد
تو آرزوئے تماشائے ایں چمن داری
اگر ز خود شدنت دست دادہ خوش دل باش
در ایں مقام مکن فکرِ خویشتن داری
بغیرِ ذکرِ بتاں میرؔ بر زبانت نیست
تو اے عزیز مگر کیشِ برہمن داری

۴۷۶

پہلو میں ایک تونیاز دل رکھتا ہوں
ایک سرو ناز کے قد کی بلائیں لینے والا
شہر حسن میں آئینے کی طرح پھرا
ایک (بھی) عاشق نواز دلبر نہیں دیکھا
کیا پوچھتا ہے کہ پہلے (ہی) داؤ میں
میرا دل ایک سخت باز اشوخ کا مال ہو گیا
ان دراز قامتوں سے عشق (کرنے) کے لیے
ہم عمرِ دراز کی دعا کرتے ہیں
میرؔ درد کے بغیر کب تک زندہ رکھنا
بکا، شیون، حزن، گداز

۴۷۷

ہمیشہ خوبی کا دعویٰ میرے یار کے سامنے کرتا ہے
اے گل لوگوں سے شرم کر کہ (کیا) تو یہ منہ رکھتا ہے
اے دل تیرے غم کا جواب کسی کے پاس نہیں
تو وہ ہے کہ اس باب میں سو سوال رکھتا ہے
باغ میں تھا اور افسوس کسی گل سے نہیں پوچھا
کہ کس کے واسطے صد چاک پیراہن رکھتا ہے
کون سا گل (تھا) کہ مرجھا نہ گیا اور یاس کا داغ نہ بن گیا
تو اس چمن کی سیر کی آرزو رکھتا ہے
اگر تو خود سے دست بردار ہوتا ہے، خوش دل رہ
اس مقام پر اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی فکر مت کر
ذکرِ بتاں کے بغیر میرؔ تیری زباں پر کچھ نہیں ہے
تو اے عزیز شاید برہمن کے مذہب سے ہے

---

[1] کھیل میں ہمیشہ جیتنے والا، جیتے بغیر نہ ٹلنے والا۔

۴۷۸

شد در قفسم غم رہائی
معشوقۂ روزِ بےنوائی
کے از نگہے شود تسلّی
تصدیع کشیدۂ جدائی
از راہِ طلب خبر نہ داریم
ما ایم و ہمیں شکستہ پائی
ایں مرتبہ زندہ گر بمانیم
دیگر نہ کنیم آشنائی
در عشق و ہوس تمیز سہل است
از خانہ اگر بروں بیائی
دوشم گذرے بہ کویش افتاد
امّا بہ بہانۂ گدائی
شد میرؔ فقیر و از عزیزاں
ہرگز نہ کشید میرزائی

۴۷۹

یک لحظہ بہ سرخستۂ خود را نہ ستادی
یک دم بہ خبرپُرسشِ او لب نہ کشادی
بلبل حقِ صحبت مگرت یاد نہ بودہ ست
کز باغ گذشتیم و تو آواز نہ دادی
اے صیدِ حرم ذوقِ شہادت تو چہ دانی
نے تیغ بہ سر دیدی و نے کشتہ فتادی
داغ ایم ز واماندگیِ قافلہ اے کاش
از دور سیاہی بکند آتشِ وادی

۴۷۸

قفس میں مجھے رہائی کا غم
معشوقۂ روزِ بے نوائی[1] بن گیا
کب ایک نگاہ سے مطمئن ہوتا ہے
جدائی کی تکلیف اٹھا چکنے والا
راہِ طلب کا پتہ نہیں جانتے
ہم ہیں اور یہی شکستہ پائی
اس مرتبہ اگر زندہ بچ گئے
اور (کسی سے) آشنائی نہیں کریں گے
عشق اور ہوس میں تمیز سہل ہے
اگر (تو) گھر سے باہر نکل آئے
کل میرا گزر اس کے کوچے میں ہوا
لیکن گدائی کے بہانے
میرؔ فقیر ہو گیا مگر دوستوں کی
شان اور اکڑ ہرگز نہیں برداشت کی

۴۷۹

ایک لحظہ (بھی) اپنے سرِ خستہ کی تعریف نہیں کی
(تو نے) ایک بار (بھی) اس کی خبر پوچھنے کے لیے لب نہ کھولا
بلبل مگر تجھے حقِ صحبت یاد نہیں رہا ہے
کہ باغ سے ہم گزرے اور تو نے آواز نہ دی
اے صیدِ حرم تو ذوقِ شہادت کیا جانے
نہ سر پر تیغ دیکھی اور نہ قتل ہو کر گرا
ہم قافلے سے پیچھے رہ جانے سے رنجیدہ ہیں، اے کاش
دور سے آتشِ وادی کے آثار نظر آئیں

---

[1] ایسی شے جس کے تصور سے پریشانی اور بے سروسامانی کی حالت میں دل بہلایا جائے۔

امروز فلک بر سرِ لطف است عجب نیست
گر پا بہ زمینم نہ رسد میرؔ ز شادی

۴۸۰

نہ آہِ سینہ خراشے نہ نالۂ زارے
شبِ فراق بہ پایاں چساں رسد بارے
یکے بہ دیدنِ دل خستگانِ شوق بیا
کہ دیدہ اند برائے تو رنج بسیارے
نہ شد کشودِ دل از کوچہ گردیم اکنوں
بداں سرم کہ بیفتم بہ پائے دیوارے
مرو بہ سوئے قفس اے صبا گلے در دست
مباد رنجہ شود خاطرِ گرفتارے
صدف ز گوشِ مہے یاد می دہد ما را
گہر ز اہلِ زبانے ست حرفِ تہ دارے
سپاسِ عشق بکن میرؔ، ہر کرا نہ دہند
دلِ ستم زدہ، دیدۂ جگر بارے

۴۸۱

چہ بدن ہاے خودنما داری
پیرہن پیرہن صفا داری
پیش از ایں پاسِ عشق حسنے داشت
حالیا ننگ شد وفاداری
سادگاں گرچہ عالم آشوب اند
تو ز خط عالمے جدا داری
تیغ در دست می رسی ہر دم
من نہ دانم چہ مدعا داری

آج آسمان مہربان ہے عجب نہیں ہے
میرؔ اگر خوشی سے زمین پر پاؤں نہ پڑے

۴۸۰

نہ سینہ خراش آہ نہ نالۂ زار
آخر شب فراق کیسے ختم پر آئے گی
ایک بار شوق کے دل خستگاں کو دیکھنے کے لیے آ
کہ تیرے لیے (انہوں نے) بہت رنج دیکھے ہیں
اب کوچہ گردی سے دل کی کشاد نہیں ہوئی
میرے اس سر (کی وجہ) سے جو کہ پائے دیوار پر پٹک رہا ہوں
اے صبا گل ہاتھ میں لے کر قفس کی طرف نہ جا
کہیں ایسا نہ ہو کہ گرفتار کا دل اداس ہو جائے
صدف ہمیں کسی محبوب کے کان کی یاد دلاتا ہے
موتی (کیا ہے، گویا) اہلِ زباں کا حرفِ تہ دار ہے
میرؔ عشق کا شکریہ ادا کر، ہر کسی کو نہیں دیتے
ستم زدہ دل، جگر برسانے والی آنکھیں

۴۸۱

(تو) کیا خودنما بدن رکھتا ہے
(تو) پیرہن پیرہن صفا رکھتا ہے
اس سے پہلے حسن عشق کا پاس رکھتا تھا
آج وفاداری ننگ بن چکی ہے
سادگاں گرچہ عالم آشوب ہیں
تو خط کی وجہ سے جدا عالم رکھتا ہے
ہر دم ہاتھ میں تیغ لیے پہنچتا ہے
میں نہیں جانتا (تو) کیا ارادہ رکھتا ہے

بہرِ آں رشکِ باغ داغ شدم
در من آتش زد ایں ہواداری
رُخِ یار دیدہ ای اے گل
دست زیرِ زنخ بجا داری
یاد عبدِ ضعیف خواہی کرد
بعدِ من گر سرِ جفا داری
از بتاں گو نہ شد کشود اے دل
ایں ہمہ غم مخور، خدا داری
خوبیِ بےزری چہ گویم میرؔ
بد بلاےست عشق و ناداری

۴۸۲

بر چہ امید دل ز جا رفتی
سوختی، خوں شدی و وارفتی
پنجۂ گل بہ دامنت نہ رسید
از گلستاں بہ کبریا رفتی
بودہ ای تا بہ قتل ہمراہم
ایں نہ دانم دگر کجا رفتی
طالعِ کشتہ اے کہ با نعشش
تا سرِ خاک پا بہ پا رفتی
اے کہ با زلفِ او سرے داری
آہ دانستہ در بلا رفتی
چہ بگویم کہ بر دلِ زارم
حیف ہا رفتہ است تا رفتی
کشتہ ام ہر کہ دید گفت سزاست
ایں ہمہ پیشِ او چرا رفتی

اس رشکِ باغ کے لیے داغ ہو گیا ہوں
اس ہواداری[1] نے مجھ میں آگ لگا دی
اے گل تو نے یار کی ٹھوڑی دیکھی ہے
ٹھوڑی کے تلے ہاتھ بجا رکھا ہے
بوڑھے غلام کو یاد کرے گا
میرے بعد اگر (تو) جفا کا ارادہ کرے (گا)
بتوں سے اگرچہ خوشی حاصل نہ ہوا اے دل
اتنا غم نہ کھا، (تو) خدا رکھتا ہے
بے زری کی خوبی میرؔ کیا کہوں
عشق اور ناداری بری بلا ہیں

۴۸۲

کس امید پر دل تو بے قابو ہوا تھا
جل گیا، خون ہو گیا اور مٹ گیا
پھولوں کا ہاتھ تیرے دامن تک نہیں پہنچا
تو گلستان سے ناز کے ساتھ گذرا
قتل تک تو میرے ساتھ رہا تھا
یہ نہیں جانتا پھر (تو) کہاں چلا گیا
اس مقتول کی قسمت کہ اس کی نعش کے ساتھ
تو قبر تک قدم بہ قدم چلا
اے کہ تجھے اس کی زلف کا خیال ہے
آہ، (تو) جان کر بلا میں گرفتار ہو گیا (ہے)
کیا کہیں کہ میرے ناتواں دل پر
بہت سے صدمے گزرے ہیں، جب سے تو چلا گیا ہے
جس نے مجھے قتل کیا ہوا دیکھا کہا درست ہے
(تو) اس قدر اس کے سامنے کیوں گیا تھا

---

[1] بہی خواہی، عاشقی۔

میرؔ مردی و چشم جانبِ اوست
تو بہ کشتن از ایں ادا رفتی

۴۸۳

ہر گاہ سفیدی بکند ابرِ سیاہے
مے نوش کہ ضائع نہ شود وقتِ گناہے
قربانیِ اندازِ کہ بودہ ست نہ دانم
دیدیم ستم کشتہ جوانے سرِ راہے
گر سر کشد از تربتِ من سرو عجب نیست
بودہ ست دلم سایہ روِ قامتِ آہے
خوش باشد اگر صحبتِ رنداں خوشت آید
ایں جا نہ عصاے، نہ رداے، نہ کلاہے
از میرؔ نہ دانیم ولے می گذرد کس
با حالِ تباہے ز سرِ کوئے تو گاہے

۴۸۴

گاہے نہ رفتہ گامے دل خواہِ تشنہ کامے
خوردہ ست ابلقِ چرخ بس آب بے لجامے
زآں ہا کہ ایں عمارت زیرِ نگینِ شاں بود
اکنوں نہ ماندہ باقی آثار غیرِ نامے
با روئے دل کشِ آں کاو رشکِ آفتاب است
کے می شود برابر چوں ماہِ ناتمامے
نیرنگِ عشق بنگر، دارد بہ ہر دیارے
رسمے، رہے، طریقے، پیغمبرے، امامے
مصروفِ دیدنِ تست اے دشمنِ دل و جاں
ہر گز نہ دیدہ ام من چون میرؔ دوست کامے

میرؔ تو مر گیا اور نظریں اس کی طرف ہیں
تو ایسی (ہی) حرکتوں سے قتل ہونے کو پہنچا

۴۸۳

جب ابرِ سیاہ سفیدی[۱] کرے
شراب پی کہ گناہ کا وقت ضائع نہ ہو جائے
کس کے ناز و انداز پر قربان ہوا تھا نہیں جانتا
ہم نے سرِ راہ ایک ستم کشتہ جوان کو دیکھا ہے
اگر میری تربت سے سرو سر کھینچے عجب نہیں ہے
میرا دل قامتِ آہ کے سائے میں چلنے والا تھا
خوش رہ اگر تجھے صحبتِ رنداں اچھی لگتی ہے
اس جگہ نہ عصا ہے، نہ ردا ہے، نہ کلاہ ہے
میں میرؔ کو نہیں پہچانتا مگر کون (ہے جو) گزرتا ہے
کبھی کبھی تیرے کوچے سے تباہ حال میں

۴۸۴

کسی پیاسے کے دل خواہ کبھی ایک قدم بھی نہیں چلا
ابلقِ چرخ نے صرف آبِ بے لجام[۲] پیا ہے
یہ عمارت جن کے زیرِ نگیں تھی ان کی
اب نام کے سوا کوئی نشانی باقی نہیں ہے
اس دلکش چہرے کے جو کہ رشکِ آفتاب ہے
ماہِ ناتمام کیوں کر برابر ہو سکتا ہے
عشق کا طلسم دیکھو، ہر دیار میں رکھتا ہے
رسم، رہ، طریق، پیغمبر، امام
اے دل اور جان کے دشمن تجھے دیکھنے میں منہمک
میں نے کبھی میرؔ سا عاشق نہیں دیکھا

---

۱ نمودار ہو۔
۲ مطلق العنانی، خودسری کی ہے۔

۴۸۵

خوش است اے بےوفا گر چند روزے خو بگردانی
زنی حرفے بہ ابرو تا کجا و رو بگردانی
بہ رنگے نازک ای کز خواب بےتابانہ برخیزی
اگر بر بسترِ برگِ گلے پہلو بگردانی
تو اے گل در چمن بر خویش می چینی و می ترسم
مباد از سیلیِ پائیز رنگِ رو بگردانی
نمی فہمی تو اے میرؔ ارنہ خلقے رو بہ تو آرد
اگر یک لحظہ روئے دل بہ سوئے او بگردانی

۴۸۶

مرا ہم دلے بود نشنودہ پندے
ستم دیدۂ، عاشقے، دردمندے
مگر دل در ایں راہ گردد دلیلم
نہ شورِ درائے، نہ گردِ سمندے
چو آئینہ حیرانِ کارِ دل ام من
کہ کارش فتادہ ست با خودپسندے
چو در جلوہ دیدیم بالائے او را
بگفتیم از دور، عشقِ بلندے
قرارے نہ دارد دلت میرؔ ہرگز
ہمانا کہ عاشق شدی بر لوندے

۴۸۷

چہ گویم آہ از دستِ جفائے شوخِ بےباکے
دلے دارم، بر او زخمے، جگر دارم، بر او چاکے

۴۸۵

اچھا ہے اے بے وفا اگر چند روز کے لیے اپنی خو بدل دے
کب تک تو ابرو سے بات کرے گا اور منھ پھیرے رہے گا
تو اتنا نازک ہے کہ خواب سے بے تابانہ جاگ اٹھتا ہے
اگر (تو) پھولوں کی سیج پر (بھی) پہلو بدلتا ہے
اے گل تو چمن میں غرور کرتا ہے اور میں ڈرتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو کہ خزاں کا طمانچہ تیرے چہرے کا رنگ بدل دے
اے میرؔ تو (یہ بات) نہیں سمجھتا ورنہ خلق تیری طرف توّجہ کر لے
اگر تو ایک لحظہ اپنے دل کا رخ اس کی طرف سے موڑ لے

۴۸۶

میرا دل بھی نصیحت نہ سننے والا تھا
ستم دیدہ، عاشق، دردمند
مگر دل اس راہ میں مجھے راہ دکھانے والا بن گیا
نہ بانگِ درا کا شور، نہ سمند کی گرد
آئینے کی طرح دل کے حال پر حیران ہوں
کہ اس کا کام ایک خود پسند سے پڑ گیا ہے
جب اس کے قامت کو جلوہ گر دیکھا
دور سے (ہم نے) کہا عشقِ بلند
تیرے دل کو میرؔ بالکل قرار نہیں آتا
شاید کہ کسی لوندا[1] پر عاشق ہوا ہے

۴۸۷

کیا کہوں آہ ایک بے باک شوخ کے دستِ جفا سے
دل رکھتا ہوں، اس پر زخم؛ جگر رکھتا ہوں، اس پر چاک

---

[1] عیش پسند، رند، بدمعاش، فاحشہ عورت، قحبہ، بدکار لڑکا، ناخدا ترس، اوروں کا مال کھانے والا۔

دلِ بشگفته اے باید صبا از بہرِ گلگشتے
تو و ایں خاطرِ شادے، من و ایں جانِ غم ناکے
فراغت دارم از طوبیٰ و احسانِ بہشتِ تو
مرا بردہ ست خواب اے شیخ زیرِ سایۂ تاکے
نشستم مدّتے در بزمِ مستان و دمِ رفتن
بہ رنگِ ابرِ تر برخاستم با دامنِ پاکے
در آں جاے کہ سر می زد شب از من شعلۂ آہے
نہ شد معلوم آں جا صبح دم غیر از کفِ خاکے
گل افشاں اے نسیمِ صبح کن خاکِ عزیزاں را
بیفشاں بر مزارِ ما غریباں مشتِ خاشاکے
بہ امیدے کہ دارد میرؔ ہر نخچیرِ ایں وادی
گلوے بابِ شمشیرے، سرے شایانِ فتراکے

۴۸۸

ز ترکِ چوں تو اے حیف است محرومیِ نخچیرے
کمندے، نیزہ اے، تیغے، کمانے، ناوکے، تیرے
بہ بدنامی نمودی شہرہ و با قتلِ ہمراہی
نہ کردی در حقِ ما بےکساں اے عشق تقصیرے
بہ تسلیم دمے در صیدگاہِ عشق آسودم
گذر کردم بہ آسانی ز آبِ تیزِ شمشیرے
بہ بزمِ عیشِ او استادنم خاموش از حیرت
بداں ماند کہ بر دیوار چسپانند تصویرے
سرِ ایں داستاں مکشا کہ کہ از غم بر زباں دارم
بہ رنگِ خامۂ شنجرف خوں آلودہ تقریرے
نہ امروزے ست ایں صحبت کہ ہست از اول خلقت
بہ دستِ حسن شمشیرے، بہ پائے عشق زنجیرے

گلگشت کے لیے صبا شگفتہ دل چاہیے
تو اور یہ شاد خاطر، میں اور یہ غم ناک جان
طوبیٰ اور تیری بہشت کے احسان سے فراغت رکھتا ہوں
(اے) شیخ، مجھے ایک خواب زیرِ سایۂ تاک لے گیا ہے
مدّتوں بزمِ رنداں میں بیٹھا اور جانے کے وقت
ابرِ تر کی طرح چلا گیا دامنِ پاک کے ساتھ
جس جگہ کہ رات مجھ سے شعلۂ آہ سرزد ہوا تھا
اس جگہ صبح دم سوائے کفِ خاک کے کچھ نہیں ملا
اے نسیم صبح خاکِ عزیزاں کو گل افشاں کر
ہم غریبوں کے مزار پر مشت خاک ڈال
کس کی امید پر میرؔ اس وادی میں ہر نخچیر رکھتا ہے
شمشیر کے لائق گلو، فتراک کے شایاں سر

۴۸۸

تجھ جیسے ترک سے شکار کی محرومی پر افسوس ہے
کوئی کمند، کوئی نیزہ، کوئی تیغ، کوئی کمان، کوئی ناوک، کوئی تیر (تو ہوتا)
(ہماری) بدنامی کو تو نے شہرت دی اور قتل کے لیے ساتھ ساتھ ہے
اے عشق ہم بے کسوں کے حق میں تو نے تقصیر نہیں کی
عشق کی صیدگاہ میں جان سپرد کر کے چین سے ہوں
میں شمشیر کے آبِ تیز سے بآسانی گزر گیا
اس کی بزمِ عیش میں میرا حیرت سے خاموش کھڑا ہونا
اس طرح ہے کہ جیسے دیوار سے تصویر چسپاں کرتے ہیں
اس داستاں کو مت شروع کر کہ غم سے (میری) زبان پر
سرخ روشنائی کے قلم کی طرح ایک خون آلودہ تقریر ہے
آج (ہی کی) یہ صورت نہیں ہے کہ تخلیق کی ابتدا سے
حسن کے ہاتھ میں شمشیر اور عشق کے پاؤں میں زنجیر ہے

بہ قولِ دشمنش گر می کشی فہمیدہ کش بارے
کہ دیگر در جہاں ہرگز نہ خواہی دید چوں میرؔے

۴۸۹

ز بختِ ماست اگر بےخبر بہ دست آئی
کہ بر مرادِ دل اے خوش کمر بہ دست آئی

ز شوقِ وصلِ تو اے رشکِ شمع بےتاب ام
سر فتیلہ کنم چرب اگر بہ دست آئی

مرا بہ دست بہ صد صنعت آمدی و شدی
نصیبِ آں کہ تواش چوں ہنر بہ دست آئی

بہ حالِ مرگ ز دستِ تہی گرفتارام
خدا کند کہ تو اے سیم بر بہ دست آئی

چگونہ میرؔ بگو از تو دست بردارد
تو آں گل ای کہ بہ خونِ جگر بہ دست آئی

۴۹۰

گر بہ سخن یار سرے داشتے
روئے سخن کے دگرے داشتے

ہر کہ شدے تنگ بدر می زدے
کاشکے ایں خانہ درے داشتے

ایں ہمہ آزار نہ کردے مرا
گر ز دلِ من خبرے داشتے

ذوقِ جفائے تو نشد حاصلم
کاش دلِ من جگرے داشتے

موے سرش وا نہ شدے در غم
گر ز من آشفتہ ترے داشتے

اگر دشمن کے کہنے پر (اسے) قتل کرتا ہے، سمجھ کر قتل کر
کہ دنیا میں میرؔ جیسا اور (کوئی) نہیں پائے گا

۴۸۹

ہماری خوش قسمتی ہے اگر تو بے خبر مل جائے
اور دل کی مراد پر اے خوش کمر تو مل جائے
تیرے وصل کے شوق میں اے رشکِ شمع بے تاب ہوں
سرِ فتیلہ چرب کروں[1] اگر تو مل جائے
(تو) میرے ہاتھ میں سو ہنر سے آیا اور نکل گیا
اس کا نصیب جسے تو ہنر کی طرح مل جائے
موت کی حالت میں گرفتار ہوں
خدا کرے کہ اے چاندی جیسے بدن والے تو مل جائے
بتا کہ میرؔ کس طرح تجھ سے دست بردار ہو جائے
تو وہ گل ہے جو کہ خونِ جگر کے عوض ملتا ہے

۴۹۰

اگر یار سخن کا ارادہ رکھتا
کون دوسرا روئے سخن رکھتا
جو بھی تنگ ہوتا ہے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے
کاش کہ اس گھر میں دروازہ ہوتا
مجھے اتنا آزار نہیں پہنچاتا
اگر میرے دل کی خبر رکھتا
تیری جفا کا ذوق مجھے حاصل نہیں
کاش میرا دل حوصلہ رکھتا
اس کے سر کے بال میرے غم میں نہیں بکھرتے
اگر کوئی (اس کے لیے) مجھ سے زیادہ پریشان ہوتا

---

[1] جسمانی تعلق بناؤں۔

میرؔ ز ایّام چہ نقصان شدے
گر شبِ ما ہم سحرے داشتے

۴۹۱

نہ شاید کہ ایں ہمہ در کوچہ ہا گردیدنے داری
تو معشوق ای و ہر کس را بہ دل چسپیدنے داری
بسوزاں بر دلِ خود یک گلستاں داغِ محرومی
در ایں گلزارِ دل کش گر سرِ گل چیدنے داری
چہ آتش در جگر داری کز او اے میرؔ ہر ساعت
بسانِ ماہیِ بےآب دل تفتیدنے داری

۴۹۲

نیستش پروازِ تیرِ دل گذارِ دیگرے
جاں کہ صیدِ تست کے گردد شکارِ دیگرے
ہر کسے می میرد امّا مرگِ من ہم تازہ است
مردن از بہرِ نگاہے نیست کارِ دیگرے
از منِ عاجز طریقِ پاسداری یاد گیر
می کشم بر دوشِ خود چوں سایہ بارِ دیگرے
مردنت گر رو دہد بے یار مفتِ خود شمار
ہاں بخواہی زیستن سالِ ہزارِ دیگرے
طرفہ صحبت در محبت اتفاق افتادہ است
من ہلاکِ او و اے ام و او بےقرارِ دیگرے
من کشم خمیازہ بر خمیازہ از شوقِ وصال
او بخوابد مستِ مے سر در کنارِ دیگرے
اوجِ دنیا میرؔ در چشمم نہ دارد اعتبار
ہر زماں باشد جہاں در اختیارِ دیگرے

میرؔ زمانے کا کیا بگڑ جاتا
اگر ہماری شب بھی سحر رکھتی

۴۹۱

تجھے شاید کوچوں (بازاروں) میں اس قدر گھومنا نہیں چاہیے
تو معشوق ہے اور ہر ایک سے دل لگائے رکھنا چاہتا ہے
اپنے دل پر ایک گلستان داغِ محرومی جلا
اس دل کش گلزار میں اگر پھول چننے کا خیال رکھتا ہے
(اے) میرؔ (تو) جگر میں کیا آگ رکھتا ہے کہ جس سے ہر ساعت
ماہئ بے آب کی طرح دل جلائے رکھتا ہے

۴۹۲

اس کو کسی اور کے تیرِ دل گداز کی پروا نہیں ہے
جان تیری صید ہے، کون کسی اور کے شکار کو پکڑتا ہے
ہر ایک کو مرنا ہے مگر میری موت بھی تازہ ہے
ایک نگاہ کے لیے مر جانا کسی اور کا کام نہیں ہے
مجھ عاجز سے مروّت کا طریقہ سیکھ
میں سائے کی طرح اپنے کاندھے پر دوسرے کا بوجھ اٹھاتا ہوں
اگر یار کے بغیر تجھے موت آ جاتی ہے، اپنے لیے مفت شمار کر
خبردار اگر ہزار سال اور زندہ رہنا چاہتا ہے
محبت میں (یہ) طرفہ صحبت اتّفاق سے بہم ہوئی ہے
میں اس کا ہلاک ہوں اور وہ کسی اور کا بے قرار
میں شوقِ وصال میں خمیازہ پر خمیازہ کھینچ رہا ہوں
وہ شراب سے مست کسی اور کے پہلو میں سر رکھے سو رہا ہے
دنیا میں بلند مرتبہ میرؔ میری آنکھوں میں (کوئی) حقیقت نہیں رکھتا
ہر وقت دنیا کسی اور کے اختیار میں آ جاتی ہے

۴۹۳

در قفس دیدم سحرگہ مرغِ بے بال و پرے
شعرہاے میرؔ می خواندے بہ حالِ ابترے
گفتمش اے مشتِ پر آخر چہ بیتابی ست ایں
کارِ دل چوں من فتادت با کدامیں دل برے
کایں ہمہ می نالی و اشعار می خوانی ز درد
لحظہ لحظہ می کشی آہ از دلِ غم پرورے
گفت دارم دل ربایے، شیشہ جانے، نازکے
شہرتے دارد بہ گل، محبوبِ دَق از دل برے
نکہتش بےخود کنے، چشمک جہاں برہم زنے
رنگِ او در بُردنِ دل ہا عجب جادوگرے
بےوفا، دشمن نیازے، نازآییں، سرکشے
خودپسندے، خودستاے، خودنماے، خودسرے
بےمرّوت بس کہ در خونم فرو بردہ ست آہ
پنجہ اش از پنجۂ مرجاں شدہ رنگیں ترے
گہ شود وا با نسیمِ صبح و گہ با باغباں
من برائے او ہلاک ام او برائے دیگرے
گر کنم بےطاقتی معذور دار اے دردمند
آشنا با ایں چنیں کافر نہ گردد کافرے

۴۹۴

اے آں کہ غافل ای و پۓ کار نیستی
از ہستیِٔ خود آہ خبردار نیستی
در موج خیزِ دہر حباب ای، بہ خود مناز
تا چشم وا کنی کہ بہ یک بار نیستی
عاشق شدی مگر کہ بہ رحم آشنا شدی
از چند روز در پۓ آزار نیستی

۴۹۳

صبح کو قفس میں میں نے دیکھا کہ ایک پرندہ بے بال و پر
ابتر حال میں میرؔ کے اشعار پڑھ رہا تھا
میں نے اس سے کہا اے مشتِ پر آخر یہ کیا بے تابی ہے
میری طرح دل کا کام کس دلبر سے تجھے پڑا ہے
کہ اتنی نالہ زاری کرتا ہے اور درد (انگیز انداز میں) اشعار پڑھتا ہے
لحظہ لحظہ غم پرور دل سے آہ کھینچتا ہے
کہا ایک دلبر رکھتا ہوں شیشہ جاں، نازک
گل (کے نام) سے شہرت رکھتا ہے، دل سے ملال کو دور کرنے والا محبوب
اس کی نکہت بے خود کرنے والی، چشمک جہاں کو برہم کرنے والی
اس کا رنگ دلوں کے اڑا لے جانے میں عجب جادوگر
بے وفا، نیاز کا دشمن، ناز آئیں، سرکش
خود پسند، خودستا، خودنما، خودسر
اتنا زیادہ بے مروّت کہ میرے خون میں ڈبودیں ہیں، اور
اس کی انگلیاں پنجۂ مرجان سے زیادہ رنگین ہوگئی ہیں
کبھی نسیمِ صبح سے بے تکلف ہوتا ہے، کبھی باغبان سے
میں اس کے لیے ہلاک ہوا اور وہ کسی اور کے لیے
اگر تکلیف نہ سہار سکوں اے دردمند، معذور رکھ
ایسے کافر سے کوئی کافر (بھی) آشنا نہ ہو

۴۹۴

اے تو کہ غافل ہے اور مقصد کی فکر میں نہیں ہے
اپنی ہستی سے تو خود، آہ، خبردار نہیں ہے
دنیا کے سمندر میں تو حباب ہے، اپنے آپ پر غرور نہ کر
آنکھ کھولتے ہی اچانک (تو) نہیں ہوگا
ضرور عاشق ہوا ہے کہ رحم سے آشنا ہوا ہے
(تو) چند روز سے درپئے آزار نہیں ہے

در بارِ ماست جملہ متاعِ خوشِ وفا
امّا چہ فائدہ کہ خریدار نیستی
اظہارِ بےعلاقگیت ایں ہمہ چرا
معلوم شد دلا کہ گرفتار نیستی
افتادہ بودنت بہ رہش میرؔ تہمت است
آرے نہ بودہ ای، تو طلبگار نیستی

۴۹۵

دل بہ زلفش مگر اسیر شدی
کز منِ خستہ شانہ گیر شدی
آخر از اختلاطِ اوباشاں
شوخ و شلتاق و شریر شدی
خواجہ می گفتمت کہ بادہ مخور
مُسرِفی کردی و فقیر شدی
قدِ خم سوئے خاک ایمائےست
عاجزی پیشہ کن کہ پیر شدی
جز محبت نہ بود تقصیرش
بہ عبث خصمِ جانِ میرؔ شدی

۴۹۶

می خواند سحرگہ غزلِ میرؔ جوانے
در گریہ ز ہر شعر ترش بود جہانے
آں ہا کہ ز کوئے تو گذشتند گذشتند
پیدا نہ شد از گم شدگانِ تو نشانے
از زمزمۂ مرغِ قفس آہ مپرسید
شورِ عجبے داشتہ تا داشت زبانے
در رہگذرِ یار کہ خاکش ہمہ خوں است
بر ہر قدمے گریہ تواں کرد زمانے

ہمارے اسباب میں وفا کی تمام عمدہ متاع ہے
لیکن کیا فائدہ تو خریدار نہیں ہے
تیری (طرف سے) بے تعلقی کا اظہار اتنا زیادہ کیوں
معلوم ہوگیا اے دل کہ تو گرفتار نہیں ہے
اس کی راہ میں تیرا پڑا رہنا میرؔ تہمت ہے
ہاں تو نہیں تھا، تو (تو) طلب گار نہیں ہے

۴۹۵

دل تو ضرور اس کی زلف میں اسیر ہو گیا ہے
کہ مجھ خستہ سے کترانے لگا ہے
آخر اوباشوں کے ساتھ دوستی سے
تو شوخ اور فسادی اور شریر ہو گیا
خواجہ تجھ سے کہا تھا کہ شراب نہ پی
دولت لٹائی اور فقیر ہو گیا
خاک کی طرف قدِ خم ایک اشارہ ہے
عاجزی اختیار کر کہ بوڑھا ہو گیا ہے
محبت کے سوا اس کی تقصیر نہیں تھی
عبث میرؔ کا دشمنِ جان ہوا

۴۹۶

صبح کے وقت ایک جوان نے میرؔ کی غزل پڑھی
اس کے ہر ایک شعرِ تر پر ایک جہاں گریہ کر رہا تھا
جو کہ تیرے کوچے سے گزر گئے، گزر گئے
تیرے گم شدگاں کا کوئی سراغ نہیں ملا
مرغِ قفس کے زمزمہ کی کچھ نہ پوچھیے
جب تک زبان تھی، ایک عجیب شور کیا کرتا تھا
یار کی رہگزر میں کہ جہاں کی خاک سب خون ہے
ہر قدم پر ایک زمانے تک گریہ کیا جا سکتا ہے

پیری چو رسد لطفِ حیاتِ تو نہ ماند
در ضعفِ قوی زیست بود بارگرانے
افسوس کہ از منزلِ دل زود گذشتی
در شہرِ وفا بود ہمیں تحفہ مکانے
محو است و خبر نیستش از سود و زیاں لیک
خاکِ قدمت را نہ دہد میرؔ بہ جانے

۴۹۷

ہمدمِ اشک و آہ سرد شدی
آخر اے دل تمام درد شدی
رَو، تعلق بہم رساں بہ کسے
چہ کمال است ایں کہ فرو شدی
شیخ داری بہ کف عصاشمشیر
اے مخنث تو نیز مرد شدی
دل پے طفلگانِ تہ بازار
رفتہ رفتہ تو کوچہ گرد شدی
عشق ورزیدہ ای مگر اے میرؔ
کہ چنیں ناتواں و زرد شدی

۴۹۸

اے مستِ ناز ایں ہمہ بر خویش چیدنے
گاہے بہ دردِ دل شدگاں ہم رسیدنے
ایں اختراع تازۂ چشمِ کشندِ تست
غلطاندنے بہ خون و بداں سو نہ دیدنے
آں سبزہ ام کہ سرزدہ پامال گشتہ ام
در بختِ من نہ بود بہ خوبی دمیدنے

جب بڑھاپا آ گیا تیری زندگی کا لطف نہیں رہا
ضعفِ قوی سے زندگی بارِ گراں ہو جاتی ہے
افسوس کہ تو دل کی منزل سے جلد چلا گیا
شہرِ وفا میں یہی ایک تحفہ مکان تھا
عاشق ہے اور اسے سود و زیاں کی خبر نہیں ہے، لیکن
تیرے قدموں کی خاک میرؔ جان کے عوض بھی نہیں دے گا

۴۹۷

تو اشک اور آہِ سرد کا ہمدم ہو گیا
آخر اے دل تو تمام درد ہو گیا
جا اور کسی سے تعلق پیدا کر
یہ کون سا کمال ہے کہ سب سے الگ ہو گیا
شیخ (تو) ہاتھ میں عصا شمشیر[1] رکھتا ہے
اے مخنث تو بھی مرد بن گیا
(اے) دل تہ بازار لڑکوں کے لیے
رفتہ رفتہ تو کوچہ گرد ہو گیا ہے
شاید اے میرؔ (تو نے) عشق اختیار کیا ہے
جو اتنا ناتواں اور زرد ہو گیا ہے

۴۹۸

اے مست ناز خود پر اتنا غرور
کبھی عاشقوں کے غم تک بھی پہنچ
یہ تیری قاتل چشم کی تازہ اختراع ہے
خون میں لڑھکانا اور اس طرف نہ دیکھنا
وہ سبزہ ہوں کے نکلتے ہی پامال ہو گیا
میرے بخت میں خوبی کے ساتھ اگنا نہیں تھا

---

[1] گپتی (عصا کے اندر چھپی ہوئی چھری یا تلوار)۔

صد فصلِ گل گذشت در ایں گلستاں مرا
یک دم نہ شد بہ کام میسّر پریدنے
اے گل بہ حرفِ بلبلِ شوریدہ گوش دار
دارد حکایتِ غمِ عاشق شنیدنے
در آرزوئے بوسِ تو از جاں گذشتہ ایم
آئی اگر بہ تربتِ ما لب گزیدنے
تا کے دریدہ جیب بہ ہر کوچہ گشتنے
یک چند میرؔ پاے بہ دامن کشیدنے

۴۹۹

حریفے کن دمے یارب بہ ترکِ سر بہ سر کینے
کہ از خونِ خود افشاں کردہ آید دامنِ زینے
الٰہی ربط خاصے با گل اندامے ہمہ حورے
دلِ شادے، ندیمِ خوش بیانے، شعرِ رنگینے
چساں ماند بجا در عہدِ او رسمِ مسلمانی
خرامش خصمِ ایمانے، کلامش رہزنِ دینے
نہ خواہد رفت داغِ مرگِ او تا زندگی از دل
در ایں صحرائے وحشت بود مجنوں یارِ دیرینے
ز غم صد بار نالیدم، یکے نشنید فریادم
گلِ ایں باغ دارد ہم نوایاں گوشِ سنگینے
گہ و بے‌گاہ محوِ خوبی و رعنائی خویش ای
نیامد در نظر آئینہ را ہم چوں تو خودبینے
نہ باید میرؔ از سوزِ درونت ایں قدر غفلت
اہم است از پئے گرمیِ دل تدبیرِ تسکینے

۵۰۰

برآوردی خط و لیکن نمی بینم ز تو روئے
نمی دانم چہ در گوشت دمید اے شوخ بدگوئے

اس گلستان میں مجھ پر صد فصلِ گل گزر گئی
(مگر) ایک پل بھی خواہش کے مطابق اڑنا نصیب نہیں ہوا
اے گل بلبلِ شوریدہ کی بات سن
عاشق کے غم کی حکایت سننے کے لائق ہے
(ہم) تجھے چومنے کی آرزو میں جاں سے گزر گئے ہیں
اگر ہماری تربت پر آئے (تو افسوس میں) ہونٹوں کو کاٹتا ہوا آئے
کب تک گریباں چاک ہر کوچے میں گزرتے رہنا
تھوڑا سا میرؔ پیر کو دامن پر کھینچ

۴۹۹

یارب تھوڑی دیر کے لیے (اُس) سر بہ سر کینہ ترک کو میرے مقابل کر
جو اپنے ہی خون کو دامنِ زیں پر افشاں کر کے آتا ہے
الٰہی ایک بالکل حور (کی طرح) گل اندام سے ربطِ خاص
(جو) شاد دل، خوش بیاں ندیم، رنگیں شعر (کی طرح) ہے
اس کے عہد میں اسلام کی رسم کہاں باقی رہ سکتی ہے
اس کا خرام ایماں کا دشمن، اس کی گفت گو دین کی رہزن
اس کی موت کا داغ دل سے زندگی بھر نہیں جائے گا
اس وحشت کے صحرا میں مجنوں ایک یارِ دیرینہ تھا
غم سے سو بار رویا، کسی نہ بھی میری فریاد نہیں سنی
(اے) ہم نوا، اس باغ کے گل سنگین گوش[1] ہیں
(تو) گاہ و بے گاہ اپنی خوبی اور رعنائی (کو دیکھنے) میں محو ہے
آئینے کی نظر میں تجھ جیسا خود بین نہیں آیا
میرؔ (تجھے) اپنے سوزِ دروں سے اس قدر غفلت نہیں (کرنی) چاہیے
دل میں جوشِ محبت کے لیے تسکین کی تدبیر اہم ہے

۵۰۰

تیرا خط ظاہر ہو گیا مگر میں نے تیرا چہرہ (ایک بار بھی) نہیں دیکھا
(میں) نہیں جانتا اے شوخ کہ کسی بدگو نے تیرے کان میں کیا پھونکا ہے

---

[1] اونچا سننے والے۔

خدایا روزِ محشر درگذر از لطفِ بے پایاں
ز جرم بوریاپوشاں بہ حقِ آتشیں خوے
غرورِ حسن و خوبی دل نہ داد آں شوخ را ورنہ
بہ اندک لطف راضی می شدے چوں من تنک روے
بہ دورِ خطِ آں سرمایۂ جاں ہا چہ ہا دیدم
ولے ہر گز نیاوردم بہ روئے او سرِ موے
گریزے نیست میرؔ از مرگ امّا آرزو دارم
کہ افتد اتفاقِ مردنِ من بر سرِ کوے

۵۰۱

میرؔ ہر لحظہ چشم تر داری
روے خوبے کہ در نظر داری
بر درِ کس نشیں کہ آسائی
سخت دردِ سر است سرداری
پُر بہ حالِ خودم، نہ باید داشت
از من امیدِ نازبرداری
دست از جاں بشو کہ شرط افتاد
در محبت ولا جگرداری
ہر سحر گرمِ نالہ ای بلبل
بوکہ زآں گل تو ہم خبرداری
نہ شوی اے شراب خانہ خراب
ہر طرف عالمِ دگر داری
عبرت از سرگذشتِ قاروں گیر
بد بلاے ست میرؔ زرداری

خدایا روزِ محشر میں لطفِ بے پایاں سے معاف کردے
بوریا پوشوں کے جرم کو ایک آتشیں خو کے صدقے میں
حسن وخوبی کے غرور نے اس شوخ کو اجازت نہیں دی ورنہ
تھوڑی سی مہربانی سے مجھ جیسا تنگ رو[1] راضی ہو جاتا
اس سرمایۂ جان کے خط کے دور میں کیا کیا دیکھا
لیکن اس کے منھ پر کچھ نہیں کہا
مرنے سے گریز نہیں ہے میرؔ لیکن آرزو رکھتا ہوں
کہ میرے مرنے کا موقع کسی کے کوچے میں آئے

۵۰۱

میر (تو) ہر لحظہ آنسو بھری آنکھیں رکھتا ہے
کس کا خوبصورت چہرہ نظر میں رکھتا ہے
کسی کے در پر بیٹھ جا کہ آرام کرسکے
سر رکھنا سخت دردِ سر ہے
میں اپنے ہی حال میں بہت الجھا ہوا ہوں، نہیں رکھنی چاہیے
مجھ سے ناز برداری کی امید
جان سے ہاتھ دھولے کہ لازم کیا گیا ہے
اے دل محبت میں جگر داری کو
ہر سحر (تو) گرم نالہ ہے اے بلبل
اس لیے کہ تو بھی اس گل کی خبر رکھتا ہے
اے شرابِ خانہ (تو) ویران نہ ہو
(کہ) ہر سمت ایک اور ہی کیفیت رکھتا ہے
قاروں کی سرگزشت سے عبرت حاصل کر
دولت رکھنا میرؔ بڑی مصیبت ہے

---

[1] صاحب شرم۔

۵۰۲

کردم از بادہ منع و نشنیدی
خواجہ، آخر فقیر گردیدی
کوہکن ہمتِ ترا عشق است
ایں بلا را چہ سہل برچیدی
دل عجائب رسالہ بودہ ست
حیف اوقات گر نہ فہمیدی
گفتنِ غم دماغ می خواہد
لطف کردی کہ حال پرسیدی
میرؔ نے زور داشتی نے زر
بہ چہ سرمایہ عشق ورزیدی

۵۰۳

اے اشک گر از دیدۂ گریاں بدر آئی
یارب کہ بہ صد شیوۂ طوفاں بدر آئی
خواہیم کہ یک جمعہ تو اے واعظِ مسجد
از مےکدہ دستار پریشاں بدر آئی
تا کے بہ تنم رنج کشی جانِ المناک
اے کاش از ایں منزلِ ویراں بدر آئی
دانم کہ پس از قتلِ من اے دشمنِ جاں ہا
از معرکہ بسیار پشیماں بدر آئی
چوں میرؔ درّد شیخ گریبانِ قبا را
از خانہ اگر برزدہ داماں بدر آئی

۵۰۴

از جدولِ شمشیرِ تو ہر سینہ کبابے
دارد بہ دلِ خویش تمنا دمِ آبے

۵۰۲

میں نے شراب سے منع کیا تھا مگر تو نے نہیں سنا
خواجہ، آخر تو فقیر ہو گیا

کوہکن تیری ہمت کو شاباش ہے
اس بلا کو (تو نے) کتنی آسانی سے جھیلا

دل ایک عجیب کتاب تھا
افسوس، اگر (اس کی) قدر تو نے نہیں جانی

غم کا حال سنانے کے لیے ہوش چاہیے
تو نے حال پوچھا تو مہربانی کی

(تو اے) میرؔ نہ زور رکھتا تھا نہ زر
(تو نے) کس بھروسے پر عشق اختیار کیا

۵۰۳

اے اشک اگر (تو) دیدۂ گریاں سے باہر آتا ہے
خدا کرے کہ (تو) سو طوفان کے انداز میں نکلے

ہم چاہتے ہیں کہ ایک جمعہ تو اے واعظِ مسجد
مے کدے سے بکھری ہوئی دستار کے ساتھ باہر نکلے

(اے) جانِ الم ناک کب تک (تو) میرے بدن میں رنج اٹھائے گی
اے کاش (تو) اس منزلِ ویراں سے باہر نکل جائے

جانتا ہوں کہ میرے قتل کے بعد اے جانوں کے دشمن
(تو) معرکہ سے بہت پشیماں باہر نکلے گا

میرؔ کی طرح شیخ (بھی) قبا کا گریباں پھاڑے
اگر تو گھر سے دامن اٹھائے ہوئے باہر نکل آئے

۵۰۴

تیری شمشیر کی جدول[1] سے ہر ایک جس کا سینہ جلا ہوا ہے
اپنے دل میں ایک گھونٹ پانی کی تمنا رکھتا ہے

---

[1] پانی کی نہر۔

از دیر شعارِ منِ غم دیده سکوت است
نے خواندنِ شعرے و نہ مذکورِ کتابے
تا چند بدیں حال کسے زندہ بماند
یا خشم و خطابے ز تو یا ناز و عتابے
صد بار ز بےتابیٔ دل نامہ نوشتم
یک مرتبہ ممتاز نہ کردی بہ جوابے
گر چشم کشایم بہ نظر ہیچ نیابد
ایں ہستیِ من بر سرِ آب است حبابے
روئے سخن از زشتیِ اعمال نہ دارم
ظلم است کہ از بندہ بگیرند حسابے
از میرؔ بہ پرہیز کہ چوں او بہ جہاں نیست
رسواشدہ اے، در بہ درے، خانہ خرابے

۵۰۵

گر بہ قدرِ بےقراری بےقراری کردمے
از زمیں تا آسماں فریاد و زاری کردمے
ہائے آدم ایں قدر ہم بےمروّت می شود
گر چنیں دانستمے کے با تو یاری کردمے
گر نمی کردم حیا زیں دینِ میراثِ پدر
سبحہ را بگسستمے، زنارداری کردمے
آہ از آں شوخے کہ بر من می گرفتے راہ و من
با ہزاراں خونِ دل دامن گذاری کردمے
کاش آگہ می شدم از سست عہدی ہاے یار
تا بہ وقتِ دادنِ دل استواری کردمے
چند روزے شد کہ دل افسرد ورنہ پیش از ایں
در شبِ آدینہ اکثر بادہ خواری کردمے

دیر سے مجھ غم دیدہ کا شعار سکوت ہے
نہ شعر پڑھنا اور نہ کسی کتاب کا ذکر
کوئی اس حال میں کب تک زندہ رہے گا
یا تیری طرف سے غصّہ اور گالیاں یا ناز اور عتاب
سو مرتبہ دل کی بے تابی کی وجہ سے خط لکھا
تو نے ایک بار جواب سے سرفراز نہیں کیا
اگر آنکھ کھولتے ہیں نظر میں کچھ نہیں آتا
میری یہ ہستی روئے آب پر حباب (کی سی) ہے
(میں) اعمال کی خرابی (کی وجہ) سے بولنے کی مجال نہیں رکھتا
ظلم ہے کہ (اِس) بندے سے حساب لیا جائے
میرؔ سے دور رہ کہ اس جیسا جہان میں نہیں
کوئی رسوا، در بہ در، خانہ خراب

۵۰۵

اگر میں بے قراری کی حد تک بے قراری کرتا
زمیں سے آسمان تک فریاد وزاری کرتا
ہائے انسان بھی اتنا بے مروّت ہوسکتا ہے
اگر میں یہ جانتا کب تجھ سے یاری کرتا
اگر (میں) اس میراثِ پدر دین کا پاس نہیں رکھتا
سبحہ کو توڑ دیتا، زنّار داری کرتا
آہ اس شوخ سے کہ جس نے مجھ پر راستہ بند کر دیا ہے، اور میں
ہزاروں خونِ دل سے دامن گذاری کرتا ہوں
کاش دوست کے وعدے کی ناپائیداریوں سے آگاہ ہوتا
تا کہ دل دیتے وقت (وعدے کی) پختگی کا (خیال) کیا ہوتا
کچھ دن سے دل افسردہ ہوں اور نہ اس سے پہلے
(میں) جمعہ کی شب اکثر بادہ خواری کیا کرتا تھا

شد مشبہ نقشِ پا با چشم از افتادگی
کاش من ہم شیوۂ خود خاکساری کردمے
نیست ایں دیوانگی امروزہ، دستم سوئے جیب
آں زماں می شد کہ من دامن سواری کردمے
مصلحت در ضبط خود می بینم اکنوں ورنہ من
دیدمے سوئے تو و بےاختیاری کردمے
حالیا نے سینہ کاوی نے جگر چاکی ست میرؔ
یادِ ایامے کہ ہر دم تازہ کاری کردمے

۵۰۶

رنگ ہا بے تو دیدہ اند بسے
جامہ در خوں کشیدہ اند بسے
من نہ زیں باغ داغ بر جگر ام
گل بدیں رنگ چیدہ اند بسے
یک رہ اے مایۂ حیات برس
کہ بہ مردن رسیدہ اند بسے
از پئے رفتگاں ہلاک مشو
آں غزالاں رمیدہ اند بسے
چند روزے مزاج گوئی کن
میرؔ صاحب کبیدہ اند بسے

۵۰۷

ما را ولے ست در بر آئینہ دارِ نازے
مستغنی المزاجے، از خلق بےنیازے
در بزمِ ما نشینی افسردہ چند زاہد
شعرے بہ شدّ و مدّے، وجدے بہ سوز و سازے

عاجزی سے نقش پا آنکھوں سے مشتبہ ہو گیا
کاش میں بھی اپنا شیوہ خاکساری (اختیار) کرتا
یہ دیوانگی آج کی نہیں ہے، میرا ہاتھ گریباں کی طرف
اس زمانے میں (بھی) تھا جب میں دامن سواری[1] کرتا تھ
اب اپنے آپ کو قابو میں رکھنے میں مصلحت سمجھتا ہوں، ورنہ میں
تیری طرف دیکھتا تھا اور بے اختیار ہو جاتا تھا
اب نہ سینہ کاوی، نہ جگر چاکی ہے میرؔ
ان دنوں کو یاد (کرتا ہوں) کہ جب ہر وقت تازہ کاری کرتا تھا

۵۰۶

(لوگوں نے) تیرے بغیر بہت سے رنگ دیکھے ہیں
اور جامے کو خون میں بہت رنگا ہے
میں (ہی) اس باغ سے جگر پر داغ نہیں رکھتا ہوں
گل نے بھی ایسے ہی بہت سے رنگ چنے ہیں
ایک بار اے مایۂ حیات پہنچ
کہ بہت سے مرنے کے قریب پہنچ گئے ہیں
جانے والوں کے لیے جان مت دو
وہ غزال بہت دور جا چکے ہیں
کچھ دن اچھی طرح پیش آ
میرؔ صاحب بہت غمگین خاطر ہیں

۵۰۷

ہمارا دل ایک ناز کے آئینہ دار کی آغوش میں ہے
(جو) بے پروا مزاج، خلق سے بے نیاز (ہے)
(اے) زاہد، (تُو) ہماری بزم میں کب تک افسردہ بیٹھا رہے گا
شد و مد سے کوئی شعر (پڑھ)، سوز و ساز سے کسی وجد (میں آ)

---

[1] بچوں کا گھڑسواری کا کھیل۔ دونوں پاؤں کے درمیان سے دامن نکال کر کھیلنا۔

گردش سپہر دارد حسبِ اشارۂ او
چوں روزگار نبود امروز طاس بازے
یک بار شب‌نشیناں از من تواں شنیدن
دارم بہ لب از آں مو افسانۂ درازے
تو شاد زندگی کن از غم ترا فراغ است
من چوں زِیم کہ دارم اندوہِ جاں‌گدازے
در عشقِ جامہ‌زیباں ناکام بس کہ ماندم
دارد ز خونِ خواہش دامانِ دل طرازے
شاید کہ بر نہ خیزد چوں من از ایں بیاباں
بے پا و سرخرابے، آوارہ، ہرزہ تازے
مشکل اگر بدیں ساں ایں رخنہ دیر ماند
ہر لحظہ می تراود از چاکِ سینہ رازے
شد کشتہ میرؔ و افسوس از کثرتِ خلائق
دستم نہ داد ہرگز بر نعشِ او نمازے

۵۰۸

ہر زماں غم می خوری ہر دم ملالت می کشی
اے سرت گردم، نمی دانم چہ حالت می کشی
داشتن ہر دم زباں زیرِ زبانت خوب نیست
یاد باشد حرفِ من آخر خجالت می کشی
رو بہ شخصے کن کہ زنگ از دل برو در یک دمت
ورنہ چند آئینہ ساں رنجِ صقالت می کشی

۵۰۹

دانم کہ پس از مرگم رخسار بہ خوں شوئی
بسیار ز من گوئی، بسیار مرا جوئی
میرؔ از چہ نمی جوشی، تا چیست کہ خاموش ای
یک شعر نمی خوانی، یک حرف نمی گوئی

اس کے اشارے کے مطابق آسمان گردش کرتا ہے
زمانے کی طرح آج کوئی شعبدہ باز نہیں ہے
شب نشیں ایک بار (تو) مجھ سے سن سکتے ہیں
(میرے) لب پر اس کی زلف کا دراز افسانہ ہے
تو شاد زندگی کر تجھے غم سے فراغ ہے
میں کیسے زندہ رہوں کہ جاں گداز غم رکھتا ہوں
(میں) جامہ زیبوں کے عشق میں نہایت ناکام رہ گیا
خواہش کے خون سے دل کے دامن پر (الگ ہی) نقش و نگار (بنے) ہیں
شاید کہ مجھ جیسا اس بیاباں سے کوئی اور نہ اٹھے
شکستہ پا اور سر خراب، آوارہ، ہرزہ تاز
مشکل (ہو جائے گی) اگر یہ رخنہ دیر تک اسی طرح باقی رہ گیا
ہر لحظہ سینۂ چاک سے راز ٹپک رہا ہے
میرؔ قتل ہو گیا اور افسوس کثرتِ خلائق سے
اس کے جنازے پر مجھے نماز میسّر نہیں ہوئی

۵۰۸

(تو) ہر وقت غم کھاتا ہے ہر دم جھڑکیاں سنتا ہے
اے تیرے سر کے گرد پھروں، نہیں جانتا (کہ تو نے) کیا حالت بنائی ہے
ہر وقت طرح طرح کی باتیں کرتے رہنا اچھا نہیں
میری بات یاد رہے، آخر (تو) خجالت اٹھائے گا
ایسے شخص کی طرف رخ کر کہ ایک دم میں تیرے دل سے زنگ کو دور کر دے
ورنہ (تُو) کب تک آئینہ کی طرح صقیل ہونے کی تکلیف اٹھاتا رہے گا

۵۰۹

جانتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تو رخسار کو خون سے دھوئے گا
میرا بہت ذکر کرے گا، مجھے بہت تلاش کرے گا
میرؔ کیوں ولولہ نہیں دکھاتا، کیا بات ہے کہ (تو) خاموش ہے
ایک شعر نہیں پڑھتا، ایک حرف نہیں کہتا

۵۱۰

اے برق وش ز شوخیِ دل را کباب داری
از عمر ہم عزیز ای لیکن شتاب داری
گر دل بہ دل ربائے جائے نہ دادہ ای تو
بہرِ چہ میرؔ ہر دم چشمِ پُرآب داری

۵۱۱

از تپیدن سببِ رنج و عنا گردیدی
آخر اے دل خلۂ پہلوئے ما گردیدی
من نمی گفتمت اے میرؔ کہ ترکِ مے گیر
گفتۂ من نہ شنیدی و گدا گردیدی

۵۱۲

با خرامِ تو کام نکشودے
گر پری آدمی روش بودے
دیدم احوالِ میرؔ و داغ شدم
کاش مردے و عشق ننمودے

۵۱۳

داریم دلے خوں شدۂ مہر و وفائے
ہر لمحہ از اور رنجے و ہر لحظہ بلائے
اے رفتۂ مقصود توکّل کن و بنشیں
کز پائے طلب ما نہ رسیدیم بہ جائے

۵۱۴

گر تو اے پروانہ زیں ساں پیروِ من می کنی
چوں چراغِ صبح گاہی خانہ روشن می کنی

۵۱۵

خدا کند کہ تو ہم رفتۂ کسے گردی
برائے دیدنش اے بےوفا لبسے گردی

۵۱۰

اے برق وش تو نے شوخی سے دل کو (جلا کر) کباب کر دیا
تو زندگی سے بھی (زیادہ) عزیز ہے لیکن تجھے جلدی ہے
اگر تو نے دل کو کسی جگہ ایک دل ربا کو نہیں دیا ہے
(پھر) کس لیے (اے) میرؔ ہر دم تیری چشم پر آب رہتی ہے

۵۱۱

تڑپنے سے (تو) رنج و تکلیف کا سبب بن گیا
آخر اے دل (تو) ہمارے پہلو کا کانٹا بن گیا (ہے)
میں نے تجھے نہیں کہا تھا اے میرؔ کہ ترکِ شراب اختیار کر
میرا کہا نہیں سنا اور فقیر ہو گیا

۵۱۲

تیرے خرام سے مقصد حاصل نہ کر پاتی
اگر پری آدمی کی طرح ہوتی
(میں نے) میرؔ کا حال دیکھا اور غم زدہ ہوا
کاش (وہ) مر جاتا اور عشق کا اظہار نہ کرتا

۵۱۳

ہم مہر و وفا سے خون ہوا دل رکھتے ہیں
ہر لمحہ (اس کی وجہ) سے رنج اور ہر لحظہ بلا ہے
اے مقصود کے عاشق توکّل کر اور بیٹھ رہ
کہ پائے طلب سے ہم (تو) کسی جگہ نہ پہنچے

۵۱۴

اے پروانے اگر تو اسی طرح میری پیروی کرے گا
چراغِ صبح گاہی کی طرح گھر کو روشن کرے گا

۵۱۵

خدا کرے کہ تو بھی کسی کا عاشق ہو جائے
اسے دیکھنے کے لیے اے بے وفا بہت پھرے

۵۱۶

دل اگر با من دو ، روزے ساختے
عشقِ خوباں کے چنیں بد باختے

۵۱۷

شدم بیزار از عشقِ مجازی
نمی آید ز من ایں بچّہ بازی

۵۱۸

خدا ناکردہ شاید ربطِ دل با چوں خودے داری
کہ بےتابانہ چوں من ہر زماں آمدشدے داری

۵۱۹

مرا بس بود از پےٗ سیر و گشتے
گریبانِ کوہے و دامانِ دشتے
من اے ظلم کیشاں ز جاں دست شستم
بیارید نطعے و تیغے و طشتے
بہ ہر حرف دستے زدے میرؔ بر سر
شنیدم از او شب عجب سرگذشتے

۵۲۰

بگرد آمدند نقش نگارانِ چیں بسے
صورت نہ بست چہرۂ خوبِ تو از کسے

ضمیمۂ ردیف (ا) اشعارِ منسوخ

تاب کو رفتگانِ بےدل را
کہ بگیرند راہِ قاتل را
از غریقے چو من چہ آگاہی
خاکِ افتادگانِ ساحل را

۵۱۶

دل اگر دو دن میرے ساتھ نباہ کرتا
خوباں کا عشق کب مجھ پر اس طرح بدبختی لاتا

۵۱۷

میں عشقِ مجازی سے بیزار ہو چکا ہوں
مجھ سے یہ بچّہ بازی نہیں ہوتی

۵۱۸

خدا نہ کرے شاید تجھے کسی اپنے جیسے سے ربطِ دل (ہو گیا) ہے
کہ میری طرح ہر وقت بے تابانہ آنا جانا لگائے رکھتا ہے

۵۱۹

مجھے سیر اور گشت کے لیے بہت تھے
ایک کوہ کا گریباں اور ایک دشت کا دامن
میں نے اے ظالمو! جان سے ہاتھ دھو لیا ہے
نطعہ[1]، تیغ اور طشت لے آؤ
ہر بات پر میرؔ ہاتھ سے سر پیٹتا تھا
رات (میں نے) اس سے عجب سرگزشت سنی

۵۲۰

چین کے بہت سے نقش نگار یک جا ہوئے
تیرے خوب چہرے کی تصویر کسی سے نہیں بنی

ضمیمۂ ردیف (ا) اشعارِ منسوخ

نا امید عاشقوں کو تاب کہاں
کہ قاتل کا راستہ روک سکیں
میرے جیسے ڈوبنے والے کی کیا خبر
ساحل کے خاک افتادگاں کو

---

[1] چمڑے کی بساط جس پر مجرم کو بٹھا کر اس کی گردن ماری جاتی ہے۔

آہوانِ حرم چہ می دانند
ذوقِ زخمِ شکارِ بسمل را
شدہ تیغے بلند، کشتہ شدیم
ما نہ دیدیم روئے قاتل را
از تپش جانِ من بہ درد آورد
چہ بلا زد نہ دانم ایں دل را
کس بہ آں محملِ ناز نہ گفت
مشکلِ ایں خرابہ منزل را
چہ بگویم ز فرطِ شوقِ بتے
بندہ ام آں خدائے باطل را
زاں چہ در دشت رفت بر مجنوں
چہ خبر پردگیٔ محمل را
چوں گہر می برم بہ خود زیں بحر
گرہِ سختِ کارِ مشکل را
از دل و جانِ مہرورزاں پرس
کینۂ آں جوانِ جاہل را
سر کن اشعارِ ماتمِ دلِ میرؔ
بر مخواں واقعاتِ مقبل را

ضمیمۂ ردیف (د) اشعارِ منسوخ

ہر کہ بر حالِ من خستہ نظر خواہد کرد
درد مندانہ زبانِ مژہ تر خواہد کرد
میرؔ اے شیخ قدم بر قدمت رہ نہ رود
از سرِ کوچہ ترا دست بہ سر خواہد کرد

آہوانِ حرم کیا جانتے ہیں
شکارِ بسمل کے زخم کا مزہ
تیغ بلند ہوئی، ہم قتل ہو گئے
ہم نے قاتل کا چہرہ نہیں دیکھا
تپش سے جاں درد میں مبتلا ہو گئی
اس دل کو کس بلا نے مارا نہیں جانتا
کسی نے ناز کے اس محمل نشیں کو نہیں بتایا
اِس ویران منزل کی مشکل کے بارے میں
(ایک) بت کے لیے (اپنے) فرطِ شوق کا کیا کہوں
(میں) اس خدائے باطل کا بندہ ہوں
اِس کی (کہ) دشت میں مجنوں پر کیا گزری
محمل کی پردگی کو کیا خبر
اس بحر میں گہر کی طرح اپنے ساتھ لے جاتا ہوں
مشکل کے کام کی سخت گرہ کو
عشق اختیار کرنے والوں کے دل و جان سے پوچھ
اس نادان جوان کے کینہ کو
میرؔ کے دل کے ماتم کے اشعار شروع کر
مقبل[1] کے واقعات مت پڑھ

ضمیمۂ ردیف (د) اشعارِ منسوخ

جو بھی مجھ خستہ کے حال پر نظر کرے گا
دردمندی سے زبانِ مژہ تر کرے گا
میرؔ، اے شیخ، تیرے قدم بہ قدم راہ نہیں چلتا
(وہ) کوچے سے تجھے دست بہ سر کر دے گا

---

[1] صاحب اقبال، دولت مند۔

رباعیات

۱

گر بخت شود یار، روم در کعبہ
از شوق بہ ہر سوے دوم در کعبہ
بر قوتِ پا ضعف چو غالب آید
رو سوئے خدا، خاک شوم در کعبہ

۲

اے ختمِ رسلؐ چارہ ندارد دردم
بخشائے کہ جرمِ بےنہایت کردم
بر چہرۂ زرد خونم آید ہر دم
یعنی کہ ز فرطِ شرم سرخ و زردم

۳

کوتاہی اگر نمی کند عمرِ دراز
ایں مرتبہ میرؔ می روم سوئے حجاز
ان شاء اللہ قطرہ زن گریہ کناں
بر خاکِ مدینہ می نہم روئے نیاز

۴

چشمے در روزِ حشر داریم از توؐ
خواہیم خطِ شفاعت آریم از توؐ
نومید در آں مہلکہ ما را مگذار
اے سیّدنا امید داریم از توؐ

۵

خواہم کہ روم گریہ کناں سوئے نجف
زاں پیش کہ فرصت برود میرؔ ز کف
تا حشر بہ جاں منّت از او خواہد بود
گر چرخ در آں خاک مرا کرد تلف

۱

اگر قسمت میری یاوری کرے گی کعبہ میں جاؤں گا
شوق سے ہر طرف کعبہ میں سعی کروں گا
جب پاؤں کی طاقت پر ضعف غالب آ جائے گا
خدا کی طرف رخ کر کے کعبہ میں خاک ہو جاؤں گا

۲

اے ختم رسلؐ میرے پاس درد کا چارہ نہیں ہے
بخش دے کہ میں نے بے انتہا جرم کیے ہیں
میرے زرد چہرے پر خون ہر دم آتا ہے
یعنی کہ فرطِ شرم سے سرخ و زرد[۱] ہوں

۳

اگر عمر دراز کوتاہی نہ کرے
اس بار میں سوئے حجاز جاتا ہوں
ان شاء اللہ آنسو بہاتے، گریہ کرتے ہوئے
عاجزی سے خاک مدینہ پر سر رکھوں گا

۴

روزِ حشر تجھؐ سے امید رکھتے ہیں
چاہتے ہیں کہ تجھؐ سے شفاعت کا پروانہ لے آئیں
ہمیں اس مہلکہ[۲] میں ناامید مت چھوڑ
اے سیدناؐ تجھ سے امید رکھتے ہیں

۵

چاہتا ہوں کہ گریاں کناں سوئے نجف جاؤں
اس سے پہلے کہ مہلت ہاتھ سے نکل جائے
حشر تک اس کا (میری) جان پر احسان رہے گا
اگر آسمان مجھے اس خاک میں مٹا دے

---

[۱] نادم۔
[۲] ہلاکت کی جگہ۔

۶

قصدے دارم کہ کربلا را بینم
و آں مرقدِ پاکِ مرتضیٰؑ را بینم
زآں جا بہ ہمیں چشمِ سر ار عمر بود
خاکِ تہِ پائے مصطفیٰؐ را بینم

۷

یارب بہ حقِ حسینؑ جرمم بگذار
و ز خاکِ سیاہِ ہند زودم بردار
آیم چو گدایانہ من اندر عرصات
دستم بہ کفِ شاہِ شہیداںؑ بسپار

۸

اے ختمِ رسلؐ سخت در آزارم من
بے چارہ و بے یاور و بے یارم من
غیر از توؐ شفیع خود نہ پندارم من
پس پیشِ کہ ایں روئے سیہ آرم من

۹

یارب مگذار بے کس و بے پا را
آں دم کہ نہ داریم بہ محشر یارا
نیکی چو بہ جائے کس نہ کردیم ایں جا
آں جا بہ حسنؑ بخش گناہِ ما را

۱۰

مسلم ہر چند مجرم و بد باشد
شائستۂ بخشائشِ بے حد باشد
از گرمیِ خورشیدِ قیامت چہ غم اش
او سایہ رَوِ لطفِ محمدؐ باشد

۶

قصد رکھتا ہوں کہ کربلا کو دیکھوں
اور مرتضیٰؓ کے اس پاک مرقد کو دیکھوں
اس جگہ اگر زندگی رہے اپنی انہیں آنکھوں سے
مصطفیٰؐ کے پیروں کے نیچے کی خاک کو دیکھوں

۷

یارب حسینؓ کے واسطے میرا جرم معاف کر دے
اور مجھے ہند کی خاکِ سیاہ سے جلدی اٹھا
جب میں گدایانہ قیامت (کے دن) آؤں
میرا ہاتھ کفِ شاہِ شہیداںؓ کے سپرد کر

۸

اے ختمِ رسلؐ میں سخت آزار میں ہوں
بے چارہ اور بے یاور اور بے یار ہوں
میں تیرے سوا (کسی کو) اپنا شفیع نہیں سمجھتا
سو میں یہ روئے سیاہ (لے کر اور) کس کے سامنے جاؤں

۹

یارب بے کس و بے پا کو مت چھوڑ
اس وقت جب ہمیں محشر میں یارا نہیں ہو گا
(اس کے باوجود) کہ ہم نے یہاں کسی جگہ پر (کوئی) نیکی نہیں کی
اس جگہ حسنؓ کے صدقے میں ہمارا گناہ بخش

۱۰

مسلماں ہر چند کہ مجرم اور برا ہو
بے حد بخشائش کے قابل ہے
اسے خورشیدِ قیامت کی گرمی کا کیا غم
وہ محمدؐ کی مہربانی کے سایہ میں چلنے والا ہو گا

۱۱

رحمے اے خضرِ گم رہاں بر حالم
کز رفتنِ کارواں جفا پامالم
تنہائی و کم پائی و منزل بس دور
راہے چو جرس می روم و می نالم

۱۲

بود آں چہ نہ دیدنی در ایں جا، دیدیم
مکروہ کشیدیم و بلاہا دیدیم
اکنوں اے میرؔ چشم باید پوشید
دنیا دیدیم و اہلِ دنیا دیدیم

۱۳

منعم تا کے غرورِ مال و اسباب
دیروز نہ دیدی مگر اے خانہ خراب
شورِ من و ما بود کساں را کہ بہ سر
رفتند از ایں فسانہ یکسر در خواب

۱۴

تا بستہ ای اے عشق تو ما را بر کار
داریم مدام بےقراری در کار
ہر چند بہ صبر دل گرائید و لے
آں جنس نہ بود بابتِ ایں سرکار

۱۵

دیرے ست کہ غیر را تو بنواختہ ای
وز کیں بہ من اش دلیر تر ساختہ ای
اے ترکِ سیاہ چشم شرمست بادا
آہوئے حرم پیشِ سگ انداختہ ای

۱۱

اے گمراہوں کے خضر میرے حال پر رحم
کہ کارواں کے چلے جانے سے جفا کا پامال ہوں
تنہائی اور کم پائی اور منزل بہت دور
راستے میں جرس کی طرح جاتا ہوں اور روتا ہوں

۱۲

جو کچھ دیکھنے کے لائق نہیں دیکھنا تھا، اس جگہ دیکھا
ناپسند کو برداشت کیا اور بہت سی بلائیں دیکھیں
اب اے میرؔ آنکھیں موند لینی چاہییں
دنیا کو دیکھ لیا اور اہلِ دنیا کو دیکھ لیا

۱۳

(اے) مالدار کب تک مال و اسباب کا غرور
تو نے اے خانہ خراب گزشتہ کل کو نہیں دیکھا
جن کے سر میں من و ما کا شور تھا
اس فسانے سے یکسر خواب میں چلے گئے

۱۴

جب سے اے عشق تو نے ہمیں کام پر معمور کیا ہے
(ہم) ہمیشہ بے قراری سے کام رکھتے ہیں
ہر چند دل صبر کی طرف مائل ہوا لیکن
وہ جنس اس سرکار سے متعلق نہیں تھی

۱۵

مدت سے تو غیر کو پالے ہوئے ہے
اور دشمنی میں اس کو میرے خلاف اور زیادہ دلیر بنا دیا ہے
اے سیاہ مست ترک تجھے شرم آنی چاہیے
آہوئے حرم کو کتے کے آگے ڈال دیا ہے

۱۶

گفتم کہ شبے اے سببِ آسائش
ایوانِ مرا زیب دہ و آرائش
گفتا کہ ز بےصرفگیت شرمے نیست
با ایں لب و لہجہ میرؔ ایں فرمائش

۱۷

از تازہ دمیدنِ خطِ آں رخسار
افتاد ز فکر سیرِ سبزہ یک بار
بکشود صبا چوں گرہِ گیسوئے یار
شد سنبلِ تر موئے دماغِ گلزار

۱۸

جاں می رودم بہ شوقِ روے چو مہش
در بخت نہ بود دیدنِ جلوہ گہش
گر عزتِ من کنند یاراں پسِ مرگ
سازند عبیرِ کفنم خاکِ رہش

۱۹

جز جورِ رقیب چوں بہ کوئے تو نہ دید
جاں داد ز غم میرؔ و بہ سوئے تو نہ دید
غیرتِ عشاق را چنیں می باید
در روزِ وصال نیز روئے تو نہ دید

۲۰

سنگ است بہ نوکِ مژہ سفتن آساں
اما نہ بود عشق نہفتن آساں
زیں مشکلِ سخت کس بہ او ہیچ نہ گفت
حرفے ست کہ گفتہ اند گفتن آساں

۱۶

رات میں نے کہا کہ اے راحت کا سبب
میرے ایواں کو زیب دے اور (اس کی) آرائش کر
(اس نے) کہا کہ اپنی حماقت پر تجھے شرم نہیں آتی
اس لب ولہجہ کے ساتھ میرؔ یہ فرمائش

۱۷

اس رخسار پر تازہ خط نکلنے سے
سبزے کی سیر کا خیال بالکل جاتا رہا
صبا نے جب گیسوئے یار کی گرہ کھولی
سنبلِ ترگلزار کا موئے دماغ[1] ہوگیا

۱۸

تیرے چاند جیسے چہرے کے شوق میں جان جاتی ہے
قسمت میں کبھی اس کا جلوہ دیکھنا نہیں تھا
اگر میرے مرنے کے بعد (میرے) دوست میری قدر کریں
اُس کے راستے کی خاک کو میرے کفن کا عبیر[2] بنائیں

۱۹

جب (اس نے) رقیب کے ظلم کے سوا تیرے کوچے میں کچھ (اور) نہیں دیکھا
میرؔ نے غم میں جان دے دی اور تیری طرف نہیں دیکھا
عاشقوں کی غیرت اسی طرح ہونی چاہیے
وصل کے روز بھی (اس نے) تیرا چہرہ نہیں دیکھا

۲۰

پتھر کو پلکوں کی نوک سے پرونا آسان ہے
لیکن عشق کا چھپانا آسان نہیں ہوتا
اس سخت مشکل کے بارے میں کسی نے اسے کچھ نہیں بتایا
کہا جاتا ہے کہ وہ بات جو کہی گئی ہے، کہنا آسان ہے

---

۱ دماغ کا بال بمعنی وبال، ناپسندیدہ چیز۔
۲ ایک خشک خوشبو کا نام جو زعفران، صندل اور گلاب کو ملا کر تیار کر کے کپڑوں پر چھڑکتے ہیں۔

۲۱

بے شعلہ رخاں میرؔ بہ خود در جنگ ایم
داغ ایم و جگرسوختہ و دل تنگ ایم
القصہ کہ ما سینہ کبابانِ وفا
پروانۂ دلبرانِ شمعی رنگ ایم

۲۲

اے میرؔ تو در دامنِ آں مست آویز
تا از پۓ خونت بودش دست آویز
از دور چہ می خوری خدنگ جورش
نزدیک برو کہ او کندت شست آویز

۲۳

اے وائے مپرسید از آں سرگشتہ
خوں کردنِ میرؔ چوں مقرّر گشتہ
آویختہ از پیچشِ بےجا زلفش
ابرو کج باختہ، مژہ برگشتہ

۲۴

دیدارِ تو ہر کہ را میسّر گشتہ
بگزیدہ فقیری و بہ ہر در گشتہ
مالید بہ رو خاک و نمد در پوشید
آئینہ نہ دیدی کہ قلندر گشتہ

۲۵

گیرم کہ بہ دل غمِ نہانے داری
ہم جسم نزار و ناتوانے داری
افتاں خیزاں برو بہ بسمل گاہش
اے صیدِ زبوں، ہنوز جانے داری

۲۱

شعلہ رخوں کے بغیر میرؔ (ہم) اپنے آپ سے جنگ میں ہیں
داغ ہیں، جگر سوختہ اور دل تنگ ہیں
مختصراً ہم وفا سے جلا ہوا سینہ رکھنے والے
شمعی رنگ[۱] کے دلبروں کے پروانے ہیں

۲۲

اے میرؔ تو اس مست کے دامن کو چھیڑ
تا کہ اسے تیرے خون کے لیے جواز مل جائے
دور سے کیا اس کے ستم کے تیر کھا رہا ہے
نزدیک جا تا کہ وہ تجھے شست آویزہ[۲] کر دے

۲۳

اے وائے اس سرگشتہ[۳] کی (بابت) مت پوچھ
میرؔ کا خون کرنا جب مقرر ہو گیا
اس کی بلا سبب بل کھائی ہوئی زلف بکھری ہوئی (تھی)
تیوری چڑھی ہوئی (تھی)، نظریں پھری ہوئی (تھیں)

۲۴

جس کو تیرا دیدار میسّر ہوا
(اُس نے) فقیری اختیار کی اور ہر دروازے پر پھرا
منھ پر خاک ملی اور کمبل بدن پر ڈالا
(تو نے) آئینہ نہیں دیکھا کہ قلندر ہو گیا

۲۵

مان لیا کہ تیرے دل میں غم نہاں ہے
اور تیرا جسم بھی نزار اور ناتواں ہے
اس کی بسمل گاہ تک گرتے پڑتے پہنچ
اے صیدِ زبوں ابھی بھی تجھ میں جان ہے

---

۱ سیاہی مائل سبز رنگ۔
۲ سزا کا ایک طریقہ جس میں آدمی کو انگوٹھوں سے لٹکایا جاتا ہے۔
۳ حیران، بھٹکا ہوا۔

۲۶

تا بود شباب میرزائی کردم
طاقت ہمہ صرفِ خوش نمائی کردم
در شیب کفِ خاک بہ رو مالیدہ
چندے در کوئے او گدائی کردم

۲۷

از عزِ ورود بس مباہی کردی
درویشیِ من بدل بہ شاہی کردی
چشمم شدہ بود با سفیدی نزدیک
اے نامۂ یار خوش سیاہی کردی

۲۸

عزت طلبم، وقارِ خود خواہانم
سرکردۂ فرقۂ دل آ گاہانم
بر ظاہرِ فقرِ من نگاہے نہ کنی
من صدرنشینِ مجلسِ شاہانم

۲۹

اے میرؔ گر از اہلِ وفا می بودی
شائستۂ انواعِ جفا می بودی
ابنائے زماں زار ترا می کشتند
تا حال در ایں عرصہ کجا می بودی

۳۰

عمرے بہ نیازِ شام پرداختہ ام
عمرے با گریۂ سحر ساختہ ام
چوں خوب بہ خود رسیدہ ام محجوب ام
دیرےست کہ سر بہ پیش انداختہ ام

۲۶

جب تک شباب تھا (میں نے) ناز کیا
تمام طاقت (میں نے) خوش نمائی میں صرف کی
بڑھاپے میں کفِ خاک منھ پر ملے
کچھ دن (میں نے) اس کے کوچے میں گدائی کی

۲۷

تو نے (اپنے) آنے کی عزّت بخش کر (مجھے) اترانے والا بنا دیا
میری درویشی کو شاہی سے بدل دیا
میری آنکھ سفیدی کے قریب تھی[1]
اے نامۂ یار، تو نے خوب سیاہی بخشی

۲۸

(میں) عزّت طلب ہوں، اپنا وقار چاہنے والا ہوں
بیدار مغز لوگوں کے فرقہ کا سرکردہ ہوں
میرے ظاہراً فقر پر نگاہ مت کر
میں بادشاہوں کی مجلس کا صدر نشیں ہوں

۲۹

اے میرؔ اگر تو اہلِ وفا سے ہوتا
طرح طرح کی جفا کے قابل ہوتا
دنیا والے تجھے بری طرح قتل کر دیتے
اب تک تو اس دنیا میں کہاں ہوتا

۱۳۰

ایک مدت سے شام کے نیاز میں مشغول ہوں
ایک مدت سے گریۂ سحر کے ساتھ نباہ رہا ہوں
جب خود تک اچھی طرح پہنچا ہوں، شرمندہ ہوں
مدّت ہوئی ہے کہ سر سامنے جھکائے ہوئے ہوں

---

[1] میری آنکھ بے نور ہونے والی تھی۔

۳۱

راہے سر کن کہ بے ملامت باشد
نے آں کہ چو بگذری ندامت باشد
وارفتۂ حسنِ عمل امروز بشو
فرداست کہ بر سرت قیامت باشد

۳۲

شرمے کن و ترک کن خدادانی را
بردار چنیں بساطِ ایمانی را
تسبیح بہ کف چند بہ مےخانہ روی
رسوا مکن اے میرؔ مسلمانی را

۳۳

تمیز نہ ماند، ہرزہ تازی کردم
اوقات بسر بہ لہو و بازی کردم
ہر آن چو ناسازیِ ایّام افزود
چندے من ہم زمانہ سازی کردم

۳۴

عریاں ز لباسِ نام و ننگت کردند
شایانِ ہزار تلخ و سنگت کردند
نگذاری اگر جامہ، چہ سازی اے میرؔ
چسپاں پوشاں لبسے بہ تنگت کردند

۳۵

نے شعر بخواند و نے ترنّم کردہ
نے نالہ کشیدہ نے تظلّم کردہ
در رہ چو شدے دُچار ساکت در ماند
پیداست کہ میرؔ دست و پا گم کردہ

۳۱

اس راہ پر چل جس میں ملامت نہ ہو
اس کی طرح نہیں کہ جب گزر جائے (تو) ندامت ہو
آج حسنِ عمل کا عاشق بن
کل (ممکن) ہے کہ تیرے سر پر قیامت آ جائے گا

۳۲

شرم کر اور خدا دانی کو ترک کر
ایسی ایمان کی بساط کو اٹھا
ہاتھ میں تسبیح لیے کب تک مے خانے کو جائے گا
اے میرؔ اسلام کو رسوا نہ کر

۳۳

تمیز نہ تھی، (میں) فضولیات میں پڑ گیا تھا
اوقات کو لہو ولہب میں بسر کیا
جب بھی ایام کی ناسازی بڑھی
کچھ دن میں نے بھی زمانہ سازی کی

۳۴

تجھے نام وننگ کے لباس سے عریاں کر دیا
ہزار تلخ اور سنگ کے شایاں کر دیا
اگر جامہ نہیں اتارا[1] اے میرؔ کیا کرے گا
تنگ لباس پہنے والوں نے تجھے بہت تنگ کیا ہے

۳۵

نہ شعر پڑھا اور نہ گیت گایا
نہ نالہ کھینچا، نہ شور کیا
جب راستے میں سامنا ہوا خاموش رہ گیا
ظاہر ہے کہ میرؔ نے دست و پا کھو دیا

---

[1] جامہ گذاشتن = مرجانا۔

۳۶

مستِ انداز آں سراپا نازم
بےخود شدہ ام ولے بہ او دم سازم
در گردنِ اوست دستِ شوقم اکثر
گوئی اے میرؔ من صراحی بازم

۳۷

گہ چہرہ بیارائی و گہ روسازی
گاہے بہ خط و خالِ سیہ پردازی
آئی ہر دم بہ شکل دیگر در چشم
اے آئینہ رو مگر تو صورت بازی

۳۸

خصمِ دل و دین اند و بلاساز اند
با ایں ہمہ راست قامتی کج باز اند
امیدِ سلوک میرؔ از ایشاں غلط است
طفلانِ نیازدوست، محوِ ناز اند

۳۹

چوں شوقِ بت و بت کدہ وافر گردید
میر از حرمِ کعبہ مسافر گردید
در اولِ گام ترکِ اسلام نمود
آخر ایں تُرکِ سادہ کافر گردید

۴۰

با میرؔ کسے نہ گفت در روزِ نخست
کآں سخت کماں در پئے خوں کردنِ تست
از تیرِ جگرگدازش آخر جاں داد
و ز تربتِ او لالۂ پیکانی رست

۳۶

اس سراپا ناز کے انداز سے مست ہوں
بے خود ہو چکا ہوں لیکن اس کا دم ساز ہوں
اس کے گلے میں اکثر میرا دست شوق رہتا ہے
گویا کہ اے میرؔ میں صراحی باز ہوں

۳۷

کبھی تو نے چہرہ سجایا اور کبھی جھینپ گیا
کبھی (اپنے چہرے کو) سیاہ خط و خال سے آراستہ کیا
ہر دم نئی شکل میں آنکھوں میں آیا
اے آئینہ رو مگر تو صورت باز[1] ہے

۳۸

دین اور دل کے دشمن ہیں اور ستم ڈھانے والے ہیں
اس تمام راست قامتی کے باوجود ٹیڑھی چال چلنے والے ہیں
میرؔ ان سے نیک روی کی امید غلط ہے
نیاز دوست لڑکے ناز میں کھوئے ہوئے ہیں

۳۹

جب بت اور بت کدہ کا شوق بہت زیادہ ہو گیا
میرؔ حرمِ کعبہ سے روانہ ہو گیا
پہلے قدم پر ترکِ اسلام کیا
آخر یہ سادہ تُرک کافر ہو گیا

۴۰

کسی نے میرؔ سے روزِ اول نہیں کہا
کہ وہ سخت کماں[2] تیرا خون کرنے کے درپے ہے
آخر (وہ) اس کے جگر گزار تیر سے مرا
اور اس کی تربت سے لالۂ پیکانی اگا

---

[1] بہروپیا۔
[2] شہ زور۔

۴۱

تا کے شنوم آہ کرا یار بکشت
و ز تیغِ ستم یک دو سہ کس زار بکشت
از رشکِ شہیدانِ تو خوں گشت جگر
ایں درد مرا عاقبتِ کار بکشت

۴۲

حاجت بس پیشِ اہلِ دولت بردیم
کارے نہ کشود، عرضِ غیرت بردیم
برگشتہ از ایں طریقہ آخر دمِ مرگ
حیدرؑ گفتیم و رہ بہ جنّت بردیم

۴۳

غش تا بہ کجا ز درد، مژگاں تر کن
برخیز و فسانۂ محبت سر کن
شد روزِ غمت شام بسوزاں داغے
اے میرؔ چہ مردہ ای، چراغے بر کن

۴۴

آں ام کہ ز عرش استوا می آیم
یعنی ز حریمِ کبریا می آیم
گر رتبۂ من میرؔ نہ دانی بر جاست
معلومِ تو نیست کز کجا می آیم

۴۵

از کج رویِ سپہر، یاراں رفتند
در پردۂ خاک، غم گساراں رفتند
ایں ابلقِ چرخ دَد نہ یابد یارب
کز سرکشیش چہ شہسواراں رفتند

۴۱

کب تک سنوں آہ یار نے کس کو مار دیا
اور تیغِ ستم سے کن چند لوگوں کو بری طرح قتل کر دیا
تیرے شہیدوں پر رشک سے جگر خون ہو گیا
آخرِ کار مجھے اس درد نے مار ڈالا

۴۲

(ہم) اہل دولت کے سامنے حاجت لے کر بہت بار گئے
کام پورا نہ ہوا، عزّت چلی گئی
آخر دمِ مرگ اس طریقے کو چھوڑ کر
(ہم نے) حیدرؓ کہا اور جنّت کی راہ لی

۴۳

غم سے کب تک غشی، پلکیں تر کر
اٹھ اور فسانۂ محبت شروع کر
تیرا روزِ غم جلتے ہوئے داغ کی بدولت شام بن گیا
اے میرؔ کیا مردہ (سا پڑا) ہے، چراغ جلا

۴۴

میں وہ ہوں کہ عرش کے برابر سے آتا ہوں
یعنی حریمِ کبریا سے آتا ہوں
میرؔ اگر (تو) میرا رتبہ نہیں جانتا، بجا ہے
تجھے معلوم نہیں کہ کہاں سے آتا ہوں

۴۵

آسماں کی کج روی (کی وجہ) سے دوست یار چلے گئے
غم گسار خاک کے پردے میں چلے گئے
یارب، یہ چرخ کا ابلق[1] نامراد رہے
کہ اس کی سرکشی سے کیسے کیسے شہسوار (جان سے) چلے گئے

---

[1] سفید وسیاہ گھوڑا۔

۴۶

این جا که محیط بستہ کشتی باخیک
لب خشک شدم بہ پیش ترک و تاجیک
کس مردمیِ کاسۂ شربت نہ نمود
ناچار تلف شدم چو آبِ باریک

۴۷

دل بہرِ چہ صرفِ بےقراریؔ می شد
در خلق چرا رواجِ زاری می شد
دل خواہ ملاقات بہم می کردیم
اے کاشکے عشق اختیاری می شد

۴۸

بر خاکِ ورت ماندہ کسے روئے نیاز
می آید از آں خاک مرا بوئے نیاز
معلوم نہ شد ہیچ کہ با ایں ہمہ ناز
از بہرِ چہ مائل شدہ ای سوئے نیاز

۴۹

اے غیرتِ حور محوِ غروراى چہ قدر
پنہاں شدہ در عینِ ظہوراى چہ قدر
بر گو کہ بسازم بہ صبوری چہ قدر
نزدیکِ دل ای و آہ دوراى چہ قدر

۵۰

سنگم بہ سر از جور فلک می بارد
بر بسترِ آرام خسک می بارد
از چشمِ من آبِ شور آید ہر دم
یعنی کہ ز گریہ ام نمک می بارد

۴۶

اس جگہ (جہاں) کہ سمندر نے نہایت بخیلی کی تھی
(میں) ترک و تاجیک کے سامنے لب خشک تھا
کسی نے ایک پیالہ شربت کی (بھی) مروت نہیں دکھائی
ناچار میں آبِ باریک[1] کی طرح تلف ہو گیا

۴۷

دل کس لیے صرفِ بے قراری ہوا تھا
خلق میں کیوں رونے کا رواج رہا تھا
(ہم نے) دل خواہ ملاقات بہم کی ہوتی
اے کاش کہ عشق پر اختیار ہوتا

۴۸

تیرے در کی خاک پر کس نے روئے نیاز رکھا
اس خاک سے مجھے نیاز کی بو آتی ہے
کچھ بھی معلوم نہیں ہوا اس تمام ناز کے ساتھ
کس لیے تو نیاز کی طرف مائل ہوا ہے

۴۹

اے غیرتِ حور (تو) کس قدر غرور میں محو ہے
تو عینِ ظہور میں کس قدر پنہاں ہے
بتا کہ صبر پر کس قدر آمادہ رہوں
تو دل کے نزدیک ہے اور آہ کتنا دور ہے

۵۰

میرے سر پر آسماں کے ظلم سے پتھر برستے ہیں
آرام کے بستر پر کانٹے برستے ہیں
میری آنکھوں سے ہر دم نمکیں پانی نکلتا ہے
یعنی میرے رونے سے نمک برستا ہے

---

[1] ذرا سا پانی جو جلد خشک ہو جاتا ہے۔

۵۱

بر قدِ دل آرائے تو پُر می نازم
سرو و شمشاد را خجل می سازم
از شام گرفتہ تا سحر در گلزار
بالائے ترا بلند می اندازم

۵۲

چوں بارِ گرانِ عشق بر ما افتاد
در دامنِ ما ز چشم دریا افتاد
در شہر ز بس گریۂ خونیں کردیم
راہِ سیلابِ خوں بہ صحرا افتاد

۵۳

ہر لحظۂ فراق مردنے می خواہد
رنجِ بسیار بردنے می خواہد
دلِ بے تو بہ جا داشتن آساں نہ بوَد
دنداں بہ جگر فشردنے می خواہد

۵۴

واسوختہ گر از برِ او خواہم رفت
دانم بہ یقیں در سرِ او خواہم رفت
ور زندہ بمانم پئے عذرِ ایں جرم
با تیغ و کفن بر درِ او خواہم رفت

۵۵

یک بار مجرّداں و فرداں رفتند
از دائرہ سپہرِ گرداں رفتند
آفاق ز طالبانِ دنیا پُر شد
حمام زنانہ گشت، مرداں رفتند

۵۱

تیرے دل آرا قد پر بہت ناز کرتا ہوں
سرو اور شمشاد کو شرمندہ بنا دیتا ہوں
شام سے لے کر صبح تک گلزار میں
تیرے قد کی بہت زیادہ تعریف کرتا ہوں

۵۲

جب عشق کا بارِ گراں ہم پر پڑا
آنکھوں سے ہمارے دامن میں سمندر گرا
(ہم) شہر میں بے انتہا خون روئے
سیلابِ خون کی راہ صحرا سے جا ملی

۵۳

فراق میں ہر لمحہ مرنے کی خواہش کرتا ہے
بہت رنج اٹھانے کی خواہش کرتا ہے
تیرے بغیر دل کو ٹھکانے پر رکھنا آساں نہیں ہے
(وہ اپنے) دانت جگر پر گاڑنا چاہتا ہے

۵۴

اگر اس کے پاس سے جلا بھنا چلا جاؤں گا
مجھے اچھی طرح معلوم ہے، اس کے سر پر صدقے ہو جاؤں گا
اور (اگر) زندہ بچ گیا (تو) اس جرم کے عذر میں
شمشیر اور کفن کے ساتھ اس کے در پر چلا جاؤں گا

۵۵

اچانک سارے مجرّد اور فردا[1] چلے گئے
سپہرِ گرداں کے دائرے سے (باہر) چلے گئے
آفاق دنیا کے طلب گاروں سے بھر گیا
حمام زنانہ ہو گیا، مرد چلے گئے

---

[1] اکیلا، تنہا۔

۵۶

طفلی ہمہ اے میرؔ بہ غفلت بگذشت
برنائی من بہ عیش و عشرت بگذشت
در شیب جز افسوس کنوں نتواں کرد
مہلت کم ماند و وقتِ فرصت بگذشت

۵۷

زاہد کہ خیالِ روزۂ طے دارد
شیداست، سرِ زہد و وَرع کے دارد
میلش بہ کلہ بے سببے اکثر نیست
عمامہ گرو در عوضِ مے دارد

۵۸

در عہدِ جنوں بندہ بہ ہاموں بودم
گاہے در خاک و گاہ در خوں بودم
با چشمِ کم مبیں کہ من از مژگاں
جاروب کَشِ تربتِ مجنوں بودم

۵۹

بر ظاہرِ خوب کم نگہ باید کرد
ترکِ کجِ کردنِ کلہ باید کرد
خوبی آخر چو گل نہ خواہد ماندن
یک روز بساطِ ناز تہ باید کرد

۶۰

آں سادۂ خوانندہ کہ عودی رنگ است
ناسازمزاج است و بلا آہنگ است
چشمش کہ گرفتہ ترکِ مردم داری
بے پردہ فرو بردہ بہ خونم چنگ است

۵۶

بچپن تمام اے میرؔ غفلت میں کٹا
میری جوانی عیش وعشرت میں کٹی
بڑھاپے میں اب افسوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے
مہلت کم پڑ گئی اور فرصت کا وقت ختم ہو گیا

۵۷

زاہد جسے روزۂ طے[1] کا خیال ہے
دیوانہ ہے، زہد و ورع کے راز کب جانتا ہے
اس کی کلاہ سے محبت اکثر بے سبب نہیں ہے
(وہ) عمامہ شراب کے عوض گرو رکھتا ہے

۵۸

(میں) جنوں کے زمانے میں بیاباں کا غلام تھا
(میں) کبھی خاک پر اور کبھی خون میں پڑا ہوتا تھا
چشمِ کم سے مجھے مت دیکھ کہ میں پلکوں سے
تربتِ مجنوں کا جاروب کش تھا

۵۹

خوب صورت ظاہر پر بہت کم نگاہ ڈالنی چاہیے
کلاہ کج کرنے کو ترک کرنا چاہیے
حسن (بھی) گل کی طرح آخر باقی نہیں رہے گا
ایک روز بساطِ ناز تہ کرنی پڑے گی

۶۰

وہ سادہ گانے والا کہ سانولے رنگ کا ہے
بگڑے ہوئے مزاج کا ہے اور بلا آہنگ[2] ہے
اس کی آنکھوں نے رواداری ترک کر دی ہے
(اس نے) بے پردہ میرے خون میں اپنا ہاتھ ڈبو دیا ہے

---

[1] مسلسل تین دن کا روزہ، جس کے دوران صرف افطار کے وقت ذرا سا پانی پی لیا جاتا ہے۔
[2] قیامت کی آواز رکھنے والا، قیامت غضب۔

۶۱

زاہدپسرے ز دست و دل دم می زد
ز آوازِ گدا بہ ابرواں خم می زد
ہر گاہ لبِ ناں بہ فقیرے می داد
خرکرہ لکد بہ گورِ حاتم می زد

۶۲

مہرم بہ چنیں بلا ز نادانی بود
بدیمنیٔ ایں مدعیٔ جانی بود
آخر بہ کفم عنانِ آرام نہ ماند
شبدیزِ فلک ستارہ پیشانی بود

۶۳

اے میرؔ مشو دہ دِلہ، می باید رفت
ہر روز رود قافلہ، می باید رفت
ایں گونہ تعلق ز جنوں خالی نیست
بگستہ ز پا سلسلہ، می باید رفت

۶۴

آرام ز من مجو کہ آفت زدہ ام
راحت مطلب کہ سخت محنت زدہ ام
بر قامتِ او نہ گشتہ ام عاشق میرؔ
من دست بہ دامنِ قیامت زدہ ام

۶۵

دیدن بہ رخت چشم ترے می خواہد
رفتن بہ رہت ترکِ سرے می خواہد
من صیدِ بہ یک تیر ہلاک ام بگذار
آماجِ تو بودن جگرے می خواہد

۶۱

ایک زاہد پسر ہاتھ اور دل سے طاقت چھین لیتا تھا
گدا کی آواز پر تیوریاں چڑھاتا تھا
جب بھی روٹی کا ٹکڑا فقیر کو دیتا تھا
گدھے کا بچّہ حاتم کی قبر پر لات مارتا تھا

۶۲

میری محبت نادانی سے ایسی بلا بن گئی
اس کی نحوست جان کی دشمن ہو گئی
آخر میری ہاتھ میں آرام کی عنان نہ رہی
فلک کا شب دیز[۱] ستارہ پیشانی[۲] تھا

۶۳

اے میرؔ ڈھل مل یقین مت ہو، چلے جانا چاہیے
ہر روز قافلہ جاتا ہے، چلے جانا چاہیے
اتنا تعلق جنوں سے خالی نہیں ہے
پاؤں سے زنجیر توڑ کر چلے جانا چاہیے

۶۴

مجھ سے آرام مت مانگ کہ آفت زدہ ہوں
راحت مت طلب کر کہ سخت تکلیف زدہ ہوں
(اے) میرؔ میں اس کی قامت پر عاشق نہیں ہوا ہوں
میں نے دامنِ قیامت کو چھیڑا ہے

۶۵

تیرے چہرے کو دیکھنے کے لیے چشم تر چاہیے
تیری راہ پر چلنے کے لیے سر سے گزر جانا چاہیے
میں ایک تیر سے ہلاک ہونے والا شکار ہوں، (مجھے) رہنے دے
تیرے تیروں کا نشانہ بننے کے لیے جگر چاہیے

---

۱ مشکی گھوڑا۔
۲ وہ گھوڑا جس کی پیشانی پر سفید نشان ہو (اسے منحوس سمجھا جاتا ہے)۔

۶۶

آں شیوہ گزیں کہ اہلِ دل خوش دارند
سوئے تو ہمہ روئے توّجہ آرند
برگرد از آں طریقہ کآخر در وے
از ہم گذری چوں تو بہ رہ بسپارند

۶۷

بر بحثِ علوم میرؔ مائل گشتم
یعنی بسیار بر مسائل گشتم
کارے نہ کشود از نزاعِ لفظی
بستم لب ہائے خویش و قائل گشتم

۶۸

تا ہست جہاں گفت و شنیدے باقی ست
شبلؔی گر رفت، بایزیدؔے باقی ست
مردیم و گرفتیم بپا شد محشر
آں جا ہم آرزوئے دیدے باقی ست

۶۹

یک لختِ جگر داغِ شبابِ عمر است
دل سوختہ و سینہ کبابِ عمر است
باید برخاست، صبحِ پیری بدمید
کایں وقتِ غروبِ آفتابِ عمر است

۷۰

در عشق دلے جو کہ قرار آید از او
صبرے بہ ستمگاریِ یار آید از او
نے ہم چو دلِ بےجگرِ من بےتاب
دل می باید چناں کہ کار آید از او

۶۶

وہ ادائیں دکھانے والے جنھیں اہلِ نظر پسند کرتے ہیں
وہ سب تیری طرف (اپنی) توّجہ کا رخ کرتے ہیں
اُس راستے کو ترک کر کہ آخر اُس میں
مرنے پر تجھ جیسوں کو راستے میں ڈال دیتے ہیں

۶۷

(اے) میرؔ میں علوم کی بحث پر مائل ہو گیا
یعنی کتابوں کا بغور مطالعہ کیا
لفظی نزاع سے (تو) کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا
(میں نے) اپنے ہونٹ سی لیے اور قائل ہو گیا

۶۸

جب تک دنیا ہے گفت وشنید باقی ہے
شبلی اگر چلا گیا، بایزیدؔ باقی ہے
ہم مر گئے اور مان لیا کہ محشر بپا ہو گیا
وہاں بھی دید کی آرزو باقی رہے گی

۶۹

سارے جگر پر عمر کی تیز روی کا داغ ہے
دل جلا ہوا ہے، سینہ زندگی نے جلا کر کباب کر دیا ہے
چلا جانا چاہیے صبحِ پیری ظاہر ہو گئی ہے
کہ یہ وقت آفتابِ عمر کے غروب ہونے کا ہے

۷۰

عشق میں وہ دل ڈھونڈ جس سے قرار آئے
یار کے ستم کرنے پر اس کو صبر آئے
نہ (کہ) میرے بے حوصلہ دل کی طرح بے تاب
دل وہ ہونا چاہیے کہ اس سے کام بنے

۷۱

ہمدم بنشیں کہ با تو حرفے دارم
در زیرِ فلک حالِ شگرفے دارم
از حادثہ می خورم شکستے ہر دم
جرمم نہ بود جز ایں کہ ظرفے دارم

۷۲

ہر چند مہ تمام نورے دارد
لیکن بہ رخت نسبت دورے دارد
بے پردہ میا بروں کہ چشمے نہ خوری
ایں تیرہ دروں دیدۂ شورے دارد

۷۳

در فرقتِ تو صبور باید گشتن
نے در طلبِ حضور باید گشتن
قربِ تو ز آدابِ محبّت دور است
بر گردِ سرت ز دور باید گشتن

۷۴

چشمم کہ بجاے اشک خوں می آرد
خونِ جگرِ من ز دروں می آرد
دیوانہ شدم ز بس کہ ماندم دل تنگ
ایں جاست ز کہ جوشِ غم جنوں می آرد

۷۵

عاشق چو شوی اشک فشانی دانی
ذوقِ ایں تلخ زندگانی دانی
من بے تو بہ جان ام و نمی دانی ہیچ
تو بے تو اگر دمے بمانی، دانی

۷۱

ہمدم بیٹھ کہ (مجھے) تجھ سے کچھ باتیں کرنی ہیں
(میں) زیرِ فلک عجیب حال رکھتا ہوں
زمانے کی گردش سے ہر دم صدمے اٹھاتا ہوں
اس کے سوا میرا کوئی جرم نہیں کہ ظرف رکھتا ہوں

۷۲

ہر چند کہ ماہ تمام نور ہے
لیکن تیرے چہرے سے دور کی نسبت رکھتا ہے
بے پردہ باہر مت آ کہ (کہیں تجھے) نظر نہ لگ جائے
یہ سیاہ باطن (ماہ) نظرِ بد رکھتا ہے

۷۳

تیری فرقت میں صابر ہو جانا چاہیے
نہ (کہ) حاضر باشی کی طلب میں پھرنا چاہیے
تیرا قرب آدابِ محبت سے دور ہے
دور سے تیرے سر کے گرد پھرنا چاہیے

۷۴

میری آنکھ اشک کے بجائے خون روتی ہے
میرے جگر کا خون سینے سے باہر لاتی ہے
دیوانہ ہو گیا ہوں کہ (میں) نہایت رنجیدہ رہتا تھا
یہ حال ہے کہ جوشِ غم سے جنوں ہو جاتا ہے

۷۵

جب عاشق ہو گا تو اشک فشانی کو سمجھے گا
اس تلخ زندگی کا مزہ جانے گا
تیرے بغیر میری جان پر بنی ہے اور تو کچھ نہیں جانتا
اگر تو اپنے بغیر ایک دم بھی رہے، (تب) تجھے پتا چلے

۷۶

گاہے از خلق بےخبر می باشم
گاہے از خویشتن بدر می باشم
بے روئے تو حالات عجائب دارم
ہر لحظہ بہ عالمِ دگر می باشم

۷۷

ہر چند فقیر ایم و ہوس ما را نیست
دل را میلِ محبتِ دنیا نیست
لیکن با ایں شکستہ پائی، داریم
طولِ اَملے کہ آں سرش پیدا نیست

۷۸

شیب آمدہ ناگاہ بباید رفتن
زیں منزلِ خوش آہ بباید رفتن
پیری بسیار جائے خوف است اے میر
ایں جا بہ عصا راہ بباید رفتن

۷۹

بر سروقدانِ شہر مائل گشتم
محوِ ماہانِ دیدہ منزل گشتم
در حرص و ہوا رفت شبابم ہمہ میر
از عمرِ گذشتہ آہ غافل گشتم

۸۰

در عشق بہ مرگِ خود طرف باید شد
شمشیرِ جفاش را علف باید شد
نے تابِ وصالِ اوست نے طاقتِ ہجر
در ہر صورت مرا تلف باید شد

۷۶

کبھی خلق سے بے خبر ہو جاتا ہوں
کبھی اپنے آپ سے گزر جاتا ہوں
تجھے دیکھے بغیر عجیب حال میں ہوں
ہر لحظہ کسی اور ہی عالم میں ہوتا ہوں

۷۷

ہر چند فقیر ہیں اور ہمیں ہوس نہیں ہے
دل کو دنیا کی محبت سے تعلق نہیں ہے
لیکن اس شکستہ پائی کے باوجود، (ہم) رکھتے ہیں
طولِ امل[۱] جس کا سرا نظر نہیں آتا

۷۸

بڑھاپا آ گیا اچانک جانا پڑے گا
اس عمدہ منزل سے آہ جانا پڑے گا
بڑھاپا بہت خوفناک جگہ ہے اے میرؔ
اس جگہ عصا کے ساتھ راستہ چلنا پڑے گا

۷۹

(میں) شہر کے سرو قدوں پر مائل تھا
(میں) آنکھوں میں گھر کرنے والے معشوقوں میں کھویا ہوا تھا
حرص و ہوا میں میری ساری جوانی چلی گئی میرؔ
گزرتی ہوئی عمر سے آہ غافل ہو گیا تھا

۸۰

عشق میں اپنی موت کی طرف ہو جانا چاہیے
اس کی جفا کی شمشیر کا لقمہ بن جانا چاہیے
نہ اس کے وصل کی تاب ہے، نہ ہجر کی طاقت
ہر صورت میں مجھے تلف (ہی) ہو جانا ہے

---

[۱] امید کی طوالت۔

۸۱

از رفتنِ یاران و رفیقاں ناگاہ
مانندِ جرس ماند بہ لب نالہ و آہ
بعد از چندے سکوت من ہم کردم
بسیار غریبانہ گذشتم زیں راہ

۸۲

ہر لحظہ چو موج اضطرابے داری
ہر دم رفتارِ تند آبے داری
صرصر گوئیم یا کہ برقّت خوانیم
اے عمرِ عزیز بس شتابے داری

۸۳

از درد و الم چشمِ پُرآبے داری
وز سوزِ دروں دلِ کبابے داری
داری نظرے مگر بہ آں نرگسِ مست
اے میرؔ عجب حالِ خرابے داری

۸۴

بگذار کہ رو بہ مرگ یک بارہ کنیم
آں درد نہ داریم کہ ما چارہ کنیم
بیماریِ صعبِ عشق دارد دلِ ما
گر جامہ گذاریم، کفن پارہ کنیم

۸۵

ایں بود و نمودِ یک نفس ہم چو حَباب
در دیدۂ ہوش مند نقشے ست بر آب
ہر لحظہ چو موجِ بحر رفتن داریم
زاں پیش کہ جوئی و نہ یابی، دریاب

۸۱

رفیقوں اور یاروں کے اچانک چلے جانے سے
جرس کی طرح ہونٹوں پر نالہ اور آہ رہتی ہے
کچھ دنوں بعد میں نے بھی خاموشی (اختیار) کی
(اور) اس راہ سے انتہائی غریبانہ (طرز سے) گزر گیا

۸۲

(تو) ہر لحظہ موج کی طرح اضطراب رکھتی ہے
ہر دم تند آب کی رفتار رکھتی ہے
ہم (تجھے) صرصر کہیں، یا رو کر پکاریں
اے عمرِ عزیز (تُو تو) بس تیزی رکھتی ہے

۸۳

درد و الم سے آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں
اور سوزِ دروں سے دل جلا ہوا ہے
ضرور اس نرگسِ مست پر نظر ڈالی ہے
اے میرؔ (تو) عجب حالِ خراب میں ہے

۸۴

ہمیں چھوڑ دے کہ (ہم) موت کی طرف ایک بار رخ کر لیں
(ہم) وہ درد نہیں رکھتے کہ ہم (جس کی) دوا کریں
ہمارے دل کو عشق کا تکلیف دہ مرض ہے
اگر (ہم) مر گئے، کفن کو چاک چاک کر دیں گے

۸۵

یہ حباب کی سی ایک نفس کی بود و نمود
ہوش مند کی آنکھوں میں نقش بر آب ہے
(ہم) ہر لحظہ سمندر کی موج کی طرح گزرتے جاتے ہیں
اس سے پہلے کہ تو تلاش کرے اور نہ پائے، (ہمیں) پالے

۸۶

آں سرو کہ دل بر اوست مائل ایں است
جز جور ثمر نہ داشت حاصل ایں است
من دامنِ او بہ دست خواہم لیکن
ناید آساں بہ دست مشکل ایں است

۸۷

ہر قطعۂ خاک گلستانے بودہ ست
مرغِ گلزار خوش زبانے بودہ ست
ایں سنبل و گل را کہ تماشا کردی
از زلف و رخِ کساں نشانے بودہ ست

۸۸

ما گر بہ جہانِ آب و گل می گردیم
با طبعِ لطیف متصل می گردیم
جز نکتہ رسے کسے نہ یابد ما را
ما لذّتِ شعر ایم بہ دل می گردیم

۸۹

واعظ سرِ پیرت کہ مگو غیر از راست
طورم ز کجا و تہمتِ مے ز کجاست
من مست و خرابِ راہِ دورِ طلب ام
بے منتِ بادہ نشہ دارم کہ رساست

۹۰

شانم دلِ غیر ہر زماں می شکند
خوفم بہ دہانِ او زباں می شکند
امّا در پردہ از پئے ذلّتِ من
ہر روز و شب ایں سگ استخواں می شکند

۸٦

وہ سرو کہ جس پر دل مائل ہے، یہ ہے
جس کا ثمر ظلم کے سوا (کچھ) نہیں، حاصل یہ ہے
میں اس کا دامن اپنے ہاتھ میں (لینا) چاہتا ہوں، لیکن
(وہ) آسانی سے ہاتھ نہیں آتا، مشکل یہ ہے

۸۷

خاک کا ہر قطعہ گلستان رہ چکا ہے
مرغِ گلزار خوش زبان ہوتا تھا
یہ سنبل وگل جن کو (تو نے) دیکھا
کسی کے زلف ورخ کی نشانیاں ہیں

۸۸

ہم اگر آب وگل کے جہاں میں پھر رہے ہیں
طبعِ لطیف کے ساتھ لگا تار پھر رہے ہیں
سخن فہم کے سوا کوئی ہمیں نہیں پاتا
ہم شعر کی لذّت ہیں، دل میں پھر رہے ہیں

۸۹

واعظ تجھے تیرے پیر کے سر کی قسم سچ کے سوا (کچھ) مت کہہ
ہمارا طرز کہاں اور شراب کی تہمت کہاں
میں طلب کی طویل راہ میں مست اور خراب ہوں
شراب کے احسان کے بغیر (وہ) نشہ رکھتا ہوں جو کامل ہے

۹۰

میری شان ہر وقت غیر کا دل دہلاتی ہے
میرے خوف سے اس کے منہ میں زبان ہکلا جاتی ہے
لیکن در پردہ میری تذلیل کے لیے
ہر روز وشب یہ کتنا سخت محنت کرتا ہے

۹۱

ہر چند مرا قوتِ رفتار کم است
امّا ز رہِ صعبِ جدائی چہ غم است
با صد غم و رنج دل بہ جاے است ہنوز
ایں آبلہ یک رفیقِ ثابت‌قدم است

۹۲

در بستنِ لب جہدِ اتم می باید
یعنی کہ بہ فقر پاسِ دم می باید
بے گفتۂ دل راہ مرو تا مقدور
کفت و قدمت ہمرہ ہم می باید

۹۳

جاں را بہ غمِ تو چند خرسند کنم
تا کے دلِ پارہ پارہ پیوند کنم
بےتاب ام و ناچار بہ ضبط خویش ام
دفتر شو ار حال قلم بند کنم

۹۴

از شانہ مگو بہ صد زباں خاموش است
ز آئینہ مپرس کز حیا روپوش است
آرائشِ آں چہرہ نہ بندد صورت
مشاطہ ز اندازِ نگہ بےہوش است

۹۵

ہر چند کہ ما خستہ دلاں بدحالیم
روزانہ بگریم و شباں گہ نالیم
در سوزشِ الماس و نمک دست زنیم
آں دم کہ سرِ زخمِ دلِ خود مالیم

۹۱

ہر چند کہ میری قوتِ رفتار کم ہے
لیکن جدائی کی دشوار راہ کا کیا غم ہے
سینکڑوں غم و رنج کے باوجود دل ابھی تک اپنی جگہ پر (قائم) ہے
یہ آبلہ ایک ثابت قدم رفیق ہے

۹۲

ہونٹ سینے کے لیے تمام تر کوشش کرنا درکار ہے
یعنی کہ فقر کے ساتھ حبسِ دم کی ریاضت چاہیے
جب تک ممکن ہو دل کے کہے بغیر راہ مت چل
تیرے ہاتھ اور تیرے پیر بھی ہمراہ ہونے چاہییں

۹۳

جان کو تیرے غم سے کچھ خوش رکھوں
کب تک دلِ پارہ پارہ کو رفو کروں
بے تاب ہوں اور ناچار اپنے آپ کو ضبط کیے ہوئے ہوں
میرا حال ایک لمبی کہانی بن جائے اگر قلم بند کروں

۹۴

کنگھی کی بات نہ کر سو زبانوں کے باوجود خاموش ہے
آئینہ کی نہ پوچھ کہ شرم سے روپوش ہے
اس چہرے کی آرائش کی صورت نہیں بنی
مشاطہ[1] (اس کی) نگاہ کے انداز سے بے ہوش ہوگئی ہے

۹۵

ہر چند کہ ہم خستہ دل بدحال ہیں
دن میں روتے ہیں اور راتوں کو نالہ کرتے ہیں
اس کے الماس اور نمک کے برادے میں ہاتھ ڈالتے ہیں
جس وقت کہ اپنے دل کے زخم کو ملتے ہیں

---

[1] بناؤ سنگھار کرانے والی۔

۹۶

گر جانبِ او پریم، پر می سوزد
و ز چہرۂ روشنش نظر می سوزد
در وقتِ سکوتِ زآں لبِ سرخ مپرس
آں آتشِ خاموش جگر می سوزد

۹۷

ہر چند ز مفلسی اخیرِ وقت است
امّا ز غنا میرؔ، امیرِ وقت است
کارے بہ زرِ سرخ و سفیدش نہ بود
آں سکہ درست بے‌نظیرِ وقت است

۹۸

خار و خسِ ایں چمن بہ مژگاں رُفتیم
با ہر گل و غنچہ دردِ خود را گفتیم
چوں عقدۂ دل میرؔ از ایں‌ہا نہ کشود
پا بر سرِ پا فگندہ آخر خفتیم

۹۹

سرسبزیِ من از غمِ یاراں رفتہ
حیفے بہ فراقِ غم گساراں رفتہ
مانندِ تنِ زردِ من بہ آں کِشت کہ او
خواہد باران و وقتِ باراں رفتہ

۱۰۰

رونق نہ بود بے تو بہ کاشانۂ چشم
یعنی کہ نہ ماندہ دیدنی خانۂ چشم
اے مستِ مۓ ناز چو جایت خالی‌ست
از خونِ جگرِ پُر است پیمانۂ چشم

۹۶

(ہم) اگر اس کی جانب اڑیں، پر جل جاتے ہیں
اور اس کے روشن چہرے سے نظر جل جاتی ہے
خاموشی کے وقت اس کے لبِ سرخ کی مت پوچھ
وہ آتشِ خاموش جگر کو جلا دیتی ہے

۹۷

ہر چند کہ مفلسی میں آخری وقت (آ گیا) ہے
لیکن بے نیازی سے میرؔ امیرِ وقت ہے
سرخ و سفید زر سے اس کو کام نہیں ہے
وہ وضع دار (اپنے) وقت میں بے نظیر ہے

۹۸

(ہم نے) اس چمن کے خار و خس کو پلکوں سے چنا
(ہم نے) ہر گل و غنچہ سے اپنا درد کہا
جب میرؔ عقدۂ دل ان سب سے نہ کھلا
آخر (ہم) پیر پر پیر دھر کر سو گئے

۹۹

یاروں کے غم میں میری خوشی چلی گئی
گزرے ہوئے دوستوں کی جدائی کا افسوس ہے
میرا تنِ زرد کھیت کی طرح ہے کہ جو
بارش چاہتا ہے اور بارش کا وقت گزر چکا ہے

۱۰۰

کاشانۂ چشم میں تیرے بغیر رونق نہیں ہوتی
یعنی کہ خانۂ چشم دیکھنے کے لائق نہیں رہتا
اے مئے ناز سے مست جب سے تو نہیں ہے
خونِ جگر سے پیمانۂ چشم بھرا ہوا ہے

۱۰۱

دل را کہ دمے بہ رنج نگذاشتہ ایم
او شد ہمہ خون و دست برداشتہ ایم
و ایں چشم کہ چشمۂ روانے بودہ ست
از خاکِ سرِ راہِ تو انباشتہ ایم

رباعیِ مستزاد

۱۰۲

شورِ جاں کاہِ بلبل از جایم برد۔ ہنگامِ سحر
حالِ تبہ اش رواں بہ دردم آورد۔ داغ است نظر
رفتم دو قدم پیش و بسے پرسیدم۔خود ہیچ نہ گفت
رو سوئے گل آخر بہ ہماں حال بمرد۔ خوں کرد جگر

۱۰۳

برخیز و رخِ خود ز عمارت برتاب۔ دنیا است سراب
وایں ہستیِ موہوم تو مانندِ حباب۔ نقشےست بر آب
در فکر بناہاے غلط عمرِ عزیز۔ کردی ہمہ صرف
اکنوں زیں دشت درگذر چوں سیلاب۔ اے خانہ خراب

۱۰۴

با میرؔ ملاقات نمی کردم کاش۔ دیدم ہمہ جہل
باطل اوقات و بادہ خوار و اوباش۔ پر ناکس و سہل
وارفتۂ طفلگانِ تہ بازاری ۔بدنام و الوط
رند و بد وضع و سخت باز و قلّاش۔ جلف و نااہل

۱۰۱

وہ دل جسے (ہم نے) پل بھر کے لیے بھی رنج نہیں کرنے دیتے تھے
وہ تمام خون ہو گیا اور ہم نے ہاتھ اٹھا لیا ہے
اور یہ آنکھ کہ چشمۂ رواں رہی ہے
(ہم نے) تیری راہ کی خاک سے پاٹ دی ہے

رباعیِ مستزاد

۱۰۲

بلبل کے جانکاہ شور نے مجھے اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ ہنگامِ سحر
اس کے حالِ تباہ نے میرے دل میں درد پیدا کر دیا۔ نظر داغ ہے
(میں) دو قدم آگے بڑھا اور (میں نے) بہت پوچھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا
چہرہ پھول کی طرف (کر کے) آخر اسی حال میں مر گیا۔ جگر خون کر دیا

۱۰۳

اٹھ اور اپنا رخ عمارت کی طرف سے موڑ۔ دنیا سراب ہے
اور تیری یہ ہستیٔ موہوم حباب کے مانند۔ نقش بر آب ہے
عمارتوں کی فکر میں عمرِ عزیز۔ ساری غلط صرف کر دی
اب دشت سے سیلاب کی طرح گزر جا۔ اے خانہ خراب

۱۰۴

کاش میرؔ سے ملاقات نہیں کرتا۔ اسے بالکل جاہل پایا
باطل اوقات[1] اور بادہ خوار اور اوباش۔ نہایت نالائق اور نکما
بازاری لڑکوں کا وارفتہ۔ بدنام اور اوباش
رند اور بدوضع اور سخت باز[2] اور قلاش۔ خود سر اور نااہل

---

[1] فضول وقت ضائع کرنے والا۔
[2] جوئے میں جیتے بغیر نہ ہٹنے والا۔

مثنوی

مثنوی

اے صبا گر سوئے دہلی بگذری
ہم چو صرصر آہ مگذر سرسری
بوسہ دہ بر ہر قدم از سوئے من
بود بر آں خاک عمرے روئے من
بر مقابر آیۂ رحمت بخواں
در مساجد خدمتے از من رساں
ہم بکن پیدا جبینِ تازہ اے
سجدہ اے بر ہر سرِ دروازہ اے
وقفہ اے بر ہر سرِ کو ساعتے
بر در و بامش نگاہِ حسرتے
سیر کن طفلانِ تہ بازار را
اشتیاقم گو در و دیوار را
از مصیبت دیدگاں یادے بکن
زیرِ ہر دیوار فریادے بکن
پس نشانِ دوستانِ من بجو
حسن اگر بینی ز من عشقے بگو
بعد از آں بکشا سرِ ایں داستاں
یعنی آں سرخیلِ آفت دیدگاں
از وطن مہجور بے دل میرؔ نام
می کند از غم بکاے صبح و شام
نے خطِ شوقش ز یارے می رسد
نے پیامے از نگارے می رسد
زیرِ لب دارد شکایت خوں چکاں
کاے فلک رحمے بہ دورافتادگاں

مثنوی

اے صبا اگر دہلی کی طرف گزرے
صرصر کی طرح آہ سرسری مت گزرنا
ہر قدم پر میری طرف سے بوسہ دے
اس خاک پر ایک عمر میرا سر جھکا ہے
مقبروں پر آیۂ رحمت پڑھ
مساجد میں میری طرف سے سلام پہنچا
ساتھ ہی ایک تازہ پیشانی پیدا کر
(اور) ہر در کے اوپر ایک سجدہ (کر)
ہر کوچے میں ایک ساعت کا وقفہ
اس کے در و بام پر ایک حسرت کی نگاہ
بازار میں گھومنے والے لڑکوں کو دیکھ
میرا اشتیاق در و دیوار سے کہہ
مصیبت جھیلنے والوں کو یاد کر
ہر دیوار کے نیچے فریاد کر
پھر میرے دوستوں کا نشان ڈھونڈ
حسن کو اگر (تو) دیکھے میری طرف سے عشق[1] کہہ
اس کے بعد اس داستان کا آغاز کر
یعنی وہ آفت دیدگاں کا سردار
وطن سے دور، ناامید، میرؔ نام کا
غم میں صبح و شام آہ و زاری کرتا ہے
نہ (اسے) کسی دوست کا خطِ شوق آتا ہے
نہ کسی محبوب کا پیام پہنچتا ہے
زیرِ لب خوں چکاں حکایت رکھتا ہے
کہ اے فلک دور رہ جانے والوں پر رحم (کر)

---

[1] مرحبا۔

بے کس ام ہر دم ملالت می کشم
کس چہ داند من چہ حالت می کشم
زرد گشتم، زار گشتم، دل گداخت
آبِ فرقت با مزاجِ من نہ ساخت
یادِ یارانِ وطن از دل نہ رفت
تختۂ ام زیں ورطہ بر ساحل نہ رفت
بود ہر جاے کہ آبادانیے
گوش زد می گردوم ویرانیے
در چنیں ویرانہ نبود ضبطِ باب
ایں بنا باید رسانیدن بہ آب
یعنی از غم زار می باید گریست
ہر قدم بسیار می باید گریست
خانۂ بنشستہ گر منزل شود
از سرشک آں خاک باید گل شود
دیر سیرِ آں عمارت کردہ ام
ہر مقامے را زیارت کردہ ام
بر چنیں خاک ارنہ یاری دیر ماند
یک زماں خاکے بہ سر باید فشاند
باغِ ویرانے اگر پیش آیدت
چشمِ عبرت بیں کشودن بایدت
خار از جاے کہ سر برکردہ است
جلوہ ہا ایں جا گلِ تر کردہ است
باد از جاے کہ گرد انگیختہ
لالہ رنگِ تازہ ایں جا ریختہ
سالہاے سال بر آں گل زمیں
نرگسی زن ماندہ نرگس پیش از ایں

بے کس ہوں ہر دم رنج اٹھاتا ہوں
کس کو خبر میں کس حال سے گزر رہا ہوں
زرد ہو گیا، ناتواں ہو گیا، دل گھل گیا
فرقت کا پانی میرے مزاج کو راس نہیں آیا
یارانِ وطن کی یاد دل سے نہیں گئی
اس بھنور سے میری (کشتی) سے ایک تختہ بھی ساحل پر نہیں گیا
جس جگہ کی کوئی آبادی (ہوتی) تھی
وہاں سے ویرانی (کی خبر) ملی
ایسے ویرانے میں دروازے کا انتظام نہیں کیا جا سکتا
ایسی بنیاد کو تو پانی دینا چاہیے
یعنی غم سے زار زار رونا چاہیے
ہر قدم پر بہت زیادہ رونا چاہیے
گرا ہوا گھر اگر منزل ہو جائے
آنسوؤں سے اس خاک کو گل ہو جانا چاہیے
ایک مدت اس عمارت کی سیر کر چکا ہوں
ہر مقام کی زیارت کر چکا ہوں
اسی خاک سے تو بہت دنوں تک دوستی رہی
مدتوں سر پر خاک ڈال لینی چاہیے
اگر تیرے سامنے ویران باغ آئے
تجھے چشمِ عبرت کھولنی چاہیے
جس جگہ خار نے سر باہر نکالا ہے
اس جگہ گلِ تر جلوے دکھا چکا ہے
جہاں سے ہوا گرد اڑا رہی ہے
لالے نے اس جگہ تازہ رنگ بکھیرے تھے
اس سرسبز زمیں پر سال ہا سال
اس سے پہلے نرگس چشمک کیا کرتی تھی

هر کجا دل می شود از خود گداز
سایہ افگن بود آن جا سروِ ناز
گر کشائی چشم را بر برگِ زرد
یادِ سبزاں کن بہ صد اندوہ و درد
کآں نہالاں بزمِ عشرت داشتند
سر بہم آوردہ صحبت داشتند
عندلیبے گر نواسازی کند
و ز غمِ دل نالہ پردازی کند
گوش نہ بر نالہ و افغانِ او
آں گہے آویز در دامانِ او
او بہ تو احوال خواہد وا نمود
گل در ایں جا بود، آں جا لالہ بود
گر چہ اکنوں باغ صحرا شد ولے
سرو ایں جا بود، آں جا جدولے
چشمکِ نرگس دل از کف می ربود
زلف را از تارِ سنبل می کشود
گل رخاں دل شاد جامے می زدند
ہر طرف مستانہ گامے می زدند
چشمِ ساقی فتنہ می انگیختے
خونِ مینا دم بہ دم می ریختے
وقتِ خود احباب خوش می داشتند
ایں روش دیدند و جا بگذاشتند
ناگہاں آں بزمِ خرّم بر شکست
آں شراب افتاد و آں ساغر شکست

جس جگہ دل خود سے پگھل جاتا ہے
اس جگہ سروِ ناز سایہ ڈالے ہوئے تھا
اگر (تو) برگِ زرد پر نظر ڈالتی ہے
سانولے رنگ کے محبوبوں کو سیکڑوں رنج و غم کے ساتھ یاد کر
کہ وہ نوجواں بزمِ عشرت میں جاتے تھے
مل جل کر کر صحبت رکھتے تھے
عندلیب اگر نوا سازی کرتی تھی
تو غمِ دل سے نالہ کو پُراثر بناتی تھی
اس کے نالہ و فغاں کو سن
اس وقت اس کے دامن کو تھام
وہ تجھے کھل کر حال بتائے گی
اس جگہ گل تھا، اس جگہ لالہ تھا
اگرچہ اب باغ صحرا ہو گیا ہے، لیکن
اس جگہ سرو تھا، اس جگہ نہر تھی
نرگس کی چشمک ہاتھ سے دل کو اڑا لے جاتی تھی
زلف کو تارِ سنبل سے کھولتی تھی
گل رخ دلشاد (ہو کر) جام چڑھاتے تھے
ہر طرف مستانہ (انداز میں) قدم رکھتے تھے
ساقی کی آنکھیں فتنہ اٹھاتی تھیں
دم بدم خونِ مینا بہاتی تھیں
احباب اپنا وقت خوشی کے ساتھ گزارتے تھے
یہ روش[1] دیکھی اور چل نکلے
ناگہاں وہ خوش و خرّم بزم اجڑ گئی
وہ شراب بہہ گئی اور وہ ساغر ٹوٹ گیا

---

[1] باغ کی پٹری۔

چشمِ گل پوشیدہ شد، ہم آب رفت
سبزۂ تر دیر شد در خواب رفت
نے گل و نے لالہ و نے سروِ باغ
ماندہ ام من با ہزاراں درد و داغ
نالہ اے از درد گاہے می کشم
گاہ گاہ از سینہ آہے می کشم
کار دارم با سکوت و غم کشی
دم کشے کو تا نمایم دم کشی
من ہم از شوقِ وطن دل خستہ ام
ورنہ عمرے شد کہ لب را بستہ ام
کو دماغ و دل کجا و وقت کو
تا کنم ایں گونہ درہم گفتگو
شہرۂ شہر است استغنائے من
شور دارد بے دماغی ہائے من
دل ز جوشِ درد و غم خوں می کنم
مصرعے را گاہ موزوں می کنم
رفتۂ عشق ام غمِ من وافر است
ہر کہ داند شاعرم، ناشاعر است
سینہ را بخراش در اندوہِ شہر
گریۂ بسیار کن بر یادِ نہر
شہر از بس خوش عمارت بودہ است
ہر مکانش قصرِ جنّت بودہ است
کوچہ اش دامانِ دل نگذاشتے
راستہ یک شہر رونق داشتے

چشمِ گل چھپ گئی، نہر بھی گئی
سبزۂ تر مدت ہوئی خواب میں چلا گیا
نہ گل، نہ لالہ، نہ سروِ باغ
میں رہ گیا ہوں ہزاروں غم اور داغ لیے
کبھی درد سے نالہ کھینچتا ہوں
کبھی سینے سے آہ کھینچتا ہوں
خاموشی اور غم اٹھانے سے کام رکھتا ہوں
دم کش[1] کہاں ہے کہ میں ہم نوائی کروں
میں بھی وطن کے عشق میں رنجیدہ خاطر ہوں
ورنہ مدت ہوئی (میں نے) ہونٹوں کو سی رکھا ہے
کہاں دماغ اور کہاں دل اور کہاں وقت
کہ اس طرح کی بے ربط گفتگو کروں
میری بے نیازی کا شہر میں شہرہ ہے
میری نازک مزاجی کی شہرت ہے
دل کو جوشِ درد اور غم سے خون کرتا ہوں
کبھی (جو) ایک مصرعہ موزوں کرتا ہوں
مجھے عشق کا جنوں ہے، میرا غم وافر ہے
جو مجھے شاعر سمجھتا ہے، نا شاعر ہے
شہر کے غم میں سینے کو زخمی کر
نہر کی یاد بہت آنسو بہا
شہر نہایت خوش عمارت تھا
اس کا ہر مکاں جنّت کا محل تھا
اس کے کوچے دل کا دامن نہیں چھوڑتے تھے
راستے یک شہر رونق رکھتے تھے

---

[1] اصل گانے والے کے ہمراہ گانے والا۔

رونق و خوبی بہ ہر سو دیدہ ام
صد درِ دولت بہ یک کو دیدہ ام
زاں بناہا مطلقاً آثار نیست
از عزیزاں ہیچ کس دیّار نیست
ایں بداں افسانہ می ماند کہ من
گوش می کردم ز یارانِ کہن

شروعِ داستان

بود در مغرب زمیں شہرے خوشے
خوش سوادے، خوش ہوائے، دل کشے
ہر طرف عالی بنا کاشانہ اے
دار بستے بود در ہر خانہ اے
ساکنانش صرفِ رعنائی ہمہ
دلبرانش محوِ خودرائی ہمہ
زاہدے آں جا اقامت داشتے
بے عبادت وقت را نگذاشتے
خضر پیشِ او شباں گہ می رسید
گوہرِ پندے بہ گوشش می کشید
ایں حکایت چوں بہ گوشِ شاہ خورد
اشتیاقِ خضر دل از جائے برد
بر درِ او رفت و ترکِ کار کرد
قصہ کوتہ خدمتِ بسیار کرد
صبح خاکِ در بہ مژگاں بیختے
شام گہ آبے بہ دستش ریختے
بعدِ چندے عرضِ گستاخانہ کرد
مطلق آں عزلت گزیں پروا نہ کرد

(میں نے) ہر طرف رونق اور خوبصورتی دیکھی تھی
ایک کوچے میں سیکڑوں درِ دولت دیکھے تھے
ان عمارتوں کا بالکل پتہ نہیں ہے
دوستوں میں سے کوئی بھی صاحبِ خانہ نہیں ہے
اس طرح کا افسانہ باقی رہ گیا ہے جو میں نے
پرانے دوستوں سے سنا تھا

شروعِ داستان

مغرب زمین میں ایک خوبصورت شہر تھا
خوش سواد، خوش ہوا اور دل کش
ہر طرف عالی بنیاد محل
ہر گھر میں انگور کی بیلوں کی ٹٹیاں تھیں
اس کے باشندے تمام رعنائی میں مصروف
اس کے دلبر تمام خودرائی میں محو
ایک زاہد وہاں اقامت رکھتا تھا
(جو) بے عبادت وقت نہیں گزارتا تھا
اس کے پاس رات کے وقت خضر آتے تھے
نصیحت کا گوہر اس کے کان میں ڈالتے تھے
جب شاہ کے کانوں نے یہ حکایت سنی
خضر کے اشتیاق میں (اس کا) دل بے قابو ہو گیا
اس کے دروازے پر گیا اور (تمام) مصروفیت ترک کر دی
القصہ بہت زیادہ خدمت کی
صبح دروازے کی خاک پلکوں سے چنتا
شام کے وقت پانی سے اس کا ہاتھ دھلاتا
چند دنوں کے بعد بے باکانہ عرض کی
(مگر) اس گوشہ نشیں نے مطلق پروا نہیں کی

باز گفتا وصلِ خضرم آرزوست
دل بسے مشتاقِ دیریں گفتگوست
صحبتِ او گر میسّر آیدم
سر بہ اوجِ چرخِ عزت سایدم
از تو بر جاں منتے خواہم گذاشت
خود بشاید چشم بر راہم گذاشت
گفت ربطِ خضر بر من تہمت است
چوں منے را کے دہانِ صحبت است
او بہ عزّت شہرہ و من خوار و زار
او سراپا وقر و من بےاعتبار
او بہ چشمِ خلقِ عالم آمدہ
من سبک پا، بےنوائے غم زدہ
خضر با سبزی ست مشہورِ جہاں
ہیچ نسبت نیستش با گم رہاں
رو، سرِ خود گیر و ترکِ واہیات
مردہ ریگے کو و کو آبِ حیات
چوں از آں مرتاض روئے دل نہ دید
شہ بہ خو پیچید و رو درہم کشید
بر زباں آورد یا جاں می دہم
یا بہ خوں ریزِ تو فرماں می دہم
روزِ خوش داری اگر مدِّ نظر
سوئے خضرم شو دلِ شب راہبر
زیں خشونت رنگِ روئے او پرید
صرفۂ خود در رضائے شاہ دید

پھر کہا میری آرزو خضر سے ملاقات کی ہے
دل بہت دنوں سے گفتگو کا مشتاق ہے
اگر مجھے اس کی ملاقات میسّر آ جائے
(اپنا) سر عظمت کے آسماں پر جھکاؤں
تیرا احسان جان پر رکھوں گا
(تجھے) خود چاہیے کہ میری راہ پر نظر ڈالے
کہا خضر سے ربط مجھ پر تہمت ہے
مجھ جیسے کو کب (اس سے) صحبت کا منھ ہے
وہ عزت سے شہرہ (رکھتا ہے) اور میں خوار و زبوں
وہ سراپا وقار اور میں بے اعتبار
وہ دنیا کے لوگوں کی آنکھوں میں آیا ہوا
میں بے وقار، ایک غم زدہ فقیر
خضر سبز (رنگ) سے جہاں میں مشہور ہے
اسے گمراہوں سے کچھ نسبت نہیں ہے
جا، اپنا راستہ لے اور فضول باتوں کو چھوڑ
مردہ ریگ[1] کہاں اور کہاں آبِ حیات
جب اس مرتاض[2] نے حمایت نہیں کی
شاہ نے پیچ و تاب کھایا اور تیوری چڑھائی
زبان پر لایا یا میں جان دے دوں گا
یا تیرا خون بہانے کا فرمان جاری کرتا ہوں
اگر روزِ خوش مدِّنظر رکھتا ہے
آدھی رات کو خضر کی طرف مجھے راہ دکھانے والا بن
اس خوف سے اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا
شاہ کی رضا میں اپنی بھلائی دیکھی

---

[1] مُردوں کے بچے کھچے آثار۔
[2] ریاضت کرنے والے۔

گفت یک چندے بہ حالم واگذار
و آں گہے بر دیدۂ من پا گذار
گردوت شاید کہ کامِ دل حصول
از من الحاح و از آں جانب قبول
خضر را افتاد بر وے چوں گذر
سر نمود آں خشک دامن، چشم تر
کز پیت شہ در پئے جانِ من است
خضر می داند بہ فرمانِ من است
بہرِ تو سر بر سرِ من داشتہ
ہمتے بر کشتنم بگماشتہ
من نہ دانستم کہ ربطِ تو بلاست
خضرِ راہِ ظلمت آباد فناست
اختلاطت گر بہ این رنگ است ہائے
وائے بر اخلاص مندانِ تو وائے
خضر دل جمعش نمود و وعدہ داد
دید او را پادشاہ و لب کشاد
کاے بہ در گاہت جبینِ راستاں
لطف کن یک داستانِ پاستاں
وز سپہر و گردشِ آں خاک شو
بہرِ پاسِ خاطرم چیزے بگو
کاں ستم اندیش با یاراں چہ کرد
با جہاں و با جہاں داراں چہ کرد
گفت در وقتے از ایں رہ آمدم
شہر دیدم بر درِ شہ آمدم
داشت آں شہ یال و گوپالِ خوشے
شہریاں را بود احوالِ خوشے

کہا، کچھ دن مجھے میرے حال پر چھوڑ دے
اور اس کے بعد میری آنکھوں پر پاؤں رکھ
شاید کہ تجھے دل کی مراد حاصل ہو جائے
میری طرف سے التجا اور اس طرف سے قبولیت
خضر کا جب اس کے پاس سے گزر ہوا
وہ خشک دامن، چشم تر سامنے آیا
(کہا) کہ تیرے لیے شاہ میری جان کا درپے ہے
سمجھتا ہے کہ خضر میرا تابع ہے
تیری وجہ سے میرا سر اتارنے کے درپے ہے
مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہے
میں نہیں جانتا تھا کہ تجھ سے ربط مصیبت ہے
(تو) ظلمت آبادِ فنا کا خضرِ راہ ہے
تجھ سے تعلق رکھنے کا اگر یہ انجام ہے
افسوس، تیرے اخلاص مندوں پر افسوس
خضر نے اس کی دل جمعی کی اور وعدہ کیا
بادشاہ نے اس کو دیکھا اور ہونٹ کھولے
اے کہ تیری جبیں راست بازوں کی درگاہ ہے
ایک پرانی داستان مہربانی کر کے (سنا)
اور آسمان اور اس کی گردش سے خاک ہو
میرے دل کی خوشی کے لئے کوئی داستاں سنا
کہ اس ستم اندیش نے یاروں کے ساتھ کیا کیا
جہاں اور جہاں داروں کے ساتھ کیا کیا
کہا جس وقت اس راہ سے آیا تھا
شہر دیکھا تھا اور شاہ کے در پر گیا تھا
وہ شاہ خوب قوت و شوکت رکھتا تھا
شہریوں کا حال اچھا تھا

دل کشیدے ہر در و دیوارِ شہر
ہوش بردے کوچہ و بازارِ شہر
صحبتِ ہر خانہ دیدن داشتہ ست
حرفِ ہر واحد شنیدن داشتہ ست
ہر طرف باغے و ہر جانب گلے
نالہ کش بر ہر نہالے بلبلے
صحبتِ رنگیں بہ ہر کاشانہ اش
خانقہ آباد و ہم مے خانہ اش
از خراباتش چو جمشید آمدے
و ز رباطش بایزیدے سرزدے
خواہ صوفی، خواہ مستم رو نمود
ہیچ کس خالی ز کیفیّت نہ بود
یک طرف شورے ز حسنِ سادگاں
یک طرف ہنگامۂ دل دادگاں
آہ از طفلانِ شمّاسی نژاد
ہیچ یک خورشید را روے نہ داد
وائے برآں زرورخسارانِ شہر
کار ہر کس را بہ ناز و خشم و قہر
حسن را در ہر دو کف شمشیر بود
عشق را در ہر دو پا زنجیر بود
بعدِ چندے رفتنم شد دل نہاد
اتفاقاً باز چوں راہم فتاد
نے شہ و نے شہر و نے کاشانہ بود
تند بادے بود و یک ویرانہ بود
دام دارِ چند را گسترده دام
دیدم و کردم سوال از ہر کدام

شہر کے تمام در و دیوار دل کو کھینچتے تھے
شہر کے کوچہ و بازار ہوش اڑا لے جاتے تھے
ہر گھر کی محفل دیکھنے کے لائق تھی
ہر فرد کی باتیں سننے کے لائق تھیں
ہر طرف باغ اور ہر جانب گل
ہر درخت پر بلبل نالہ کش
اس کے ہر کاشانے میں رنگین محفل
خانقہ آباد اور اس کے مے خانے بھی
اس کے مے خانے سے جمشید جیسا نکلتا
اور اس کی سرائے سے بایزید (جیسا) نکلتا
خواہ صوفی، خواہ مست مجھے (جو بھی) نظر آیا
کوئی بھی کیفیت سے خالی نہ تھا
ایک طرف سادگاں کے حسن کی شہرت
ایک طرف عاشقوں کا ہنگامہ
آہ شماسی[1] نژاد لڑکوں کے سامنے
کوئی بھی خورشید کو نہیں پوچھتا تھا
شہر کے ان زرد خساروں پر افسوس
ہر ایک کا واسطہ ناز اور غصہ اور غضب سے (تھا)
حسن کے دونوں ہاتھوں میں شمشیر تھی
عشق کے دونوں پیروں میں زنجیر تھی
کچھ دنوں بعد میں نے دل میں جانے کی ٹھہرائی
اتفاقاً دوبارہ جب (وہ شہر) میری راہ میں آیا
نہ شاہ، نہ شہر، نہ کاشانہ تھا
تیز ہوا تھی اور ایک ویرانہ تھا
چند ماہی گیروں نے جال پھیلائے ہوئے تھے
دیکھا اور ہر ایک سے سوال کیا

---

[1] سورج کے پجاری۔

ہیچ یک زاں شہر حرفے سر نہ کرد
کس بہ یادِ شاہ چشمے تر نہ کرد
در جگر چاکے و بر دل تازہ ریش
عاقبت کردم از آں جا قصدِ پیش
بارِ دیگر شد چو زاں سوم گذار
یافتم در جوش بحرِ بے کنار
لُجّہ لُجّہ، لطمہ لطمہ در خروش
تیرہ و تہ دار طوفانے بہ جوش
ساحلش پیدا نہ و موجش بلا
لرزہ از وے خضر را بر دست و پا
باز شد چشمم بہ ماہی گیرِ چند
ہر یکے در آب شستے می فگند
گفتم ایں جا بود دشتِ ہولناک
دام داراں دام گستردہ بہ خاک
سر کنید آں دام داراں را چہ شد
ناگہ آں صحرا شکاراں را چہ شد
نے بیابان و نہ صیادے بہ خواب
تا نگاہم می رود آب است آب
ہر یکے حیرانِ حرفِ من بماند
کس ز آنہا بر زباں حرفے نہ راند
ایں زماں بازم چو رہ افتادہ است
طرفہ حیرانی مرا رو دادہ است
شہر آباد است و ہر سو عشرتے ست
بر سرِ ہر کو و برزن صحبتے ست
حالیا ایں شہر و شاہی از تو شد
چند روزے کج کلاہی از تو شد

کسی نے اس شہر کی ایک بات نہیں کی
کسی نے شاہ کی یاد میں آنکھوں کو نم نہیں کیا
چاک جگر اور تازہ زخمی دل لیے
آخر کار وہاں سے آگے کا قصد کیا
ایک اور بار جب میرا اس طرف جانا ہوا
ایک بحرِ بے کنار کو جوش میں پایا
لجہ لجہ،[۱] لطمہ لطمہ[۲] خروش میں
ایک بھیانک طوفان جوش میں
اس کا ساحل نظر نہیں (آتا) تھا اور اس کی موج بلا
اس سے خضر کے دست و پا پر لرزہ
بعد میں مجھے چند ماہی گیر نظر آئے
ہر ایک پانی میں بنسی ڈالے ہوئے تھا
میں نے کہا یہاں ہولناک دشت تھا
دام داروں نے جال زمین پر بچھا دیے
بتایا کہ ان دام داروں کا کیا ہوا
اچانک ان صحرا شکاروں کو کیا ہوا
نہ بیاباں اور نہ صیاد سویا ہوا
جہاں تک میری نگاہ جاتی ہے پانی ہی پانی ہے
ہر ایک میری بات پر حیراں رہ گیا
کوئی بھی ان میں سے زبان پر ایک حرف نہیں لایا
اس بار دوبارہ جو (وہ) راہ پڑی ہے
طرفہ حیرانی سے مجھے واسطہ پڑا ہے
شہر آباد ہے اور ہر طرف عیش و عشرت ہے
ہر کوچہ و برزن میں محفل ہے
اس زمانے میں یہ شہر اور شاہی تجھ سے ہے
چند روز کج کلاہی[۳] تجھ سے ہے

---

۱ بھنور۔
۲ دریا کا تھپڑا۔
۳ کج کلاہ، شاہانِ ایران کا لقب، ٹیڑھی ٹوپی والا۔

مملکت زیرِ نگیں آمد تمام
سکّہ ات بر زر زدند اتا بہ نام
ایں جہاں شاہا کہن ویرانہ اے ست
رونق و آبادِیش افسانہ اے ست
زندگانی کن چناں با ہر کسے
کز پسِ رفتن بہ یاد آئی بسے
ایں بگفت و خضر جا بگذاشتہ
شاہ شد درویش و دل برداشتہ

تمام مملکت زیرِ نگیں آئی
تیرا سکہ سونے میں ڈھلا، لیکن برائے نام
یہ جہاں اے شاہ ایک پرانا ویرانہ ہے
اس کی رونق اور آبادی ایک افسانہ ہے
زندگی ہر ایک کے ساتھ ایسے بسر کر
کہ جانے کے بعد تو بہت یاد آئے
یہ کہا اور خضر نے (اس) جگہ کو چھوڑا
شاہ دل شکستہ (ہو کر) درویش بن گیا

مسدّس

مسدّس (ترجیع بند) در منقبت

تاثیر شد ز نالہ، نفس بے سرایت است
دل تنگیم ز چرخ بہ اقصائے غایت است
کے از کسم بغیرِ تو چشمِ حمایت است
از خاک برگرفتنم اکنوں رعایت است

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است هنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

دیرے ست کز جفائے سپہرِ ستم شعار
ہر دم ز دیدہ می رودم بحرِ بے کنار
نے دست بر تدارک و نے آشنا و یار
چوں موج گشتہ ام ہمگی حیرتیِ کار

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

یک رہ بہ سر بیا و بہ خاکم عیاں نگر
دستم بنہ بہ سینہ و دل را تپاں نگر
چشمے کشا و ایں مژہٴ خوں فشاں نگر
لطفے نما و حالِ منِ خستہ جاں نگر

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

آں ای کہ بعدِ ختمِ رسلؐ جانشیں تو ای
نورِ سپہر و رونقِ روئے زمیں تو ای
قیّومِ عرش و حامیِ شرعِ متیں تو ای
یعنی کہ جرم پوش و نیایش گزیں تو ای

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

مسدّس (ترجیع بند) در منقبت

نالہ سے تاثیر چلی گئی، نفس بے اثر ہے
غم زدگی آسماں کی طرف سے اقصائے غایت ہے
تیرے سوا کس سے مجھے حمایت کی امید ہے
اب مجھے خاک سے اٹھانا مہربانی ہوگی

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے   دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

مدت ہوئی کہ ستم شعار آسماں کے ظلم سے
میری آنکھوں سے ہر دم بحرِ بے کنار رواں ہے
نہ تدارک کا مقدر ہے اور نہ آشنا و یار
موج کی طرح بالکل اضطراب میں ہوں

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے   دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

ایک بار میری بالیں پر آ اور مجھے خاک پر پڑا ہوا دیکھ
میرا ہاتھ سینے پر رکھ اور دل کو تپتا ہوا دیکھ
آنکھیں کھول اور اس خوں فشاں مژہ کو دیکھ
مہربانی کر اور مجھ خستہ جاں کے حال کو دیکھ

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے   دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

تو وہ ہے کہ ختم رسلؐ کے بعد جانشیں تو ہے
آسمان کا نور اور روئے زمیں کی رونق تو ہے
عرش کو تھامنے والا اور شرع متین کا حامی تو ہے
یعنی کہ جرم پوش اور گریہ وزاری (سے کی ہوئی دعا) کو پسند کرنے والا تو ہے

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے   دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

کس را در ایں زمانہ خیالِ کمال نیست
داریم اضطراب و کسے را خیال نیست
یاری گری ز اہلِ جہاں احتمال نیست
ایں یک دو روزہ مہلتِ ما جز و بال نیست

یا مرتضٰی علیؓ کرمت بے نہایت است ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

تا چند سر بہ سنگ زنم گریہ سر کنم
تا کے بہ آہ و نالہ شبِ خود سحر کنم
لطفے کہ در ممانعتِ غم جگر کنم
رحمے کہ با ثبات بہ کنجے بسر کنم

یا مرتضٰی علیؓ کرمت بے نہایت است ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

از اضطرابِ دل ز نظرہا فتادہ ام
بر خاکِ آستانِ خساں رو نہادہ ام
تو خود سوارِ دولت ای و من پیادہ ام
مپسند پائمالِ حوادث چو جادہ ام

یا مرتضٰی علیؓ کرمت بے نہایت است ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

دل داغ و سینہ چاک و جگر خوں زغم مراست
ہنگامۂ عجب ز فلک بر سرم بپاست
نالم اگر نہ پیشِ تو پس دادرس کجاست
مگذار نا امید کہ از تو امیدہاست

یا مرتضٰی علیؓ کرمت بے نہایت است ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

کسی کو اس زمانے میں کمال کی قدر نہیں ہے
ہم پریشان ہیں اور کسی کو خیال نہیں ہے
اہلِ جہاں سے مدد کا گمان نہیں ہے
یہ میری ایک دوروزہ مہلت وبال کے سوا کچھ نہیں ہے

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

کب تک سر کو پتھر پر ماروں، گریہ سر کروں
کب تک آہ و نالہ (کر کر کے) اپنی رات کو صبح کروں
مہربانی (فرما) کہ غم کو روکنے کی ہمّت پیدا کروں
رحم (فرما) کہ مستقل کسی کونے میں بسر کروں

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

دل کے اضطراب کی وجہ سے نظروں سے گر گیا ہوں
کم رتبہ لوگوں کے آستاں کی خاک پر سر جھکائے ہوئے ہوں
تو خود سوارِ دولت ہے اور میں پیادہ ہوں
مت چاہ کہ حوادث سے جادے کی طرح پائمال ہو جاؤں

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

غم سے میرا دل داغ، سینہ چاک اور جگر خوں ہے
فلک (کی وجہ) سے میرے سر پر عجب ہنگامہ بپا ہے
اگر تیرے سامنے نہ فریاد نہ کروں تو پھر (کوئی اور) دادرس کہاں ہے
ناامید مت چھوڑ کہ تجھ سے بہت امیدیں ہیں

یا مرتضیٰ علیؑ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

در کار کن ز رحمتِ عامت ترحّمے
تا گرددم ملال بدّل با تبسّمے
رحمے بہ حالِ خستۂ افغاں ترنّمے
گوشے بہ زاری اے، نظرے بر تظلّمے

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است هنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

امید دارم از تو کہ امدادِ من کنی
یک گونہ پاسِ خاطرِ ناشادِ من کنی
چوں وقتِ خاص دست دہد، یادِ من کنی
رحمت بہ آہ و نالہ و فریادِ من کنی

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است هنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

ختم است بر تو بعدِ نبیؐ خوبیِ صفات
ذاتِ تو یاد می دہد از جلوہ ہائے ذات
سہل است پیشِ قدرتِ تو حلِ مشکلات
عاجز نوازیِ کہ بیابم ز غم نجات

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است هنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

کوہ وقار بود کہ ممنونِ ہر خسےست
بہرِ تلاش ناں بہ درِ ناکس و کسےست
ذلّت پے عتبۂ میرؔ ایں قدر بسےست
بخشائشے کہ بےدل و بےیار و بےبسےست

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است هنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

(اپنی) رحمتِ عام سے رحمت فرما
تا کہ میں ملال کو تبسّم سے بدل دوں
فریادوزاری کرنے والے کے خراب حال پر رحم
میری دعا سن، میرے فریاد پر توّجہ (دے)

یا مرتضیٰ علیؓ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

تجھ سے امیدوار ہوں کہ تو میری امداد کرے
میری خاطرِ ناشاد کا یک گونہ پاس کرے
جب خاص وقت آئے، مجھے یاد کرے
میری آہ ونالہ اور فریاد پر رحم کرے

یا مرتضیٰ علیؓ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

نبیؐ کے بعد تجھ پر خوبیٔ صفات ختم ہے
تیری ذات جلوہ ہائے ذات کی یاد دلاتی ہے
تیرے حوصلے کے سامنے مشکلوں کا حل سہل ہے
عاجز نوازی کر کہ میں غم سے نجات پاؤں

یا مرتضیٰ علیؓ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

(وہ) کوہِ وقار تھا جو (اب) ہر کم رتبہ کا احسان مند ہے
روٹی کی تلاش میں کس و ناکس کے دروازے پر ہے
میرؔ کی تنبیہ کے لیے اتنی ذلت کافی ہے
مہربانی کر کہ (وہ) ناامید و بے یار اور بے کس ہے

یا مرتضیٰ علیؓ تیرا کرم بے نہایت ہے دست گیری کا موقع اور عنایت کا وقت ہے

دیوان میر (فارسی) تمام شد

دیوانِ میر (فارسی)

مع اردو ترجمہ

ترجمہ: افضال احمد سیّد

میر تقی میر کا یہ فارسی دیوان پہلی مرتبہ اردو ترجمے کے ساتھ مکمل کتابی صورت میں منظر عام پر آرہا ہے۔ یہ مطالعۂ میر کے ضمن میں بہت اہم اضافہ ہے۔ میر ان شاعروں میں ہیں جن کا ہر سخن ایک مقام سے ہے اور ہر چند انھوں نے غالب کی طرح اپنی فارسی شاعری کے بارے میں بلند بانگ دعویٰ نہیں کیا لیکن جب تک ان کا فارسی کلام ان کے اردو کلام کے شائقین کی دسترس میں نہ ہو، تفہیم میر نہ تو مکمل ہوگی اور نہ ہی معتبر۔ میر نے اپنی خودنوشت ذکرِ میر، اپنی روحانی سرنوشت فیض میر اور اپنا تذکرہ نکات الشعرا فارسی میں پیش کیا اور اب یہ دیوان فارسی شائقین ادب کے لیے ایک سوغات کی شکل میں حاضر ہے۔

مترجم کے بارے میں:

فارسی متن کا ترجمہ جناب افضال احمد سیّد نے کیا ہے جو خود جدید اردو شاعری میں اعتبار کا رتبہ رکھتے ہیں۔ انگریزی اور فارسی پر ان کی دسترس یکساں ہے لیکن ہر چند کہ ان کی اردو شاعری جدید حسیّت کی ترجمان ہے، وہ کلاسیکی ادب خصوصاً فارسی شعر و ادب کا شوق و ادراک اور ہماری ادبی تاریخ کے تمام محاورات سے آشنائی رکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ ترجمہ نثر میں ہے لیکن ایک شعری کیفیت کے ساتھ ہے جس کے سبب اشعار میر زندہ ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

سرورق ڈیزائن: ثناء ناصر

ISBN 978-0-19-906205-8

9 780199 062058

RS 1500

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

www.oup.com
www.oup.com/pk